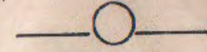
# لہو کا سفر

طارق اسماعیل ساگر

# حرفِ اوّل

میرے کمرے میں وہ داخل ہوئے تو بے حد خوش تھے ———
پاس آ کر بیٹھ گئے اور ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے مسکرانے لگے:
"بھائی جان! یہ میرا نیا مسودہ ہے' آپ اس پر دیباچہ لکھیں گے۔"
"کیا عنوان ہے کتاب کا؟"
"لہو کا سفر!"
"اور کیا موضوع ہے اس کا؟"
"مشرقی پاکستان!"
"مشرقی پاکستان؟" میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا!
"وہی مشرقی پاکستان جسے ہمارا کٹا ہوا بازو کہتے ہیں؟"
اور اس سے قبل کہ وہ اپنے لب کھولتے' میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا:
——— جس چہرے پر میں مسکراہٹیں دیکھ رہا تھا' ان آنکھوں میں غم' غصے اور اندیشوں کے تاریک سائے لہرا رہے تھے۔
میں زیادہ دیر تک ان آنکھوں میں نہ ڈوب سکا ———
دوسرے ہی لمحے میری نظریں ان کٹی ہوئی بانہوں اور نڈھال جسموں پر آ کر

رک گئی تھیں جنہیں ہم 1947ء میں ایک قافلے کی صورت میں اپنے گھروں کے سامنے سے گزرتا دیکھ رہے تھے۔



عجیب بھیانک سی ایک صبح تھی وہ، جب محلے میں شور مچ گیا:

"قافلے آ گئے! قافلے آ گئے!!

بھاگم بھاگ ہم گھروں سے نکل کر سڑک پر آ کر کھڑے ہو گئے ——

افوہ اللہ! وہاں ایک دو نہیں، نہ سو دو سو افراد تھے، حد نگاہ تک پھیلے ہوئے لوگوں کا ایک عظیم قافلہ ہمارے سامنے آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔

وہ گزر رہے تھے اور —— میں دیکھ رہا تھا:

ان میں عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی، جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی! کسی کے بازو کٹے ہوئے ہیں تو کسی کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں —— اور کتنوں کے زخموں سے خون رس رس کر زمین پر اپنے نقش ثبت کرتا چلا جا رہا تھا۔

کچھ لوگ اپنے ساتھی پیچھے دفن کر آئے تھے اور کئی جنازے وہیں زمین پر بے گور و کفن پڑے ان جانے والوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔

میں سوچنے لگا:

نہ جانے یہ لوگ ان انجانی منزلوں کی طرف کہاں سے آ رہے ہیں اور کب انہوں نے اپنا یہ پر ملال سفر شروع کیا۔

لیکن ——

شہر والوں نے انہیں دیکھتے ہی اپنے بازو پھیلا دیئے —— لوگوں نے اپنے سینے ان کے لئے کھول دیئے۔

اور یہ قافلے یہیں جذب ہو گئے۔



—— اسی دھرتی میں سمٹ گئے جسے پاکستان کہتے ہیں۔



جب یہ قافلے اپنی اپنی جگہ سمٹ سمٹا گئے تو اظہار تشکر کے لئے میں بھی سر بسجود ہو گیا۔

لیکن، یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میرے جھکنے سے قبل میرے آنسو بھی سجدہ ریز ہو چکے تھے۔

—— وہ اس ارض مقدس کو سلام عقیدت پیش کرنے کے لئے زمین پر اتر آئے تھے جس کی گھنیری چھاؤں میں مسلمانوں کے یہ لٹے پٹے قافلے آ آ کر پناہ لیتے اور پھر یہیں —— اسی خاک میں ہمیشہ کے لئے رچ بس جاتے۔

مگر ——

میرے ہونٹوں پر ابھی کلمہ شکر جاری تھا کہ ایک شور سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے —— میں اس طرف لپکا:

میری آنکھوں کے سامنے آج میرا دوسرا بازو بھی جل رہا تھا:

—— سندھ آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا!

نفرت کی جو بھٹیاں کل تک لوگوں کے سینوں میں سلگ رہی تھیں، وہ اب شعلوں میں تبدیل ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔

میں نے فوری طور پر مشرقی پاکستان کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے کھولا:

کئی پراسرار ہاتھ اسی طرح ہمارے اس بازو کو بھی ہم سے الگ کرنے کی فکر کر رہے تھے۔

بالکل وہی نعرے گونج رہے تھے —— ہر طرف اسی طرح اجنبیت کا اظہار کیا جا رہا تھا اور

آگ کا یہ الاؤ تیز سے تیز تر ہو رہا تھا۔

میں ڈرنے لگا:

"یا اللہ! جس گھنیری چھاؤں کے دامن میں آ کر وہ قافلے پناہ لیا کرتے تھے، کیا——— یہ شعلے اسی آشیانے کو جلانے کی آرزو تو نہیں کر رہے؟؟"

"الامان، الحفیظ!! میرے ہونٹ تڑپنے لگے:

"کیا——— اب پھر لہو کا سفر شروع ہونے والا ہے؟" میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا:

"خدایا! اب ہماری منزل کیا ہو گی———؟"

"اور——— اب وہ قافلے کدھر جائیں گے؟؟"

میں اپنے خیالوں میں گم تھا اور طارق بھائی بڑے انہماک سے میرے ماتھے پر بنتی، بگڑتی لکیریں دیکھ دیکھ کر یہ سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے: "آخر میری منزل کیا ہے؟؟"

اور جب وہ کچھ نہ پا سکے تو بولے: "بھائی جان! بھائی جان!! میرا دیباچہ کون لکھے گا؟؟"

"میں تو نہیں لکھوں گا!!"

"تو پھر——— اسے کون لکھے گا؟؟"

"وہی لوگ ——— جو کل خون کے دریا تیر کر آئے تھے!"

"اور اگر وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو؟؟"

"تو پھر——— یہ فرض وہ لوگ ادا کریں گے جو آج اس زمین کے اصل وارث ہیں!"

"یعنی———؟"

"میری مراد——— اس جوان نسل سے ہے جس کے سینوں میں ان کے



آباؤ و اجداد کا خون موجزن ہے!"

——— جو تاریخ کے دھاروں سے آزادی کا مفہوم نوچ کر یہاں پہنچے ہیں۔

——— جو زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور اپنے بال و پر پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

——— جو شمع آزادی کو اپنے خون سے روشن کرتے ہیں اور جب مادر وطن آواز دے تو جانوں کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں!!

باتیں کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے میں رکا تو وہ کھڑے ہو گئے، جانے کی اجازت چاہی تو میں نے جھانکا:

جن آنکھوں میں غم، غصے اور اندیشوں کے تاریک سائے لہرا رہے تھے۔

——— اب وہاں ایک عزم جھلک رہا تھا۔

——— ایک سپاہی کا عزم۔

اور یہی میرا مقصد تھا!

شیخ محمد احسن

# عرضِ مصنّف

قارئین جانتے ہوں گے کہ میری بیشتر کتب کا موضوع ہندو سامراج کی مکارانہ سیاست ہی رہی ہے۔ اس صدی نے عالم اسلام کو سقوط ڈھاکہ جیسے سانحے سے دوچار کیا جو اپنی حیثیت میں سقوط غرناطہ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

میرے جو احباب تاریخ پر نظر رکھتے ہیں انہوں نے جان لیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے آخری ایام میں ہم نے غرناطہ کا آخری باب دہرانا شروع کر دیا تھا۔

بزدل حکمران! موقعہ پرست سیاستدان! بے راہ رو اور اپنی منزل سے بھٹکی ہوئی قوم!

Enjoy your LiFe

وہی خوشامد پرست درباری' وہی منافقانہ ذہنیت کے حامل ارباب بست و کشاد! جب سب کچھ وہی تھا تو نتیجہ الگ کیوں ہوتا؟

امت مسلمہ کی بدقسمتی کہ اس نے سقوط غرناطہ سے سبق نہیں سیکھا اور پاکستانی قوم کی بدبختی کہ ہم نے سقوط ڈھاکہ کو یوں فراموش کر دیا جیسے یہ ہمارا دکھ تھا ہی نہیں۔

"کمانڈو" میں میرا موضوع سقوط ڈھاکہ ہی تھا' لیکن "کمانڈو" لکھنے کے بعد سے میں تشنگی کے ایک عجیب سے احساس کا شکار ہو گیا تھا۔ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ ایک قلمکار کی حیثیت سے میں نے اپنے فرائض میں کوتاہی برتی۔ مجھے اور بہت کچھ لکھنا چاہیے تھا۔ یہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر ایک کتاب لکھ کر خاموشی اختیار کر

لی جائے۔ میری موجودہ کتاب کا موضوع بھی یہی المیہ ہے----!

اس دکھ کو اپنی روح کی مکمل گہرائی کے ساتھ میں نے محسوس کیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی رگوں میں ٹھاٹھیں مارتے درد کا یہ جان لیوا احساس آپ کے اذہان میں بھی اتار دوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری ملی بے غیرتی کی انتہا ہے کہ آج اس مملکت خداداد میں وہ حکمران بھی ہمیں دیکھنے کو مل رہے ہیں جن کا کہنا ہے کہ ہم بہاریوں کو پاکستان کی سرزمین میں اترنے نہیں دیں گے۔

چشم خونبار نے وہ منظر بھی دیکھ لیا جب کراچی کے ہوائی اڈے کی طرف راہ گم کردہ افراد کا انبوہ کثیر یہ نعرے لگاتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا تھا کہ "بہاری نامنظور" ان کا مطالبہ تھا کہ بہاریوں کو لانے والے جہاز کو کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت نہ دی جائے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اس "حادثے" کے بعد ہم ملی غیرت کے ہاتھوں مرجاتے، لیکن ہم بہت سخت جان ہیں۔ خدا جانے ابھی اس مکروہ سیاست کے ہاتھوں ہمیں کیا کیا اور دیکھنے اور سننے کو نہیں ملنے والا----!!

کہیں ایسا تو نہیں کہ سپین کے "ابو عبداللہ" کے ساتھی پھر خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے ہیں؟

کہیں ۷۱ء کے بعد پھر غرناطہ کا آخری باب کھولنے کی تیاریاں تو شروع نہیں ہو گئیں؟

ہاں----!

شاید ایسا ہی ہے۔ چاہے ہم کتنے ہی خوش فہم ہوں، لیکن تصویر کے اس تاریک رخ کو خدا کے لئے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیجئے۔

"لہو کا سفر" ایک چیلنج بھی ہے----!

ایک جواب بھی ہے----!



ان کے لئے جو شہزادہ ابو عبداللہ کے درباری ہیں----!

وہ جان لیں کہ اس ملک میں موسیٰ بن ابی غسان کے پیروکار ابھی زندہ ہیں، اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود----!

انشاء اللہ وہ آہنی دیوار بن کر ان کے مذموم عزائم کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹے رہیں گے۔

آخری سانس تک---- انشاء اللہ!

طارق اسمٰعیل ساگر

مئی ۸۹ء

# شہادت گاہِ الفت

میں آج پھر دریا کے کنارے پر دھرے اس پتھر پر آن بیٹھا ہوں جو مہاتما بدھ کے شانت مجسمے کی طرح جانے کتنی صدیوں سے یہاں گڑا ہے۔ دریا سوکھنے لگے تو اس پتھر کا بدن بھی ننگا ہو جاتا ہے جب دریا جوبن پر ہو تو اسے اپنے ساتھ ہی پانیوں میں ڈبو لیتا ہے۔ میں جب اپنے لہو میں ناچتی وحشتوں کے ہاتھوں ٹوٹنے لگوں تو چارپائی سے اٹھ کر جیسے تیسے اپنے لہو لہو قدموں پر چلتا یہاں چلا آتا ہوں---- میرے گاؤں کے کھیتوں کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں سے اس کے پانیوں کی سرحد کا آغاز ہوتا ہے----!

کھیتوں اور دریا کے درمیان ریتلی زمین پر جو خودرو پودے سر اٹھاتے دکھائی دیتے ہیں وہ دراصل میری پشیمانی کے آنسو ہیں۔ جہاں جہاں میری خون روتی آنکھوں نے آنسوؤں کے قطرے گرائے ہیں وہاں ریت میں ہرے بھرے درختوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا ہے---- جب کھو دینے کا پچھتاوا میری جان کو آنے لگتا ہے تو میں اس سنسناہٹ سے جو گونج بن کر میری رگوں میں تیرنے لگتی ہے، نجات پانے کے لئے یہاں چلا آتا ہوں اور اس پتھر پر پہروں بیٹھا اس ڈائری کی ورق گردانی کرتا رہتا ہوں جس کے ایک ایک ورق پر میرے ماضی کے مرثیے لفظ بن کر نوحہ الاپ رہے ہیں----!

تب مجھے یوں لگتا ہے کہ اس دریا کنارے لگے تمام پیڑ دراصل میرے بدن کی مختلف شاخیں ہیں----!

اور جب ان کی ٹہنیوں سے سرسراتی ہوا پچھم سے پورب کی طرف رینگتی ہے تو میں گمشدہ لمحوں کی انگلی تھام کر اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا اپنے ماضی کے اس سنگ میل پر جا کھڑا ہوتا ہوں جہاں سے پھوٹنے والے تمام راستے مڑ کر اسی جگہ لوٹ آتے ہیں۔ اس خونی سنگ میل سے فرار کی کوئی راہ نہیں نکلتی----!

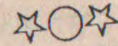
تلخ یادوں سے فرار پانے کے لئے میں جب بھی ایک قدم آگے نکلنا چاہوں، وقت کا بے رحم ہاتھ مجھے گردن سے پکڑ کر دس قدم اور پیچھے لے جاتا ہے----!

تب حیات کی اس شاہراہ کے تمام سنگ میل میرے نام سے منسوب ہونے لگتے ہیں----!

جب پیڑوں کی ٹنڈ منڈ ٹہنیاں شادابی رتوں سے لد جائیں تو میری یادوں کے زخم بھی منہ کھولنے لگتے ہیں----!

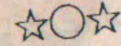
درختوں پر آئی بہار کی ساری ہریالی' سورج کی ساری تمازت' سرد موسموں کی ساری عذابناکیاں ہوا کے زور پر رینگتی' سرسراتی چپکے سے میرے اندر درد بن کر دھوپ کی طرح پھیل جاتی ہیں----!

تب میں اس مریض کی طرح جسے مصنوعی سانس پر زندہ رکھا جاتا ہے' زندگی کے آکسیجن ٹینٹ میں بیٹھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی تھکن سے چور' ریزہ ریزہ بدن کے ساتھ اپنی زندگی کے کربلا میں---- یادوں کی شام غریباں سجالیتا ہوں----!



سلہٹ سے پوٹھوہار تک یادوں کی شاہراہ پر چلتے چلتے میرے پاؤں سے لہو رسنے لگا ہے۔ مہیب اور جان لیوا یادوں کا دائرہ مجھے اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔ اس دائرے سے دائرے جنم لیتے ہیں اور میں یادوں کے اس گرداب میں بہتا چلا جاتا ہوں۔

مہاتما بدھ کی طرح شانت اور موسموں کی سختیوں کا عذاب جھیلنے والے اس پتھر پر بیٹھ کر میں اپنے پاؤں دریا کی شوریدہ لہروں پر رکھ دیتا ہوں۔ تب میری اس ڈائری کا میری ہی یادوں کے خون میں بھیگا ایک ایک لفظ ماضی کے گھمبیر سناٹوں سے نکل کر میری آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے---- اور میں اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں۔



آج یکم فروری ۱۹۷۱ء ہے!

مجھے ڈھاکہ آئے بیس روز ہو گئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان ۲۰ دنوں میں سوائے معمول کی مشقوں کے اور میں نے کچھ نہیں کیا---- صرف رات کو کبھی کبھی ہماری گشت کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے---- باقی سارا دن ہمیں چھاؤنی میں پابند رکھا جاتا ہے۔ دن کے اوقات میں تو کسی ذاتی کام سے بھی ہم وردی پہن کر کم ہی باہر نکلتے ہیں۔ ایک کمانڈو کے لئے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا بڑا مشکل ہے۔

آج سے پچیس روز پہلے جب میں پوٹھوہار کی تپتی دوپہر میں اپنی کمپنی کے ساتھ معمول



کی مشقوں میں مصروف تھا تو مجھے اچانک ہی او-سی نے طلب فرمایا۔

"ویل ڈن کیپٹن----!" انہوں نے اپنے سامنے رکھی فائل پر نگاہ ڈال کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس فائل میں میری سالانہ رپورٹ اور سابقہ ریکارڈ تھا----!

"کل رات ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کرو!" انہوں نے مختصر حکم کے ساتھ مجھے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

"لیس سر!" میں نے ایڑیاں بجائیں اور واپس چلا آیا۔

میں پاک فوج کی کمانڈو بٹالین کا کیپٹن تھا اور میری تربیت اس نہج پر کی گئی تھی کہ کسی بھی ہنگامی صورت حال کا سامنا کر سکوں---- یوں تو زمانہ امن میں بھی ہماری تربیت ہوتی رہتی تھی' لیکن ان دنوں ہماری معمول کی مشقوں میں بھی کچھ زیادہ ہی سختی آ گئی تھی---- جو اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ ہم بہت جلد آزمائش کی بھٹی کا ایندھن بننے والے ہیں۔

اگلے روز علی الصبح ہم نے اپنا بوریا بستر باندھا اور خشک بے آب و گیاہ پہاڑیوں' ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں' گہرے اور بل کھاتے پہاڑی نالوں کے بیچوں بیچ لوگوں کی نظروں سے خود کو محفوظ رکھ کر سفر کرتے ہوئے قریباً" ساٹھ میل پیدل چل کر رات کے اندھیرے میں اپنے ہیڈکوارٹر رپورٹ دی۔

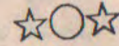
تربیتی مشق میں یہ ہیڈکوارٹر بھی جنگی اصولوں کے مطابق موبائیل تھا۔ ہیڈکوارٹر میں آج خلاف معمول ان علاقوں میں "زیر مشق" کمپنیوں کے قریباً" سب ہی کمانڈوز جمع تھے---- میرے دل نے گواہی دی کہ ضرور کوئی اہم مشن ہمیں سونپا جانے والا ہے۔

پچھلے دو تین ماہ سے ہمیں یہاں مشرقی پاکستان سے متعلق بڑی تشویشناک اطلاعات مل رہی تھیں---- میرا سیاسی شعور ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ ان اطلاعات سے متعلق کوئی رائے قائم کر سکوں۔ بس دل سے دعا نکلتی تھی کہ اللہ ہم پر رحم کر دے۔

رات کے کھانے کے بعد بریگیڈیئر صاحب نے جو خصوصی طور پر ان مشقوں کی نگرانی کر رہے تھے' ہماری کانفرنس طلب کر لی۔

مقامی زیر مشق کمپنیوں کے تمام کمانڈرز موجود تھے۔ یہاں بریگیڈیئر صاحب نے ہمیں دو گھنٹے بریفنگ دی---- اس بریفنگ میں مشرقی پاکستان کی افسوسناک صورت حال سے باخبر کرتے ہوئے ہمیں بتایا گیا کہ دشمن کی ریشہ دوانیاں رنگ لانے والی ہیں اور مقامی غداروں کی مدد سے اس نے تخریبی کارروائیاں شروع کر دی ہیں---- اس کے ساتھ ہی ہمیں مطلع

کیا گیا کہ کمانڈوز کی تین کمپنیاں ڈھاکہ جا رہی ہیں۔
ان میں سرفہرست میری کمپنی تھی---!



ہمیں اپنے گھروں کو اطلاع دینے کے لئے تین دن کی چھٹی دے دی گئی۔ یہاں سے میرا گاؤں بمشکل ساٹھ ستر میل دور تھا۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ مجھے اس سے پہلے ۶۸ء میں چھ ماہ مشرقی پاکستان میں گزارنے کا اتفاق ہو چکا تھا' لیکن تب حالات آج سے یکسر مختلف تھے۔

آج تین سال بعد میرے لاشعور میں سویا مشرقی پاکستان کا حسن پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ ساری رات میں ندی نالوں' دریاؤں' جنگلوں اور سجیلے ماجھیوں کے دیس میں بھٹکتا رہا--- میرے سنہرے بدن والے مشرقی پاکستان کی ہریالی آج پھر اپنی بانہیں پھیلائے مجھے پکار رہی تھی۔

لیکن---!

یہ پکار ۶۸ء والی نہیں تھی--- اس مرتبہ غنیم نے اپنی ناپاک ذہنیت کے ساتھ جو چال چلی تھی وہ اپنوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب رنگ لے آئی تھی۔ ساری رات میں نے سوتے جاگتے گزار دی۔

صبح دم مؤذن کی اذان نے مجھے بیدار کیا۔ قریبی چشمے پر نہا کر تازہ دم ہوا اور نماز ادا کر کے لنگر کا رخ کیا--- تھوڑی دیر بعد میں اپنی جیپ پر گاؤں کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔

سڑک خالی تھی اور ایکسیلیٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جیپ کی رفتار سے زیادہ تیزی سے میرے ذہن میں خیالات کے بگولے اڈے چلے آ رہے تھے۔

اپنے ہیڈکوارٹر کی حدود سے باہر نکلتے ہی جب میں تھوڑی دیر کے لئے فوجی سے سویلین بنا تو مجھے اپنی بیوہ ماں' چھوٹا بھائی اور بڑی بہن بے ساختہ یاد آ گئے۔ میرے والد ریٹائرڈ حوالدار تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مرنے سے پہلے وہ میرے کندھوں پر سٹارز دیکھ چکے تھے۔

دم رخصت انہوں نے مجھ سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ اس وقت تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم آخری مرتبہ مل رہے ہیں--- چند روز سے وہ بیمار ضرور تھے' لیکن ایسے بھی نہیں کہ مجھے تشویش ہوتی--- یہ تو ان کی موت کے بعد ان کے ایک سنگی نے بتایا کہ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے بیمار تھے' لیکن کیا مجال جو انہوں نے کبھی گھر والوں کو اپنی



بیماری کی ہوا بھی لگنے دی ہو۔

آج سوچتا ہوں وہ سچے فوجی تھے--- ہتھیار ڈالنا تو سیکھا ہی نہیں تھا انہوں نے--- آخری سانس تک زندگی کے محاذ پر ڈٹے رہے۔

اس رات انہوں نے دو تین مرتبہ میرا ماتھا چوما۔ میں والدہ کی طرف سے ٹیلی گرام ملنے پر اچانک ہی گھر پہنچا تھا۔ تب میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ ابھی مجھے کمیشن حاصل کئے بمشکل چار پانچ ماہ ہی گزرے تھے۔

"بیٹا ایک خواہش تو اللہ نے زندگی میں پوری کر دی کہ تمہارے کندھوں پر سٹار سجے ہوئے دیکھ لئے' خدا کرے دوسری خواہش بھی اپنی زندگی میں پوری ہو جائے---!"

انہوں نے تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔

میرے والد کچھ نہ بھی کہتے تو میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والے ہیں--- مجھے احساس تھا کہ میرے شیر دل باپ کو جس نے ملٹری کراس حاصل کیا تھا جو ۴۸ء کی جنگ کشمیر کا گمنام ہیرو تھا' میری بڑی بہن کے غم نے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔

"بیٹا حسن آراء اپنے گھر چلی جائے تو میں سمجھوں گا اللہ نے دنیا ہی میں سب کچھ دے دیا۔" بالآخر انہوں نے کہہ ہی دیا۔



حسن آراء میری بڑی بہن تھی---!

خاندانی روایات کے مطابق بچپن ہی میں اس کی منگنی میرے چچا زاد بھائی سے ہو گئی تھی۔ میرے چچا مرحوم بھی فوج میں صوبیدار تھے۔ وہ ۶۵ء کی جنگ میں شہید ہو گئے--- چچا کی موت کے ساتھ ہی چچی اور اس کے خاندان نے آنکھیں پھیر لیں۔ انہیں برسوں پرانی بھولی ہوئی کہانیاں جانے کیسے یاد آنے لگیں۔

میرے چچا زاد بھائی نے کئی مرتبہ چاہا کہ ان بندھنوں کو توڑے' لیکن ہم لوگ صدیوں سے جس نظام کا حصہ بنے چلے آ رہے تھے اس میں کہیں بھی تو لچک کی گنجائش نہیں تھی۔

میری بہن گھر بیٹھی تھی--- اس انتظار میں کہ کبھی تو کوئی اس کی زندگی کے بند دروازے پر دستک دے گا--- حالات اس کے لئے خوشیوں کے بند در وا کریں گے' لیکن ابھی کوئی دروازہ اس کے لئے کھلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

ماں باپ کا آنگن ٹھنڈی چھایا ہوتا ہے--- لیکن اس چھاؤں میں میری بہن کی جوانی جھلس رہی تھی اور ہم سب بے بس تماشائی بنے خود ہی اپنے لٹنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

تعلیم حاصل کرنے کے باوجود میں اپنی مقدور بھر کوشش سے بھی جہالت کے اس اندھیرے میں کوئی ایک امید کی شمع بھی تو روشن نہیں کر سکتا تھا۔ یہی روگ کھا گیا تھا میرے والد کو---! وہ بڑے مضبوط انسان تھے، لیکن ایک مدت سے تھوڑے تھوڑے کر کے اندر سے ٹوٹنے لگے تھے۔ اس توڑ پھوڑ نے انہیں منتشر کر دیا تھا--- اور ایک روز وہی ہوا۔

انہوں نے حالات سے لڑتے لڑتے بالآخر چپ چاپ آنکھیں موند لیں اور گہری نیند سو گئے---!

جب اس روز علی الصبح وہ وضو کرنے کے لئے بھی کمرے سے باہر نہ آئے تو والدہ نے دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں جگانا چاہا--- آج خلاف معمول ان کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا--- لیکن وہ گہری نیند سو رہے تھے--- اس روز بہت دیر تک میں بجائے ماں بہن اور بھائی کو تسلی دینے کے چپ چاپ آنسو بہاتا رہا۔



آج جب میں گھر یہ اطلاع دینے جا رہا تھا کہ ہم محاذ کی طرف جانے والے ہیں تو ایک بے نام سے خدشے نے میرے ذہن میں سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ہم ایک طویل اور تھکا دینے والی لڑائی لڑنے جا رہے ہیں۔ اس جنگ کا اختتام بھی اس کے آغاز کی طرح بہت لمبا تھا---!!

میرے دل میں اگر کوئی خلش تھی تو یہی کہ اب تک والد صاحب کی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی--- جانے اس کے بعد زندگی اتنی مہلت بھی دے یا نہیں۔

گھر پہنچا تو ماں بے اختیار میری بلائیں لینے کو آگے بڑھی--- بہن نے اپنے سر سے پھسلتا آنچل سنبھالا۔ بھائی آگے بڑھ کر سینے سے لگ گیا--- اس روز مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کسی بھی گھر کے مکینوں کو اپنے محافظ کی کتنی شدت سے ضرورت رہتی ہے۔

میں نے سوچا پاکستان بھی تو میرا گھر ہے---!

آج اس گھر کی طرف دشمن کی میلی اور غلیظ نظریں اٹھی تھیں۔ وہ جانے کب سے اس موقعے کا منتظر تھا جو اسے اب میسر آگیا تھا۔ رات گئے تک ہم ماں بیٹا باتیں کرتے رہے۔ زمانے بھر کی باتیں، ماں نے آج ایک عرصے بعد پھر وہی ضد کی تھی کہ میں شادی کر لوں۔

"بیٹا مجھے علم ہے تو شہر میں کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے--- لے آ اسے۔ مجھے بتا--- میں اپنی سی کر گزروں گی---!"



"ٹھیک ہے ماں--- اس مرتبہ جب بھی آیا شادی کر لوں گا۔" میں نے ہمیشہ کی طرح اسے ایک ہی جواب دیا۔

"کب سے کہتا آ رہا ہے تو---!" اس نے گلہ کیا۔ "میں جانتی ہوں بیٹا تو حسن آراء کا غم کرتا ہے۔ بیٹا اس دنیا میں ہر کوئی اپنا نصیب لے کر آتا ہے۔ جب اللہ کو منظور ہوا سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے اپنے علم کی حد تک مجھے دلیل سے قائل کرنا چاہا۔

"اچھا ماں جی! کہہ جو دیا---!" میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

میری ماں بظاہر ایک ان پڑھ اور سیدھی سادی عورت تھی لیکن تجربات نے اسے بہت کچھ بتا اور سکھا دیا تھا--- اس نے فوجی گھرانے میں جنم لیا تھا اور یہاں کی مخصوص روایات کا مکمل ادراک رکھتی تھی---!

مجھے یاد آگیا جب ۶۵ء میں ایک روز اسی طرح میں اپنی ماں کے پاس اجازت لینے آیا تھا تو اس نے ماتھے پر بل لائے بغیر مجھے کہا تھا۔

"بیٹا! تو حوالدار شیر دل خان کا بیٹا ہی نہیں، پاکستان کا بیٹا بھی ہے۔ تیرے باپ نے کبھی انگریز کی نوکری کرتے ہوئے بھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ تو مسلمان فوجی ہے بیٹا! اگر زندگی میں کبھی مرنے کی سعادت نصیب ہو سینے پر گولی کھانا--- میرے لال! میرے دودھ کی لاج رکھنا---!"

---تب میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ ماں کی اس مختصر سی بات نے میرے لہو میں چنگاریاں دوڑا دی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا اکیلا ساری دنیا سے ٹکرا جاؤں۔

میرے والد اس روز مجھے باہر پکی سڑک تک چھوڑنے آئے تھے۔ انہوں نے راستے میں مجھ سے کہا تھا۔ "بیٹے! ہم نے ہندو کے ہاتھوں بڑے گہرے زخم کھائے ہیں--- میں مسلمان مہاجرین کو قافلوں کی صورت پاکستان لایا کرتا تھا---! میں نے اپنی آنکھوں سے وہ مناظر دیکھے ہیں بیٹا کہ مرجانے کی خواہش کیا کرتا تھا۔

بیٹا میری شدید خواہش تھی کبھی دو بدو اس گھٹیا دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتا سکوں کہ مسلمان بے غیرت نہیں۔ وہ اپنا بدلہ ضرور لیتا ہے--- میری بڑی خواہش تھی بیٹا کہ دشمن سے ٹکراؤں، لیکن موقعہ نہ ملا--- جب تم پیدا ہوئے تو میں نے اللہ سے ایک ہی دعا مانگی تھی کہ میرے مولا! جو کام میں تیرے دین کی عظمت کے لئے نہ کر سکا، وہ میرے بیٹے کے ہاتھوں سے انجام پا جائے---!

اللہ نے میری بات سن لی بیٹا! تجھے کمیشن مل گیا--- آج وہ روز سعید بھی آگیا ہے

میرے لال جب تمہیں دشمن کی سرزمین پر اتر کر اسے غارت کرنے کا موقعہ نصیب ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے گن گن کر بدلے لینا--- دشمن کو للکار کر کہنا کہ مسلمان زندہ ہے--- مر نہیں گیا--- میرے بچے شیر کی زندگی جینا۔ بھلے ایک روز ہی کے لئے جیو---!"

پکی سڑک پر پہنچ کر میں جب بس میں سوار ہونے لگا تو انہوں نے مجھے اتنے زور سے سینے سے لگا کر بھینچا کہ وہ مجھے خود سے زیادہ توانا محسوس ہونے لگے--- انہوں نے میرے ماتھے پر بوسہ دے کر مجھے الوداع کہا تھا---!

# آپریشن جبرالٹر

اس روز ہمیں صرف کسی اہم مشن پر جانے کا حکم ملا تھا---!

اس مشن کی نوعیت سے آگاہی نہیں دی گئی تھی۔ شام کو جب میں نے اپنے ہیڈکوارٹر رپورٹ کی تو کرنل صاحب نے مجھے رات کے کھانے کے فوراً بعد ہی اپنے آفس میں طلب کیا تھا۔ رات کی آمد کا انتظار میں نے ایک ایک لمحہ گن گن کر کیا۔

کھانے کے بعد جب میں نے کرنل صاحب کو رپورٹ کی تو وہ اکیلے اپنے سامنے نقشہ پھیلائے بیٹھے تھے۔ میری آمد پر انہوں نے نقشہ سمیٹ لیا۔

وہ ستمبر ۶۵ء کے ابتدائی دن تھے---!

اس سے پہلے ہمیں ایک مخصوص قسم کی مشق کروائی گئی تھی، جس کے مطابق کمانڈوز پیرا لینڈنگ کرنے کے بعد ایک خاص مقام پر اکٹھے ہوتے تھے اور وہاں سے ٹولیوں کی شکل میں بٹ کر دشمن پر حملہ کیا جاتا تھا۔ مشن مکمل ہونے کے بعد ہر ٹولی اپنے اپنے کمانڈر کے ساتھ واپس آتی تھی۔

اس طرح کی خصوصی مشقیں عموماً خاص حالات ہی میں کروائی جاتی ہیں۔ تب میری عمر ہی کیا تھی، بمشکل بیس سال---! کچھ بھی ہو آج میں یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہوں کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کو حاصل ہونے والے تجربات کی اپنی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ان دنوں مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندوں نے اپنی جنگ آزادی کا بھرپور آغاز کر رکھا تھا۔

سرحدوں پر پیش آنے والے واقعات--- اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال کے پس منظر میں کی جانے والی یہ خاص مشقیں خصوصی اہمیت کی حامل تھیں، لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں انہیں معمول کی کارروائی ہی سمجھتا رہا۔

"ہیلو بوائے---!" کرنل صاحب نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

یہ کرنل صاحب میرے والد کے ساتھ کبھی فوج میں رہ چکے تھے اور انہیں اچھی طرح

جانتے تھے۔ میں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ ان کے دل میں والد صاحب کا جو احترام موجود ہے، اس کی جھلک کبھی کبھی میرے ساتھ ان کے خصوصی برتاؤ کی صورت میں نظر آ جاتی تھی حالانکہ فوجی زندگی تو ہے ہی ڈسپلن کا نام---- لیکن میں خود حیران رہ جاتا جب کبھی کبھی وہ میرے ساتھ بے تکلفی پر اتر آتے تھے۔



"حوالدار شیر دل خان کے بیٹے! آج تیرے امتحان کا وقت آن پہنچا ہے۔" انہوں نے حسب معمول بڑی اہم بات ہنسی مذاق میں کہہ دی تھی۔

"او۔کے سر----!"

"ہوں----!" یہ ان کا خاص انداز تھا۔ جب بھی کرنل صاحب کسی بات سے مطمئن ہوتے تو ایک لمبی "ہوں" سے اس پر صاد کیا کرتے تھے۔

"تھوڑی دیر بعد کانفرنس ہو گی---- گاؤں سے آ رہے ہو؟ کیا حال ہے حوالدار صاحب کا----؟ یار بڑا تگڑا آدمی تھا---- کیا ہو گیا ہے اسے----؟ کبھی یہاں لے آؤ نا----! مجھے تو دیکھتے ہی ایٹ ونس سمارٹ ہو جائے گا----!" گھنی مونچھوں کے پیچھے سے ان کا قہقہہ گونجا۔

میں نے بتایا نا کہ وہ بہت بڑی بات آسانی سے کہہ جاتے تھے۔ ایک لمحے کے لئے ٹکٹکی باندھ کر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر سگریٹ سلگانے لگے۔ شاید اپنے پہلے فقرے کا ردعمل میرے چہرے پر تلاش کر رہے تھے۔ انہیں اب یقین ہو چکا ہو گا کہ حوالدار شیر دل خان کا بیٹا واقعی کمانڈو ہے----!

"ٹھیک ہے----!" وہ اچانک ہی میری طرف گھومے۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میں اب جاؤں۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میں باہر آ گیا۔ اس روز میں نے میس میں موجود قریباً" ہر شخص میں ایک اضطراب اور بے کلی سی نوٹ کی تھی، لیکن ابھی تک کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاید سب کا حال میرے جیسا ہی تھا۔

رات دس بجے کے بعد کانفرنس کا آغاز ہو گیا۔

میرے علاوہ کیپٹن رینک کے قریباً" بیس افسر وہاں موجود تھے۔ ہم لوگ کانفرنس روم میں بیٹھے تھے۔ سامنے دیوار پر نقشہ لٹکا ہوا تھا جس پر بھارتی "تگڈم" نمایاں تھی۔ "تگڈم"



سے ہم لوگ بھارتی ہوائی اڈے آدم پور، ہلواڑہ اور پٹھانکوٹ مراد لیا کرتے تھے۔

"جینٹل مین!" کرنل صاحب نے بھرپور اور گھمبیر لہجے میں ہمیں مخاطب کیا---- "وہ وقت آ گیا ہے جس کے لئے آپ کو تیار کیا جاتا ہے---- کشمیر میں جنگ اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہی ہے۔ آپ کے اکثر ساتھی وہاں ملکی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق جلد ہی ویسٹرن فرنٹ پر دشمن کا بڑا حملہ متوقع ہے----

"کمانڈوز! قوم کی نظریں آج تمہاری طرف اٹھی ہیں۔ انہیں مایوس نہیں لوٹنا چاہیے۔ اگلے دو تین روز میں کسی بھی دن آپ کو مختلف ٹولیوں میں دشمن کی اس "تگڈم" پر پیرالینڈنگ کرنی ہو گی---- دشمن کے ہوائی اڈوں پر موجود جہازوں کو تباہ کر دو---- رات کی تاریکی میں یہ آپریشن ہو گا۔"

ایک لمحے کے لئے رک کر انہوں نے باری باری ہمارے چہروں پر نظریں گاڑیں۔ ہم سانس روکے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کمانڈوز! رات کی تاریکی میں یہ مشن کر کے تمہیں خود ہی اللہ کی مدد اور اپنی قوت کے بل بوتے پر سرحد عبور کر کے واپس پاکستان پہنچنا ہے۔"

اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے "تگڈم" کی وضاحت شروع کی۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس کے اردگرد کیسا علاقہ ہے۔ آبادی، ندی، نالے، پل، آباد اور ویران علاقے، فوج کے ممکنہ ٹھکانے----!

ہمیں ان سب باتوں سے آگاہی دینے کے بعد انہوں نے مختلف سیکشن کمانڈروں کا تقرر کیا۔ میرے حصے میں دس جوان آئے تھے۔ ہمیں پٹھانکوٹ ایئربیس کے نزدیک اترنا تھا اور وہاں اپنا کام مکمل کر کے واپس آ جانا تھا۔

مجھے پیراشوٹ ونگ (P-T-W) سے آئے ابھی بمشکل دو ماہ ہی گزرے تھے کہ یہاں کی کڑی اور سخت ترین آزمائشوں کے عملی مظاہرے کا وقت بھی آ گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تب اس بات کی خوشی تو تھی ہی کہ ہمیں دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقعہ مل رہا ہے، لیکن یہ بات بھی دل میں تھی کہ اپنے جوہر آزمانے کا وقت بھی آ گیا ہے۔

کافی دیر تک کرنل صاحب ٹریننگ کے اسباق دہراتے رہے، پھر ہمیں واپس جانے کا حکم مل گیا۔



اس روز سرشام ہی ہمیں تیاری کا حکم ملا تھا۔

ہم لوگوں کو پانچ پانچ ٹولیوں کی شکل میں بانٹا گیا تھا اور فورس کمانڈر کی رہنمائی میں ان ٹولیوں نے زمین پر اترنے کے بعد مربوط شکل میں بطور یونٹ کام کرنا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی ہم سب ٹرکوں میں سوار ہو کر پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی تک ہمیں نقشے اور مقامی کرنسی فراہم نہیں کی گئی تھی۔ شاید اس لئے روانگی میں بھی کچھ دیر ہو گئی تھی۔

منصوبہ بندی کے مطابق ہمیں رات کی تاریکی ہی میں اپنا کام مکمل کر کے صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے پاکستانی سرحدوں کی طرف لوٹ آنا تھا۔

ہمیں آج صبح ہی بھارت کی طرف سے آل آؤٹ حملے کی اطلاع مل چکی تھی۔ تب سے اب تک میں محسوس کر سکتا تھا کہ جس صورت حال سے میں خود گزر رہا ہوں، یہاں موجود ہر کمانڈو اس کیفیت کا شکار ہے۔ صبح سے اب تک مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے بدن میں برقی لہریں دوڑ رہی ہوں۔ میرے بہت سے ساتھی جنہوں نے اس نوعیت کی مشقوں میں میرے ساتھ حصہ لیا تھا، کشمیر کے محاذ پر مصروف جہاد تھے۔

صبح سے اب تک مختلف ٹولیاں اپنے اپنے ہدف کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ کمانڈوز کسی بھی فوج کی ریڑھ کی ہڈی شمار کئے جاتے ہیں۔ فعال، متحرک اور ہر دم تیار کمانڈوز ہی کسی فوج کی فتح میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں اور ہم سے زیادہ شدت سے اس تلخ حقیقت کا ادراک اور کسے ہو سکتا تھا؟

ہمیں علم تھا کہ ہم ایک چھوٹی فوج کے سپاہی ہیں جس کا مقابلہ ٹڈی دل کے ایک بہت بڑے جم غفیر سے ہے۔ ہمیں یہ لڑائی اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور جذبہ ایمان کے بل بوتے پر لڑنی تھی--- جس مشن پر ہم جا رہے تھے اس کی منصوبہ بندی کرنے والوں نے بھی یقیناً یہی سوچا ہو گا کہ ان کے منصوبے پر عمل در آمد کرنے والے کون لوگ ہیں---!

میں آج بھی یہ بات دعوے سے کہنے کے لئے تیار ہوں کہ منصوبہ بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ اس کے کردار پاکستانی کمانڈوز ہیں---- حد سے بڑھا ہوا اعتماد بسا اوقات نقصان دہ بھی ثابت ہوا کرتا ہے جس کا اندازہ منصوبہ سازوں کو بعد میں ہوا۔

دشمن کے پیٹ میں سپیشل سروس گروپ (ایس-ایس-جی) کے سرفروشوں کو اتارنے والے شاید یہ بھول گئے تھے کہ انہیں ان سربلندوں کو واپس لانے کا بھی بندوبست کرنا چاہیے تھا۔

کسی بھی لمحے ہم محاذ جنگ پر پہنچنے والے تھے اور ابھی تک ہمیں ان علاقوں کے نقشے بھی مہیا نہیں کئے گئے تھے جہاں ہمیں اترنا اور کام کرنا تھا۔ جس سڑک پر ہم سفر کر رہے



اس میں ہمارے ساتھ ہمارے فورس کمانڈر میجر صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں بھی ان کی آنکھیں اور ماتھے پر ابھری سلوٹیں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں ان کے قریباً سامنے بیٹھا تھا۔ ٹرک میں گھمبیر سناٹا طاری تھا۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔ جب بھی اچانک میری نظروں کا تصادم میجر صاحب کی نظروں سے ہوتا، ایک جھرجھری سی میرے بدن پر طاری ہو جاتی۔ میں کپکپا کر رہ جاتا۔ "Know Your Men" (اپنے آدمیوں کو پہچانو۔) مجھے ٹریننگ میں پڑھایا ہوا سبق یاد آ گیا۔

یہ خاموشی اب مجھے کھلنے لگی تھی۔ میں ابھی بولنے کے لئے موزوں الفاظ تلاش ہی کر رہا تھا جب اچانک میجر صاحب کی دھاڑ گونجی۔

"جوانو! جنگ تمہارے لئے کوئی اجنبی شے نہیں۔ تم صدیوں سے لڑتے آ رہے ہو۔ تم میں زیادہ تعداد ان کی ہے جن کے آباؤ اجداد کا پیشہ بھی سپاہ گری تھا۔ آج بہت مدت بعد ہمیں یہ موقع نصیب ہوا ہے--- پاکستان کے شیر دل جوانو! سپاہی کا کام سوچنا نہیں، عمل کرنا ہے۔ اپنے ذرائع پر نظر نہ رکھنا۔ اپنی اصلیت کو یاد رکھنا۔ تم وہ ہو جن کے آباؤ اجداد نے صدیوں پہلے ایک مسلمان زادی کی فریاد پر اس ملک کے ساحلوں پر قدم رکھا تھا اور دنیا نے دیکھا وہ قندھار سے راس کماری تک چھا گئے۔

جوانو! اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے جانا۔ اللہ اپنی مدد کا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔"



میجر صاحب کی بات کے اختتام پر جوانوں کے چہرے جوش غضب سے تمتمانے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں سے قہر جھلکنے لگا تھا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن میری تو زبان ہی جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔ ہم لوگ رات کے اندھیرے میں مطلوبہ ایئرپورٹ تک پہنچ گئے۔

بلیک آؤٹ کی وجہ سے ہم نے اپنے ٹرک کی ہیڈلائٹس بجھا رکھی تھیں۔ ایئرپورٹ سے کافی فاصلے ہی پر ہمیں اپنے شہبازوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ ہمارے شہباز یہاں سے دشمن پر جھپٹنے کے لئے جا رہے تھے۔

ان کے طیاروں کے انجنوں سے ہونے والی گڑگڑاہٹ ہماری رگوں میں در آئی تھی۔ مجھے اپنے وجود میں طیاروں کا شور اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔

ایئرپورٹ سے دور ہی ہمارا ٹرک رک گیا۔ یہاں ایئرفورس کے مستعد "پروسٹ گارڈ" ہمارے استقبال کو موجود تھے۔

"فال ان---!" میجر صاحب کی دھاڑ گونجی۔

وہ سب سے پہلے ٹرک سے باہر نکلے تھے۔ جوان اس حکم پر بجلی کی سی پھرتی سے چھلانگیں لگاتے باہر آئے اور لائن بنا کر کھڑے ہو گئے۔

"مارچ---!" اگلا حکم ملا۔

ہماری رہنمائی کے لئے ایئرفورس کے "پروسٹ مارشل" موجود تھے۔ ہم ان کی رہنمائی میں وہاں سے نزدیک ہی ایک جگہ پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا جہاں کیروسین لیمپ کی مدھم روشنی موجود تھی۔

احتیاط اتنی برتی گئی تھی کہ یہاں سے روشنی کی ایک کرن بھی باہر نہیں جا سکتی تھی۔

یہاں ہمارے او-سی بھی پہلے سے موجود تھے اور دیوار پر ایک بڑا نقشہ ٹنگا ہوا تھا۔ اس نقشے کے ذریعے ایک مرتبہ پھر ہمیں اپنے ہدف سے متعلق ہدایات دی گئیں۔

ہمیں بتایا گیا کہ گروپ کمانڈروں کو ابھی تھوڑی دیر بعد "ٹارگٹ" سے متعلق نقشے فراہم کئے جائیں گے۔ او-سی صاحب نے ایک مرتبہ پھر جوانوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ سب کو باری باری سمجھایا گیا کہ کس نے کیا کرنا ہے اور گفتگو کے خاتمے پر کرنل صاحب ہمیں خدا حافظ کہہ کر باہر چلے گئے۔ ان کی روانگی کے فوراً بعد ہی میجر صاحب کی گونج سنائی دی۔

"کمانڈوز! گٹ ریڈی" (Get Ready)

ہم سب ایک منظم لیکن بہت تیزی سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے--- اپنے کندھوں سے لٹکے تھیلے کھولے اور اپنے اپنے "ہارنس" پہننے لگے۔

ہارنس اور پیراشوٹ میں ملبوس ہونے میں ہم نے بمشکل تین منٹ لگائے تھے۔ اپنے اپنے ہارنس پہن کر ہم فوراً ایک ترتیب میں کھڑے ہو گئے۔

میجر صاحب بھی اس دوران تیار ہو چکے تھے۔ ان کی دوبارہ للکار گونجی۔ "کمانڈوز چیک---!"

دوسرے ہی لمحے ہم ایک، دوسرے کا "فضائی لباس" چیک کرنے میں مشغول تھے۔ یہ عمل بھی تین چار منٹ میں انجام پا گیا۔

"کمانڈوز! ہتھیار سنبھالو---!" اگلا حکم ملا۔

سب نے اپنے اپنے ہتھیار چوم چوم کر اٹھائے تھے۔ خود میرے جذبات کا یہ عالم تھا کہ میں نے اپنے سٹین گن کا سلنگ اپنے کندھے پر ڈالتے ہوئے اسے چوما تھا۔



"فان ان کمانڈوز---!" میجر صاحب دھاڑے۔

ہم لوگ فوراً ہی اس کمرے سے باہر قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ہر گروپ کمانڈر کے جوان اس کے دائیں بائیں جم کر کھڑے تھے۔



۶ ستمبر کی وہ رات قوم کے مقدر کا ستارہ بن گئی تھی---!

ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے شاہباز دھاڑتے ہوئے آسمان کی سمت اٹھتے اور اس کی لامحدود وسعتوں میں دور کہیں گم ہو جاتے۔ ہماری نظریں آخری دم تک ان طیاروں پر جمی رہتیں جو دشمن کی بدبختی پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے یہاں سے آ اور جا رہے تھے۔

وقت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا---!

میری طرح میجر صاحب کی نظریں بھی نجانے اب تک کتنی مرتبہ اپنی گھڑی کی چمکتی سوئیوں کا جائزہ لے چکی تھیں۔ ہمارا مقررہ وقت بھی گزر چکا تھا' لیکن ابھی تک ہمیں بھارتی کرنسی اور نقشے فراہم نہیں کئے گئے تھے---! جوان جلد از جلد کچھ کر گزرنے کے لئے بے چین نظر آ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے وہ لمحہ آیا جب ہمیں نقشے اور کرنسی فراہم کی گئی--- آغاز اچھا نہیں ہوا تھا۔ پلاننگ میں یقیناً کہیں نقص رہ گیا تھا--- لیکن یہ سوچنا ہمارا کام نہیں تھا۔ ہم تو کچھ کر گزرنے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔

بالآخر وہ مبارک ساعت آ ہی گئی۔ اب حملے کا وقت بدل کر رات دو بج کر دس منٹ کر دیا گیا تھا۔ ٹھیک رات کے دو بجے ٹرک ہمارے قریب آ کر رکا۔ میجر صاحب قطار کے ایک سرے سے چلتے ہوئے دوسرے سرے تک جوانوں کے چہروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے نکل گئے---!

"کمانڈوز---!" میجر صاحب کی آواز نے قہر برسایا۔ "آخری جوان' آخری گولی تک لڑو۔ سنگینوں سے لڑو--- خالی ہاتھ لڑو--- گرفتاری کی صورت میں اپنے ہتھیار تباہ کر دو--- شناخت ختم کر دو--- نعرہ تکبیر---!"

"اللہ اکبر---!" فضائیں چنگاڑیں۔

"موو---!" میجر صاحب کا نعرہ مستانہ گونجا۔

"حیدرؓ--- حیدرؓ--- حیدرؓ--- حیدرؓ---!" کمانڈوز نے جوش غضب سے

اپنے دائیں ہاتھوں میں پکڑی گنیں بلند کر کے نعرے بلند کئے اور ہم سب پلک جھپکتے ٹرک میں سوار تھے۔

ٹرک بڑی تیزی سے رن وے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ رن وے کی طرف جاتے ہوئے ہمیں کمانڈوز کے مخصوص نعرے سنائی دے رہے تھے۔ جلد ہی مخالف سمت سے آنے والے دو ٹرک بھی ہمیں نظر آ گئے۔ ہمارے اور ساتھی بھی شہادت گاہ عشق میں ہمارے ساتھ ہی قدم رکھ رہے تھے---!



رن وے پر تین دیوہیکل سی-۱۳۰ جہاز ہمیں لے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ ہوائی اڈہ اس دوران "اللہ اکبر" کے نعروں سے مسلسل گونج رہا تھا--- ان جہازوں کو ایئرفورس کے جوانوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا---!

ہوائی اڈے کا قریباً سارا ہی عملہ تمام احتیاطی تدابیر بالائے طاق رکھ کر ہمارے استقبال کو آ گیا تھا۔

وہ لوگ ہم سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے بلند کر رہے تھے---! میں شاید زندگی بھر اس فلائٹ سارجنٹ کو نہ بھول پاؤں گا جس کا نورانی چہرہ جوش عقیدت سے تمتما رہا تھا--- وہ بلند آواز سے قرآن پاک کی سورۃ الانفال کی آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔

"اے نبی ﷺ! مومنین کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آئیں گے۔ اس لئے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو دین کو کچھ نہیں سمجھتے........ اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر مزید چند منٹ تک ہم یہاں رکے تو شاید شدت جذبات سے پھٹ جائیں گے۔ ہمارا ٹرک جیسے ہی ایک سی-۱۳۰ کے نزدیک پہنچا۔ اس کی Tail کھل گئی۔

سب سے پہلے حسب روایت میجر صاحب چھلانگ لگا کر باہر کودے۔

"کم آن ٹائیگرز---!" وہ دھاڑے۔



کمانڈوز ٹائیگرز کی طرح اپنے شکار پر جھپٹنے کے سے انداز میں جہاز کی طرف لپکے۔ سوار ہونے پر کمانڈوز کے کندھے پر میجر صاحب تھپکی دے کر آہستہ سے "فی امان اللہ" ضرور کہتے تھے۔



چند ہی منٹ پر جہاز کی دم بند ہو گئی۔

مجھے فوراً ہی پیراشوٹ ٹریننگ ونگ (P-T-W) یاد آ گیا۔ ابھی مجھے اپنی تربیت مکمل کر کے واپس آئے دو ماہ ہی تو گزرے تھے جب قدرت نے مجھے آزمائش کی بھٹی میں ڈالنے کا فیصلہ کر دیا تھا--- میں کڑی کڑی آزمائشوں سے گزرا تھا۔ پی-ٹی-ڈبلیو میں گزرا ایک ایک لمحہ سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا---!

میری تربیت کرنے والے سٹاف کی شکلیں ایک ایک کر کے میرے سامنے نمایاں ہونے لگی تھیں۔ وہ سب لوگ سوال بن کر میرے سامنے کھڑے تھے اور اپنی تربیت کا "حق" مانگ رہے تھے۔

انہوں نے دن رات ایک ایک لمحہ میرے ساتھ بتایا تھا--- تربیت کا ایک ایک سبق میرے لاشعور میں جاگ اٹھا---! تھوڑی ہی دیر بعد دروازے بند ہو گئے۔ جہاز کے انجن زوردار گڑگڑاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ مخصوص بتیوں نے جل بجھ کر جہاز کے ٹیک آف کرنے کا اشارہ دیا اور چند منٹ بعد ہم فضا کی لامتناہی وسعتوں میں گم اپنے اپنے مستقر کی طرف محو پرواز تھے۔

جہاز میں سکوت طاری تھا--- انجنوں کی گڑگڑاہٹ تھی یا پھر ہماری سوچیں۔ میں جان سکتا تھا یہاں موجود لوگ کیا سوچ رہے ہیں--- اپنے ساتھ بیٹھے حوالدار مہرخان پر میں نے ایک نظر ڈالی--- وہ بے اختیار میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

اچانک ہی جہاز کے اندر لگی سرخ بتی جلنے لگی--- "ڈراپنگ زون" آ گیا تھا۔

"تیار--- کمانڈوز--- ڈراپنگ زون---!" پائیلٹ کا مختصر سا پیغام سنائی دیا۔

"نعرہ تکبیر---!" حوالدار مہرخان شدت غیظ و غضب سے پھٹ پڑا۔

"اللہ اکبر---!" کمانڈوز تن کر کھڑے ہو گئے۔

"چیک---!" میجر صاحب کا حکم سنائی دیا۔

"پاس---! پاس--- پاس!!" ہر کمانڈو باری باری اپنے سے اگلے جوان کا ہارنس اور

پیراشوٹ چیک کرتا اور "پاس" کہہ کر اپنی طرف سے اس کے صحیح ہونے کا اعلان کر دیتا۔

یہ سارا عمل بمشکل دو منٹ میں مکمل ہو گیا۔ کمانڈوز مشینی انداز میں اپنی تربیت دہرا رہے تھے۔ عین ان لمحات میں جہاز کے دروازوں پر لگے سرخ بلب روشن ہو گئے۔ ان بلبوں کے اوپر لگی ایک گھڑی میں ہندسے جلنے بجھنے لگے۔

"سٹینڈ ان دی ڈور----!" میجر صاحب پکارے۔

"حیدرؓ---- حیدرؓ----!" پکارتے سربلند جیالے "موک ڈورز" کی طرف بڑھنے لگے۔

سب سے پہلے چھلانگ لگانے کی سعادت مجھے نصیب ہونے والی تھی کیونکہ ہماری تربیت کے مطابق "میدان عمل" میں ہر کام کا آغاز ہمیشہ افسر کرتے ہیں۔

جیسے ہی میں اپنی "سٹیٹک لائن" (Static Line) سیدھی کر کے دروازے تک پہنچا، اچانک ہی دروازہ کھل گیا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے وجود کے ڈگمگانے کا احساس ضرور ہوا تھا، لیکن یہ لمحہ انسانی سوچ سے بھی مختصر تھا۔

میرے قدم تو جیسے فرش میں گڑھے ہوئے تھے۔

"جمپ کمانڈوز----!" میجر صاحب کی دھاڑ جہاز میں ہوا کے زور سے در آنے والے شور پر مکمل حاوی تھی۔

"اللہ اکبر----!" میں نے اپنی سٹیٹک لائن کو جھٹکے سے آگے کی طرف دھکیلا اور دشمن کی فضاؤں میں چھلانگ لگا دی۔

چند ہی سیکنڈ بعد ایک زوردار جھٹکے سے میرا پیرا شوٹ کھل گیا۔ میرے حواس مکمل بحال تھے اور آنکھیں بخوبی فضا کا جائزہ لے سکتی تھیں----!

بوڑھا آسمان میرے ساتھ ساتھ زمین کی طرف جھک رہا تھا۔ ستارے ٹمٹما کر میرے ساتھیوں کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ میں اپنے گرداگرد فضا میں اپنے ساتھی چھاتہ برداروں کا بخوبی نظارہ کر سکتا تھا۔

ہمارا پائیلٹ بڑا ذہین تھا---- وہ جہاز کو دشمن کے ریڈار کی برقی آنکھوں سے بچا کر بڑی ہوشیاری سے یہاں تک لے آیا تھا---- لیکن نیوی گیٹر شاید اندازے کی غلطی کا شکار ہو گیا۔





پٹھانکوٹ کو پنجاب اور کشمیر کا سرحدی علاقہ کہا جاتا ہے۔ اس کے فوراً بعد ہی جموں شروع ہو جاتا ہے اور پنجاب کی طرف آئیں تو بھارت کے ضلع گورداسپور کی تحصیل دینا نگر آتی ہے۔

یہ تمام سرحدی علاقہ ہے جہاں زمانہ جنگ ہو یا امن، فوجیں ہمیشہ چوکس رہتی ہیں۔ بھارت اور پاکستان کی سرحد پر بلاشبہ یہ سب سے زیادہ حساس "سرحدی علاقہ" ہے----!

ہمیں منصوبے کے مطابق پانچ ٹولیوں میں اکٹھے ہو کر مربوط ہونا اور حملہ کرنا تھا----! میں اپنی ٹولی کا کمانڈر تھا اور میرے ساتھ دس جانباز موجود تھے۔ جس علاقے میں ہمیں اتارا گیا، یہ نہروں، ندی نالوں، پہاڑی ٹیلوں اور درختوں سے اٹا پڑا تھا۔

یہ تو ہماری ٹریننگ کے دوران پیرا لینڈنگ فال (P-L-F) کی مشق کا صدقہ تھا کہ یہاں پیرا کمانڈوز کسی نہ کسی طرح زمین تک پہنچ گئے ورنہ رات کے اندھیرے میں یہاں درختوں اور پتھریلے ٹیلوں سے بچ نکلنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔

زمین سے قدم چھوتے ہی مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر دامن گیر ہوئی۔ میرے قریب میرے دو اور ساتھیوں نے لینڈ کیا تھا----! میں نے پھرتی سے اپنا پیراشوٹ سمیٹا اور وہیں رک کر اپنے ساتھیوں کی آمد کا منتظر ہو رہا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میرے باقی ساتھی وہاں جمع ہو سکے۔

ابھی تک ہمیں دوسری ٹولی کا علم نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی میرا رابطہ دوسرے کسی سیکشن سے قائم ہو سکا تھا۔ جب میرا گروپ اکٹھا ہوا اور ہم نے مقامی نقشے کی مدد سے اس جگہ کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ ہم ابھی مطلوبہ ہدف سے کم از کم بارہ تا پندرہ میل دور ہیں۔

میں نے اندازہ لگایا، اگر ہم پیدل یہاں سے اپنے ٹارگٹ کی طرف چلنا شروع کر دیں تو مطلوبہ مقام پر پہنچنے تک اجالا پھیلنا شروع ہو جاتا اور واپسی کے لئے تو سورج نکل آنا لازمی تھا----!

دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ ابھی تک میرا رابطہ "یونٹ کمانڈر" میجر صاحب سے بھی قائم نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے جو بھی فیصلہ کرنا تھا، فوراً کرنا تھا---- اور اس پر فوراً ہی عمل پیرا ہونا تھا----!

زندگی میں ایسے نازک اور اہم موڑ ضرور آتے ہیں جب قدرت انسان کو امتحان کی ایسی بھٹی میں اچانک ہی پھینک دیتی ہے جہاں سے وہ اپنی عقل اور علم کے بل بوتے پر کم از کم کبھی باہر نہیں آ سکتا۔

یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ یہ "مقامات" آغاز ہی سے میرا مقدر بننے لگے تھے---!

☆○☆

میں نے اپنے وائرلیس آپریٹر کی طرف دیکھا جو بے چارہ پندرہ بیس منٹ سے باقی گروپوں سے رابطے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھیں اسی پر گڑی تھیں جب کہ باقی جوان ترتیب اور تنظیم کے مطابق میرے گرداگرد پھیلے ہوئے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر بڑی بے چینی سے وائرلیس آپریٹر سے رپورٹ طلب کی۔

"نو کنیکٹ سر!" اس نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔

"او-کے! آپریشنل کمانڈ سے ملاؤ---!" میں نے چاہا کہ صورت حال بتا کر ہدایات طلب کروں۔

جلد ہی ہمارا رابطہ "آپریشنل کمانڈ" سے بحال ہو گیا۔ میں نے علاقے کی کیفیت بتا کر دوسرے گروپوں کے حالات بتا کر اگلے اقدام کے لئے احکامات طلب کئے۔

"نمبر سیون......... اس علاقے میں انڈین بکتر بند ڈویژن موو (MOve) کر رہا ہے۔ تم لوگ پسپائی اختیار کرو اور سرحد عبور کر کے صبح ہونے تک واپس پہنچنے کی کوشش کرو--- آؤٹ!" آپریشنل کمانڈ نے فوراً" ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔

سپاہی کا فرض احکامات کی تعمیل ہے اور بس--- وہ سوچتا نہیں، عمل کرتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ اسے کیا حکم دیا جا رہا ہے--- مستقبل کا مؤرخ جب کبھی پاکستان کی کسی بھی جنگ کی تاریخ لکھے گا تو وہ ایک بات ضرور کہے گا کہ چھوٹے افسروں اور جوانوں نے کبھی اپنے فرض سے کوتاہی نہیں برتی--- اگر کبھی پلاننگ میں کوئی خامی رہ گئی تھی تو وہ افسران بالا کے سبب---!

پاکستانی فوج کی عظمت کا راز یہی ہے کہ اس کے جوانوں اور افسروں نے اپنے اعلیٰ کمانداروں کے احکامات کو عمل کی کسوٹی پر کبھی نہیں پرکھا۔

میرے ساتھ جو کمانڈوز کھڑے تھے وہ اپنے دل میں جانے کیا کیا ارمان رکھتے تھے، لیکن جب میں نے انہیں ہائی کمان کے نئے حکم سے آگاہ کیا تو کیا مجال جو کسی کی پیشانی پر بل پڑا ہو--- میں نے نقشے کے ذریعے اندازہ لگا لیا کہ صبح تک کسی بھی صورت ہمارا یہاں سے پاکستان پہنچنا ممکن نہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو مقامی سرحد سے ہماری ناشناسائی تھی اور



دوسری یہاں انڈین فوج کی موجودگی۔

ہمیں نقشے کی مدد سے اندھوں کی طرح راستہ ٹٹول ٹٹول کر سرحد عبور کرنا تھی۔ پھر بھی میں نے فیصلہ کیا کہ ہم پاکستان کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ اگر ہمیں راستے میں صبح کا اجالا ہو گیا تو ہم رات تک کا وقت وہیں چھپ کر گزاریں گے اور پھر رات کی تاریکی میں سرحد عبور کر جائیں گے---! میں نے اپنے جوانوں کو مراجعت کا حکم دیا۔

ہم لوگ فوراً" ہی جنگی فارمیشن میں پسپائی اختیار کرنے لگے---!

میں نے جنگلی گھاس، ندی نالوں اور ویران علاقے کو اپنی واپسی کے لئے منتخب کیا تھا۔ سڑک کے راستے واپس جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کیونکہ اس راستے پر بھارتی فوج کی نظر بہت پہلے سے رہی ہو گی۔

میں نے اپنے جوانوں کو بکھر کر لیکن مربوط طریقے سے پاکستانی سرحد کی طرف چلنے کی تلقین کی تھی۔ ہم نے کچھ راستہ سڑک کے ساتھ ساتھ طے کرنا تھا تاکہ اپنی صحیح سمت کا آسانی سے تعین کر سکیں۔ ابھی بمشکل ایک ڈیڑھ فرلانگ ہی چل پائے تھے کہ--- سب سے آگے چلنے والے ایک جوان نے، جو اس علاقے سے کچھ شدبد رکھتا تھا، اچانک ہی ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔

تمام جوان وہیں رک گئے---!

میں اپنی جگہ سے آگے نکلا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس علاقے کی پوزیشن کچھ اس طرح کی تھی کہ جو مجھے سامنے کا منظر نظر آ سکتا تھا وہ اوروں کو نہیں۔ اس طرح جو اور دیکھ سکتے تھے، اسے میں دیکھنے سے محروم رہتا۔

"سر! وہ سامنے---!" اس نے انگلی سے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا--- اس نے بڑی سڑک کی طرف اشارہ کیا تھا جو پٹھانکوٹ سے جموں کو جاتی ہے--- کمانڈوز کی چھٹی حس سخت ترین تربیتی مراحل میں سے گزرنے کے بعد کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتی ہے۔

میں نے چند سیکنڈ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھا--- اپنے کان بھی کسی ممکنہ آہٹ پر لگائے۔ کوئی خاص احساس تو نہ ہوا، لیکن میں بھی محسوس کر سکتا تھا کہ کوئی بات ہے ضرور---!

ہم دونوں زمین پر جھک گئے اور اپنے کان زمین سے لگا دیئے--- کمانڈوز کو کان زمین

سے لگا کر بہت دور ہونے والی کسی بھی نقل و حرکت کو نوٹ کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ بمشکل آدھ منٹ بعد ہی ہم دونوں جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

زمین نے ہمارے خدشات پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ میں نے فوراً تین جوانوں کی ایک "پٹرول" ترتیب دی اور انہیں حکم دیا کہ وہ "ریکی" کر کے آئیں اور اس بات کا جائزہ لیں کہ اس کنوائے کا رخ کس طرف ہے اور ان کے مقاصد کیا ہیں؟



تین جوان اس مہم پر روانہ ہو گئے جب کہ میرے باقی ساتھی پھیل کر پوزیشن لینے لگے۔ ان لوگوں کی واپسی بمشکل پانچ منٹ بعد ہی ہو گئی۔ ان کی زبانی علم ہوا کہ یہ تو کوئی آرمڈ بریگیڈ ہے جو رات کے اندھیرے میں پنجاب سے کشمیر محاذ کی طرف جا رہا ہے۔۔۔!

میرا ذہن فوراً اپنی "آپریشنل کمانڈ" کی فراہم کردہ اطلاع کی طرف مڑ گیا۔ بعد میں ہمیں علم ہوا کہ یہ پورا ایک بکتر ڈویژن تھا جو پٹھانکوٹ سے جموں کی طرف جا رہا تھا' جب اچانک اسے اس اطلاع پر روک لیا گیا کہ پاکستانی پیراکمانڈوز اس علاقے میں اتر آئے ہیں۔

پٹھانکوٹ ہوائی اڈے پر ہم ساٹھ پیرا کمانڈو اترے تھے اور اب پورا بکتر بند ڈویژن بھارتی فوج نے ہمارے استقبال کے لئے روک لیا تھا۔۔۔۔ یہ علاقہ جہاں ہم پھنسے ہوئے تھے پہاڑی ندی نالوں اور جنگلی گھاس سے ڈھکا ہوا تھا اور میں سمجھ سکتا تھا کہ اس سے بہتر پناہ گاہ کا فی الحال میسر آنا ناممکن تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کسی فیصلے پر پہنچوں' اچانک ہی فضا میں گولے اور گولیاں دھاڑنے لگیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس علاقے میں اترنے والے کچھ پیرا کمانڈوز ان لوگوں کی نظر میں آ گئے ہیں اور اب بھارتی فوج انہیں گھیرے میں لے کر فائرنگ کر رہی ہے۔

میں نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ محفوظ پوزیشنوں میں چلے جائیں اور اس وقت تک ایک گولی فائر نہ کریں جب تک میں انہیں حکم نہ دوں۔۔۔۔!

پل جھپکتے ہی کمانڈوز وہاں سے ایسے غائب ہو گئے جیسے انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا ہو۔

یہ تو خصوصی حالات تھے۔ عام حالات میں بھی شاید ہم لوگ بھارتی فوج کی طرح بے دریغ گولہ بارود پھونکنے کا خطرہ مول نہ لے سکتے۔۔۔۔! بھارتی فوج کی فائرنگ ہمارے لئے





کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔ دشمن نے ہم کسی خیر کی توقع لے کر یہاں نہیں آئے تھے۔ ہماری خواہش تو صرف یہ تھی کہ صبح ہونے تک دشمن کی زد سے جتنی دور بھی ممکن ہو' پہنچ سکیں۔

کمانڈوز کو اس بات کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے کہ رات کے اندھیرے میں دشمن سے خود کو چھپانے کے لئے وہ ایک دوسرے کو آواز دے کر مخاطب نہیں کرتے بلکہ پہلے ہی سے مختلف اشارے اور آوازیں مقرر کر لی جاتی ہیں جن کے مخصوص مطلب ہوتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔۔۔!

روانگی سے پہلے ہم نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ یہاں وہی آوازیں نکالی جائیں جن سے جانوروں کی موجودگی کا یقین ہو۔ میں نے اپنے ساتھ کھڑے حوالدار کو ہاتھ سے مخصوص اشارہ کیا تو اس نے مینڈک کے ٹرانے کی آواز نکالی۔ یہی آواز پھر اس سے کچھ فاصلے پر نکالی گئی اور چند منٹ بعد ہی میرے دستے کے تمام جوان میری کمانڈ میں سرحد کی طرف پسپائی اختیار کر رہے تھے۔



۶ ستمبر کی رات کو دشمن پر ہونے والے پاکستانی فضائیہ کے تابڑ توڑ حملوں نے اس کا مورال بری طرح تباہ کر دیا تھا۔ بھارتی فوج گو کہ اندازے سے اندھا دھند گولہ باری کر رہی تھی لیکن ان لوگوں نے "روشنی راؤنڈ" فائر کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ شاید ان کے لاشعور میں کہیں یہ خوف ابھی تک محفوظ تھا کہ روشنی پھیلنے سے پاکستان ایئرفورس کو بھی شاندار ٹارگٹ میسر آ جاتا۔

ہم لوگ جنگلی گھاس اور پہاڑی ندی نالوں کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ابھی تک فائرنگ ہمارے پیچھے ہو رہی تھی۔۔۔۔ دشمن کو اس بات کا بھی بہرحال احساس تھا کہ اس کے اپنے فوجی دستے بھی اس علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ اندھا دھند فائرنگ تو ضرور کر رہا تھا لیکن "حساس علاقے" سے پرے پرے۔

اس علاقے کی پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ ہمیں جگہ جگہ رک کر نقشے کی مدد لینا پڑتی۔ ہم نے سرحد صرف اپنے پاس موجود نقشے کی مدد سے عبور کرنی تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی اتفاق سے اس علاقے سے واقف نہیں تھا۔۔۔۔! ہماری واقفیت اس علاقے سے صرف نقشے کی حد تک ہی تھی۔



ہم لوگ جس علاقے میں سفر کر رہے تھے گو کہ یہ ہمارے سفر کرنے کے لئے قدرے محفوظ تھا' لیکن یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ یہ اس محاذ کا حساس ترین ایریا ہے---- پنجاب اور کشمیر کا سنگم۔ مقبوضہ جموں و کشمیر میں دشمن اس راستے سے داخل ہوا تھا اور وہاں موجود بھارت کی فوج ظفر موج کے لئے سپلائی بھی اس راستے سے جاتی تھی----!

بھارتی ہائی کمان کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ پاکستانی حملہ اس سمت سے آئے گا۔ ان حالات میں یہاں چپے چپے پر بھارتی فوج نے مورچہ بندیاں کر رکھی تھیں۔ ہم کتنے ہی محتاط کیوں نہ ہو جاتے' ان محفوظ بنکروں میں موجود بھارتی فوج سے ٹکرائے بغیر آگے نکل جانے کے مواقع ہمیں میسر نہیں تھے۔

میرے خدشات کے عین مطابق ابھی ہم نے بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک ہمارے سامنے والی سمت سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرے قدم اسی جگہ جم گئے۔ ہم پر دو اطراف سے فائرنگ ہونے لگی تھی۔

تازہ فائرنگ اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ طلوع سحر تک دشمن ہمیں بہرصورت الجھائے رکھنا چاہتا تھا۔ شاید بھارتی جوان رات کے اندھیرے میں اپنے مورچوں سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے اور ان کے افسران کے ذہنوں میں سودا سمایا تھا کہ وہ لوگ ہمیں دن کے اجالے میں چن چن کر شکار کر لیں گے---- لیکن ہم یہاں دشمن کا تر نوالہ بننے نہیں آئے تھے۔

میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرے ساتھی کمانڈوز اس وقت ذہنی کرب کے کس عالم سے گزر رہے ہیں۔ وہ لوگ دلوں میں جانے کتنے ارمان لے کر آئے تھے' لیکن ہائی کمان کی غلط پلاننگ اور بروقت اسباب میسر نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ارمان دل ہی میں رہ گئے تھے۔ کسی بھی سپاہی کی زندگی کا اذیت ناک ترین لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے دل میں کچھ کرنے کی حسرت ہی لے کر مر جائے----!

میں نے اس بات کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر دشمن نے ہمارے بازو آزمانے کی قسم ہی کھا لی ہے تو ہم لوگ بھی اپنے ارمان ضرور نکالیں گے اور دشمن کے لئے تر نوالہ بننے کے بجائے ایسی ہڈی بنیں گے جو اس کے حلق میں ایک مرتبہ اٹکے تو اسے نگلنے کی نوبت ہی نہ آ سکے۔





میرے تمام جوان میرے گرداگرد پوزیشنیں لئے میرے اشارے کے منتظر تھے۔ سامنے سے ہونے والی تازہ فائرنگ نے ہمیں احساس دلا دیا تھا کہ دشمن ہمارے بالکل قریب ہی کہیں مورچہ بند ہے۔ میری نظریں بڑی بے تابی سے سامنے کی صورت حال کا جائزہ لے رہی تھیں----! ہم لوگ ایک برساتی نالے میں چھپے ہوئے تھے۔ یہاں شاید شدید بارشوں کے دنوں میں پانی آتا ہو گا---- فی الوقت تو نالہ بالکل خشک اور جنگلی گھاس سے اٹا ہوا تھا۔

میرے جوان جنگی فارمیشن کے مطابق نالے کے باہری کنارے تک اس ترتیب سے پھیلے ہوئے تھے کہ چند سیکنڈ ہی میں میرا کوئی بھی حکم ان تک باآسانی پہنچ جاتا۔ میرے نزدیک میرا سیکنڈ ان کمانڈ نائب صوبیدار بخت خان بیٹھا تھا---- جب اچانک ہی میں نے اپنے شانے پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔

میں نے گردن گھمائی تو بخت خان کی انگلی دائیں طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اندھیرے کی چادر اب آہستہ آہستہ چھٹنے لگی تھی۔

میں نے بخت خان کی انگلی کے تعاقب میں نظریں گاڑیں تو بمشکل سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر نقل و حمل کا احساس ہوا----!

جو لوگ فوج کی تربیت اور اصولوں سے آگاہی رکھتے ہیں' انہیں علم ہو گا کہ کمانڈوز کو پکڑنے یا ان پر قابو پانے کے لئے بھی دشمن اپنے کمانڈوز ہی سے کام لیتا ہے۔ اس نقل و حرکت میں جو تربیت اور خاموشی پائی جا رہی تھی' اس سے میں نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ یہ دشمن کی کسی کمانڈو بٹالین کے جوان ہیں جو بڑی خاموشی سے ہمارے گرد گھیرا ڈال رہے تھے----!

ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ اس طرح صبح ہونے تک ہمیں الجھائے رکھیں گے۔

ان بھارتی کمانڈوز کو شاید اسی نالے پر شک گزرا تھا جس میں ہم چھپے ہوئے تھے کیونکہ ان کے کمانڈر باقی بھارتی ٹڈی دل سے مختلف انداز میں سوچ رہے تھے۔ مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ ان لوگوں نے ہماری وہاں موجودگی کا ہماری نقل و حرکت کی وجہ سے احساس کیا تھا یا پھر یہ ان کا اندازہ تھا۔

کچھ بھی ہو مجھے اپنے جوانوں کو اس جال سے نکالنا تھا----!

رات آہستہ آہستہ وقت کی گرد میں کھو رہی تھی اور اجالے کی آمد کے ساتھ ساتھ

خطرات کا احساس بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا---- ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ جس علاقے میں ہم پھنسے ہوئے تھے' وہاں قدم قدم پر دشمن کی مورچہ بندیوں کا جال پھیلا ہوا تھا اور آج صبح تک اس جال کو توڑ کر نکلنا ممکن نہیں تھا۔

ہمیں اگلا تمام دن بھی یہیں گزارنا تھا اور اگلی رات کو سرحد عبور کرنا تھی' لیکن یہ دن گزارنے کے لئے کوئی محفوظ ٹھکانہ کھوجنا ضروری تھا---- یہاں ہم بالکل غیر محفوظ تھے---- کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔



میں نے اپنے نائب صوبیدار بخت خان کو ہدایت کی کہ جوانوں کو دو گروپوں میں بانٹ کر یہاں سے نکلو۔ پہلے گروپ کی قیادت وہ خود کرے گا اور دوسرے کی میں۔

دوسرے گروپ نے اصل میں پہلے گروپ پر ممکنہ حملے کی صورت میں پہلے گروپ کو کور دینا تھا اور دشمن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنی تھی تاکہ وہ لوگ آسانی سے نکل جائیں۔

چونکہ اہم ذمہ داری دوسرے گروپ کی تھی اس لئے اس کی قیادت میں نے خود سنبھالی تھی۔ ہماری یہ روایت ہے کہ سب سے پہلے پاک فوج کا افسر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اس کے بعد اس کے جوانوں کی باری آتی ہے۔

نقشے کی مدد سے ہم نے یہاں قریب ہی ایک قدرے محفوظ ٹھکانہ ڈھونڈ لیا تھا جہاں ہمیں امید تھی کہ کم از کم اگلا دن گزار سکتے ہیں۔ کمپاس سے اپنی سمت کا تعین کرنے کے بعد ہم نے اندازے سے اس محفوظ ٹھکانے کی طرف روانگی اختیار کی تھی۔



جوان فوراً فارمیشن میں آ گئے---!

سانپ کی طرح رینگتے ہوئے وہ باری باری نالے کے کنارے لگی گھاس میں غائب ہو رہے تھے۔ ابھی بمشکل پہلے جوان نے گھاس سے سر نکالا ہی تھا کہ اچانک فضا "ریٹ ٹٹ" اور "ٹھائیں ٹھائیں" کی آوازوں سے دہلنے لگی۔ سامنے موجود بھارتی کمانڈوز نے اپنے تجربے اور تربیت کی بنیاد پر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم لوگ یہاں سے نکلنے کی فکر میں ہیں---!

جنگی اصولوں کے مطابق دوسرے ہی لمحے میرے جوان زمین سے چپک گئے۔ پھر اسی انداز سے انہوں نے واپس رینگنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ دو ٹکڑیوں میں



ہٹ کر آپس میں فاصلہ بڑھانے لگے۔

میں نے دو جوانوں کو نالے کے ایک کنارے پر قدرے آگے روانہ کر دیا۔ اس طرح دو اور جوانوں کو مخالف سمت میں بھیج دیا۔ چاروں نے میرا اشارہ موصول کرتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔

ہم نے دھوکے کی چال چلی تھی اور دشمن اس کا شکار ہو گیا---!

اس کی توجہ ہمارے ان دونوں مورچوں کی طرف بٹ گئی اور میرے سامنے کا میدان اس کے شر سے محفوظ ہو گیا۔ میں نے نائب صوبے دار بخت خان کی قیادت میں جوانوں کو اس سمت سے آگے بڑھا دیا۔

ایک ایک کر کے جوان میرے قریب سے گزرتے' میں ان کے کندھے پر زوردار تھپکی دے کر انہیں آگے بڑھا دیتا---- ایک ایک کر کے میرے جوان اندھیرے کی چادر میں غائب ہونے لگے۔ اب وہاں ہم پانچ کمانڈوز رہ گئے تھے۔ دو دو کی ٹولیوں میں فائرنگ کرتے میرے جوان اور میں----!

اپنی فوج کی تابندہ روایات کے مطابق مجھے آخری جوان کو یہاں سے نکالنے کے بعد خود باہر نکلنا تھا۔ اشارے پر اب دونوں میں سے ایک ایک جوان اپنے مورچے سے ہٹ گیا۔ میں نے انہیں بھی پیٹھ پر تھپکی دے کر آگے بڑھا دیا۔

دشمن کی گولیاں ہمارے اردگرد محض چند فٹ اور کبھی کبھی چند انچ کے فاصلے پر انگاروں کی طرح تڑپ رہی تھیں---- لیکن یہاں چونکہ ہم خاصے نیچے تھے اور یوں بھی اس خشک نالے نے فی الوقت بنکر کی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔

ابھی ان دونوں جوانوں کو نکلے بمشکل ایک ڈیڑھ منٹ ہی گزرا تھا جب مجھے اپنی دائیں سمت ایک ہلکی سی کراہ سنائی دی---- یوں لگا جیسے کسی نے زبردستی چیخ کا گلا گھونٹ دیا ہو---- میں بجلی کی سی پھرتی سے اپنے اس جوان تک پہنچا جس کی پوزیشن دائیں کنارے پر تھی۔

اس کی گن خاموش تھی---- اور وہ خود اس پر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ میں نے اسے کنارے سے نیچے گھسیٹ کر سیدھا کیا۔ اس کے سینے سے خون فوارے کی طرح ابل رہا تھا' لیکن گن پر اس کی گرفت ابھی تک نہیں ٹوٹی تھی۔

میں نے اس کی قمیص پھاڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کا بایاں ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا' شاید وہ مجھے منع کر رہا تھا۔

"نو سر---! دیر ہو گئی۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس طرح سرگوشی کی جیسے کھیل کے میدان میں گر پڑا ہو--- "معاف، کر دینا سر! میں اپنی ڈیوٹی پوری نہ کر سکا۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے بڑے زور سے میرا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ جیسے میرے خون کا خمیر بدلنے لگا ہو--- میرا حلق نجانے کیوں خشک ہونے لگا تھا۔

"جوان.........!" میرے منہ سے بمشکل یہ لفظ ادا ہو سکا۔ میری جذباتی حالت غیر ہو رہی تھی اور میرا جیالا کمانڈو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا ہوا زندگی کا سفر تمام کر رہا تھا۔

میں اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن اچانک ہی ایک پھانس سی میرے گلے میں اٹک گئی---- مجھے چند لفظ ادا کرنے کے لئے بھی بہت زور لگانا پڑا۔ "جوان! تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تم نے اپنی ڈیوٹی پوری کر لی۔ ہم پھر آئیں گے---- پھر آئیں گے----!"

اس نے میری بات کے جواب میں اپنے ہونٹ اتنے زور سے کاٹے کہ ان پر خون کی تہہ جمنے لگی۔ شاید اپنے اندر اٹھنے والی ٹیسوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ آخر کمانڈو تھا اور جانتا تھا کہ اسے اونچی آواز نہیں نکالنی---- مبادا دشمن کو اس کی موجودگی کا احساس ہو جائے۔

"سر!" اسے بولنے میں بہت دقت محسوس ہو رہی تھی---- "میرا ایک ہی بیٹا ہے سر! اسے یہ ضرور کہنا سر کہ وہ اپنے باپ کا ادھورا مشن پورا کرے۔ کمانڈو بن کر----! اور......... اور......... میری گن دشمن کے ہاتھ نہ لگے......... اللہ......... پاکستان.........!"

میں ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ کچھ قرآنی آیات کا ورد کر رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

"حسن دین---- حسن دین!" میں اس کے مردہ جسم کو پاگلوں کی طرح جھنجھوڑنے لگا---- لیکن وہاں تو ایک ابدی مسکراہٹ کے سوا اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔



میں نے ایک لمحے کے لئے اس کی شکل سے آنکھیں ہٹا لیں' دوسرے ہی لمحے حقائق کی دنیا میں لوٹ آیا---- دوبارہ اس پر نظریں گاڑیں۔ ایک ملکوتی حسن نے اس کے چہرے



کا احاطہ کر رکھا تھا---- میں نے بے اختیار جھک کر پہلے شہید کے ماتھے کا بوسہ لے لیا۔

بڑی پھرتی سے میں نے اس کے بازو سے بندھا وہ تعویز الگ کر کے جیب میں ڈالا جو اس کی واحد شناخت تھی۔ اس کے بازو سے لگی نائیک کی پٹی اکھاڑی' اس کی گن کو پشت سے باندھا۔ اسے بڑے احترام سے سیدھا کر کے لٹا دیا----!

دوسرا جوان اپنے کام میں جتا تھا----!

میں نے کھڑے ہو کر اس طرف کا جائزہ لیا۔ اس کنارے سے جہاں وہ مورچہ باندھے فائرنگ کر رہا تھا' پندرہ بیس گز دور مجھے پانچ بھارتی سپاہیوں کی لاشیں بخوبی دکھائی دے رہی تھیں---- شاید یہ لوگ اچانک اس کے سر پر پہنچ کر اسے قابو کرنا چاہتے تھے' لیکن اس کی نظر میں آ گئے۔

شہید مرتے مرتے اپنی ڈیوٹی پوری کر گیا تھا---- اس کے ادائیگی فرض کے اس شاندار احساس پر فرشتوں نے بھی آسمان سے اس پر "مرحبا" کہا ہو گا۔



میری گرفت اپنی گن پر بڑی مضبوط تھی اور ابھی تک میں صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا' جب ان لاشوں کے عقب میں مجھے کچھ سائے رینگتے دکھائی دیئے۔ میں نے گن کو فوراً سیدھا کیا' لیکن پھر میرا گن والا ہاتھ جھک گیا۔

میری گن دوسرے ہی لمحے بائیں ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی اور دایاں ہاتھ اپنے پوچ میں رینگ گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں ہینڈ گرنیڈ ہاتھ میں تھامے سایوں کی نقل و حرکت پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

گرنیڈ کی پن نکل چکی تھی اور میرا سارا قہر میرے دائیں بازو میں منتقل ہونے لگا تھا۔ ساتھی کی شہادت نے میرے خون میں انگارے دوڑا دیئے تھے---- جیسے ہی وہ لوگ میری رینج میں آئے' میرا گرنیڈ والا ہاتھ پیچھے کی سمت سیدھا ہوا اور پھر سر کے اوپر سے ہاتھ گزارتے ہوئے میں نے گرنیڈ ان پر اچھال دیا----! ایک کے بعد دوسرا---- اور پھر تیسرا۔

میری خواہش تھی کہ اپنے ایک ساتھی کی شہادت کے بدلے دشمن کے کم از کم ایک بریگیڈ کا صفایا کر ڈالوں۔

اس کے ساتھ ہی میں واپس پلٹا اور دوسرے کمانڈو کو مخصوص اشارے سے واپسی کا

اشارہ کیا۔ دوسرا جوان میرے پاس پہنچا تو ایک ثانیے کے لئے اپنے شہید ساتھی کی لاش دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر کسی میکانکی عمل کے تحت اس کے گھٹنے جھکتے چلے گئے۔ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے اپنے شہید کمانڈو کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا----!

مجھ میں تو سچی بات ہے اس وقت اپنے جوان سے آنکھیں ملانے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ شہید کے جسد خاکی کو یہاں سے لے جانا ممکن ہے یا نہیں۔ ہم کم از کم یہاں اس کی لاش چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے----!

میں اپنے کمانڈو کی طرف پلٹا تو وہ بھی کسی حکم پر عمل کرنے کا منتظر کھڑا تھا۔ میں نے اپنی گن اسے تھمائی اور جھک کر شہید کے جسد خاکی کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا----! میرا جوان بھونچکا رہ گیا۔

اسے یہ امید تھی کہ میں اسے لاش اٹھانے کا حکم دوں گا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میں اس سعادت سے کبھی محروم رہنا پسند نہ کرتا۔

شہید کا جسد خاکی اپنے کندھوں پر اٹھائے میں نے نالہ عبور کیا پھر زمین سے چپک گیا۔ ہمارے چاروں اطراف گولیوں کا مینہ برس رہا تھا---- لیکن اپنے چند ساتھیوں کی بلی دینے کے بعد دشمن اب اجالا پھیلنے سے پہلے ہمارے نزدیک آنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

اسے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ ہم جیتے جی ان کے قابو میں آنے والے نہیں----!



میرا جوان میرے ساتھ لگا ہوا رینگ رہا تھا۔ وہ کبھی میرے دائیں پہلو پر آ جاتا اور کبھی بائیں پہلو پر---- شاید اس کی اب بھی شدت سے یہ خواہش تھی کہ میں اپنا "بوجھ" اسے منتقل کروں گا۔ یوں بھی جنگی اصولوں کے مطابق ہمیں ایسا کرنا چاہیے تھا، لیکن نجانے کیوں میں چاہتا تھا اس سعادت میں کم از کم میرا حصہ دار کوئی اور نہ بنے۔

ہمارے ساتھی ایک مخصوص فاصلے پر پوزیشنیں لیے ہمارے منتظر تھے۔

قریباً" ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ہم اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اچانک ہی ایک رائفل کی ٹھنڈی نال میری کنپٹی سے آن لگی----! میرے منہ سے ایک مخصوص "کوڈ" نکلنے پر نال الگ ہو گئی اور کسی کے ایڑیاں بجانے کی ہلکی سی آواز مجھے سنائی دی۔



میرے جوان ایک محفوظ کنج میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ شہید کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں نے ان کی آنکھوں میں فخر پھوٹتے دیکھ لیا تھا۔ ہم نے وہیں بیٹھ کر صورت حال کا جائزہ لیا---- بالآخر بادل نخواستہ شہید کو یہیں دفن کرنے کا پروگرام بنا۔

میرے جوانوں نے اپنے جیالے ساتھی کے لئے قبر کھودی۔ باری باری اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر ہم نے اس کے جسد خاکی کو قبر میں اتار کر اس پر مٹی ڈال دی----!

تاریخ نے آج اٹھارہ سال بعد پھر خود کو دہرایا تھا----!

اٹھارہ سال پہلے ۱۹۴۷ء میں اسی راستے کو اپنے خون سے سیراب کرتے مہاجرین کے قافلے پاکستان میں داخل ہوئے تھے---- آج اٹھارہ سال بعد ۱۹۶۵ء میں ہمارے جیالے شہید نے دوبارہ اسی راہگذر پر اپنا خون بکھیر کر تاریخ کو اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا تھا کہ ہم اپنی آزادی کے لئے مرنے کی رسم ادا کرنے کا طریقہ ابھی بھولے نہیں----!

# راہِ وَفا کے مُسافِر

ساتھی کی شہادت نے میرے جوانوں کے مورال پر اثر انداز ہونے کے بجائے ان کے غیظ و غضب میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ ان کی حالت اب ایسے چیتے کی سی ہو رہی تھی جسے ہانکا کرنے والے گھیر رہے ہوں اور جو خود تاک لگا کر ان میں سے کسی ایک کا خون پینے کے لئے بیقرار ہو۔

فائرنگ میں اب خاصی کمی آ چکی تھی، لیکن دشمن کے پاس ہماری اس علاقے میں موجودگی کا ثبوت موجود تھا اور اب وہ کسی قیمت پر ہمیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہم نے کم از کم اس کے پندرہ بیس سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیئے تھے جو اس کی آتش انتقام کو مزید بڑھا رہے تھے۔

جتنی شدت سے دشمن صبح کا اجالا پھیلنے کا منتظر تھا، اس سے زیادہ شدت سے ہم اپنے محفوظ ٹھکانے کی طرف پہنچنے کے لئے بے چین تھے۔

ہم لوگ جس علاقے میں سفر کر رہے تھے، یہاں سے مقبوضہ جموں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہم ابھی تک پٹھانکوٹ کے سرحدی دیہاتوں میں کہیں موجود تھے---- امید کی واحد کرن یہاں کے سرحدی دیہاتوں میں بسنے والے وہ گوجر تھے جو نام کے ہی سہی، لیکن مسلمان تھے۔ موجود حالات میں گو کہ ان کی طرف سے کسی مدد کی توقع رکھنا دیوانے کے خواب والی بات تھی، لیکن امید کی وہ ننھی سی کرن جو ہمیشہ انسانی لاشعور کے گھور اندھیاروں میں بھی روشن رہتی ہے، مجھے امید دلا رہی تھی کہ یہاں ممکن ہے ہمیں دن بسر کرنے کا موقعہ مل جائے۔

امید و یاس کی انہی ملی جلی کیفیات کے تحت ہم لوگ گھنی اور اونچی نیچی گھاس کے بیچوں بیچ چل رہے تھے۔ دور پاکستانی سرحد کی سمت سے دھماکوں کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ شاید بھارت کا ہیوی توپ خانہ سرگرم عمل تھا اور پاکستان کی طرف سے بھی اسے منہ توڑ جواب مل رہا تھا۔



اب ہم جس علاقے میں سفر کر رہے تھے اسے کسی حد تک میدانی علاقہ ضرور کہا جا سکتا
تھا۔ کہیں کہیں اونچے اونچے پہاڑی ٹیلوں کے بیچ جہاں میدان میسر آیا' مختلف فصلیں کاشت
کی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

دوران جنگ میں دشمن عموماً" ایسی فصلوں کے بیچوں بیچ یا کچھ ہٹ کر بارودی سرنگیں
بچھا دیا کرتا ہے۔ اس خدشے کے پیش نظر میں نے اپنے جوانوں کو سختی سے ہدایت کر دی
تھی کہ وہ رات کی تاریکی میں ایسے کسی بھی کاشت شدہ خطہ زمین کے نزدیک نہ پھٹکیں۔

رات کا آخری پہر بیت رہا تھا اور ہم ابھی تک محفوظ ٹھکانے کے لئے ٹامک ٹوئیاں
مارتے پھر رہے تھے۔ ہمارے چاروں اطراف فائرنگ کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ یہ
علاقہ جہاں سے ہم اب گزر رہے تھے' پہلے سے زیادہ خطرناک تھا اور یہاں چھپنے کے لئے
بھی کوئی خاص آڑ میسر نہیں تھی۔

میں سب سے آگے آگے چل رہا تھا اور باقی جوان جنگی ترتیب کے مطابق بکھر کر میرے
پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میدانی علاقے کا آغاز ہوتے ہی ہم پہلے سے بھی زیادہ چوکنے ہو
گئے۔ اس سے پہلے ہم جنگلی گھاس میں گو کہ کھڑے ہو کر چلتے آئے تھے' لیکن اب قدرے
جھک کر یہ علاقہ عبور کر رہے تھے۔



ابھی بمشکل پچاس ساٹھ قدم ہی چلے ہوں گے کہ فضا اچانک "ہالٹ ہالٹ" کی آوازوں
سے گونجنے لگی---- دشمن اتنا بھی بے خبر نہیں تھا۔ اسے توقع تھی کہ ہم اس علاقے سے
ضرور گزریں گے۔ پھر تھوڑی دیر پہلے ہونے والے معرکے سے اس نے ہماری پسپائی کی
سمت کا اندازہ بھی لگا لیا تھا۔

دشمن نے ممکن ہے اپنی دانست میں بڑی "حیران کن کارروائی" کی ہو اور اپنی جگہ اس
کا یہ اندازہ بھی ٹھیک تھا کہ یہ اچانک "سرپرائز" ہمیں بوکھلا کر رکھ دے گا اور ہم بے بس
چوہوں کی طرح دشمن کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائیں گے۔

اس کے یہ سب اندازے اپنی جگہ بجا سہی---- لیکن تب تک اسے احساس نہیں تھا
کہ اس کا مقابلہ کسی عام ملک کی فوج یا اپنے جیسی کسی فوج سے نہیں تھا----!
عام ملک کے فوجی افسران ایسے خطرناک منصوبوں کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتے ہیں



جس پر ہم نے عمل کر دکھایا تھا---- وہاں ہر شخص زندگی کی جنگ لڑتا ہے' لیکن یہاں ہم
موت کا سفر طے کرنے آئے تھے۔ اگر زندہ رہنے کی کوئی خواہش کسی کے دل میں تھی تو
اپنے شہید کمانڈو ساتھی کی شہادت کے بعد وہ ختم ہو چکی تھی۔

اس لمحے جب دشمن نے ہمیں اچانک "سرپرائز" دیا تو مجھے اپنا ٹریننگ سینٹر یاد آ گیا
جہاں ہمیں ہفتے میں کئی کئی مرتبہ اس طرح اچانک گھیرے میں آ کر نکلنے کی تربیت دی جاتی
تھی۔ ہم نے یہ عمل اس سے پہلے اتنی بے شمار دفعہ دہرایا تھا کہ اب مجھے یہ سب کچھ
معمول کی ہی کسی کارروائی کا حصہ دکھائی دینے لگا تھا۔

"فرنٹ----!" میرے منہ سے نکلا۔

اس کے ساتھ ہی میرے ساتھی اپنی اپنی جگہ اس طرح ساکت ہو گئے کہ بہت نزدیک
آنے پر بھی وہ کسی کو دکھائی نہ دے سکیں۔

"پاس ورڈ----!" کسی نے چند گز دور سے پکارا۔

"سپیشل ڈیوٹی---- ہم لوگ آپریشن کر کے واپس آ رہے ہیں---- میرا نام کیپٹن
ورما ہے---- ففتھ کمانڈو بٹالین!" میں نے بڑے رعب دار لہجے میں جواب دیا۔

"آئیڈینٹی چیک----!" ایک اور آواز سنائی دی۔

"ہینڈز اپ----!" کسی نے للکارا۔

میرے ہاتھ کسی میکانکی عمل کے تابع اوپر اٹھے اور اپنی گن میں نے اس پوزیشن میں
نیچے رکھی کہ محض ایک لمحے کے نوٹس پر بھی اسے اٹھا سکتا تھا۔

"وہیں ٹھہریے کیپٹن ورما----!" کسی نے کہا اور مجھے اندھیرے میں چار سائے اپنی
طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔



ان میں سے تین تو مجھ سے قریباً" دس فٹ دور ہی رک گئے۔ تینوں نے اپنی رائفلیں
میری طرف تان رکھی تھیں۔ چوتھا شاید ان کا کوئی سینئر آفیسر تھا جو نہتا ہی میری طرف بڑھ
رہا تھا۔ میرے نزدیک آ کر وہ رک گیا۔

اس کے کندھے پر لگا "اشوکا" اس کے میجر ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ میرا ذہن مکمل
بیدار تھا اور کسی بھی لمحے میں کچھ کر گزرنے کے لئے بالکل تیار کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ
کچھ کہنے کے لئے منہ کھولے' میں نے ایک نفسیاتی حربہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

"سر! کیا میں اس طرح ہاتھ کھڑے رکھ کر اپنی پہچان کرواؤں گا----؟" میں نے انگریزی میں اس سے کہا۔

اس نے ایک نظر میری سبز رنگ کی بھارتی فوج والی وردی پر ڈالی اور اس کے منہ سے نکلا۔ "او۔کے!"

میں نے ہاتھ گرانے اور زمین بوس ہونے کا عمل ایک ہی لمحے میں دہرایا۔ میرا زمین پر گرنا میرے ساتھیوں کے لئے مخصوص اشارہ تھا۔ زمین پر گرتے ہی میری ٹانگ بھارتی میجر کی دونوں ٹانگوں کے عین درمیان میں لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا----!

میرے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے نزدیک پہنچنے تک میرے ساتھیوں کی گنوں سے ہونے والی فائرنگ نے اس کے تینوں سورے اوندھے کر دیئے تھے۔ اس لمحے میری آنکھوں کے سامنے نائیک حسن دین آن کھڑا ہوا۔ میرے اندر کا سارا قہر میرے ہاتھوں میں سمٹ آیا تھا۔ میری انگلیوں کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد تنگ ہونے لگا---- اور چند سیکنڈ بعد ہی معمولی سی مدافعت کے بعد وہ دم توڑ گیا۔

"کم آن دس وے!" (اس طرف آؤ) میں نے اپنے ساتھیوں کو اسی سمت اشارہ کیا جدھر سے یہ چاروں نمودار ہوئے تھے اور اپنی گن سنبھال کر ادھر لپکا۔

ہم لوگوں نے بھارتی فوج کی وردیاں پہن رکھی تھیں اور پہچانے بغیر اس طرح تو کوئی ہم پر فائرنگ کرنے سے رہا۔ میں نے "دھوکے کی چال" چلی تھی۔ دشمن یہی سمجھ سکتا تھا کہ ہم اس کے مخالف سمت بھاگیں گے، لیکن ہم اس کی صفوں میں گھس گئے تھے---- مجھے اندازہ تھا کہ "کمانڈوز" کی دہشت عام فوج کے اعصاب پر کسی بری طرح سوار ہوا کرتی ہے۔ دشمن بری طرح بوکھلایا ہوا تھا اور ہم نے اسی بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھانا تھا۔



وہ لوگ جو ہمارا نشانہ بنے کسی "پٹرول" پر نکلے تھے۔ ایسی پٹرول پارٹیاں رات کے اندھیرے میں ضرور نکلا کرتی ہیں۔ دشمن کی صفوں میں تباہی پھیلانے کے لئے بھی اور دشمن کی طرف سے رات کے اندھیرے میں ہونے والی ممکنہ مداخلت کو روکنے کے لئے بھی----!

یہ بے چارے بھی غالباً" دوسری قسم کی مہم پر نکلے تھے اور ہمارا نشانہ بن گئے۔ فائرنگ کی آواز نے نزدیک ہی موجود ان کے ساتھیوں کو ہوشیار کر دیا تھا' کیونکہ اچانک ہی بے



تحاشہ فائرنگ شروع ہو گئی۔

یہ دشمن کی بوکھلاہٹ کا بہترین ثبوت تھا کہ وہ لوگ ہمارے پیرا لینڈنگ کے بعد سے مسلسل فائرنگ کر رہے تھے---- سمت کا تعین کیے بغیر---- شاید ان لوگوں کے پاس پھونکنے کے لئے بے تحاشہ گولہ بارود موجود تھا۔

ہم لوگ اب تین ٹولیوں میں بٹ کر سفر کر رہے تھے۔ سب سے آگے میں اور دو جوان تھے' اس کے بعد دوسری ٹولی اور اس کے بعد تیسری----!

ایک لمحے تو یہ دیکھ کر میں واقعی تذبذب کا شکار ہوا کہ ہم دشمن کی مورچہ بندیوں کے عین درمیان پہنچ چکے تھے اور اگر دشمن نے ذرا بھی عقل مندی کا مظاہرہ کیا تو ہمارے پکڑے جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ جاتی۔



میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ دشمن کی بوکھلاہٹ میں اضافہ کرتا چلا جاؤں۔ ہمارے دائیں بائیں ان کے افسران کی اونچی اونچی گالیوں کی آوازیں بخوبی سنائی دے رہی تھیں---- وہ اپنے جوانوں کو گالیاں بکتے ہوئے انہیں مختلف سمتوں میں بھگا رہے تھے----!

یہ لوگ ہم سے بمشکل دو دو گز کی دوری سے بھاگے چلے جا رہے تھے' لیکن کسی نے ہم سے پوچھنے کی زحمت نہ کی۔ وہاں کسی کے پاس شاید اتنی مہلت تھی ہی نہیں۔ کمانڈوز کی موجودگی کا علم اور پھر ثبوت مل جانے کے بعد عام فوجیوں کے لئے خود پر قابو رکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔

ان کے افسران نے گالیوں کے دوران اس بات کا اعلان بھی کر دیا تھا کہ پاکستانی کمانڈوز نے ایک پٹرول پارٹی کا مکمل صفایا کر دیا ہے---- اس انکشاف نے تو بے چاروں کا رہا سہا مورال بھی تباہ کر دیا تھا اور اب وہ ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے پاکستانی کمانڈوز کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے جو ان کے درمیان گھوم رہے تھے۔

میری مراد جلد ہی بر آئی جب مجھے ایک جگہ بڑی خوبصورتی سے کیموفلاج کیے گئے چار ہیوی ٹرک کھڑے نظر آئے---- میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ ان میں گولہ بارود ہو گا کیونکہ انہیں بڑی بڑی جنگلی گھاس کے درمیان کھڑا کیا گیا تھا اور بے شمار سبز رنگ کے جال بھی ان پر ڈالے گئے تھے---- ٹرکوں کی چھتوں پر مجھے درختوں کی کٹی ہوئی شاخیں بھی بخوبی

دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے دونوں ٹولیوں کو آگے نکل جانے اور یہاں سے قریباً" دو سو گز دور رک کر اگلے احکامات کا انتظار کرنے کا حکم دیا اور اپنے دونوں جوانوں کے ساتھ وہیں رک گیا۔ گولہ بارود کے ان ٹرکوں کی حفاظت کے لئے جو دو گارڈ لگائے گئے تھے، وہ بھی مجھے جلد ہی نظر آ گئے۔ دونوں ٹرکوں کی پشت سے گھوم کر اب اس طرف آ رہے تھے۔

وہ تباہ کن ڈیٹونیٹر جو ہم نے دشمن کے ہوائی اڈوں کی تنصیبات کو تباہ کرنے کے لئے اٹھا رکھے تھے، اب استعمال کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو ہدایات دیں۔ وہ میری پشت سے واپس گھوم گئے۔ خود میں اب بڑی بے نیازی سے چلتا ہوا ان سنتریوں کی طرف جا رہا تھا--- جو سرگوشیوں میں شاید یہاں موجود کمانڈوز کا تذکرہ کر رہے تھے۔

میں اچانک ہی ان کے سامنے سے نمودار ہوا--- میں نے بھارتی کیپٹن کی وردی پہن رکھی تھی اور پیرا کمانڈوز کا خاص نشان میری وردی پر نمایاں تھے--- مجھے اچانک وہاں دیکھ کر وہ گڑبڑا گئے۔

"اے گدھو---! کیا کر رہے ہو یہاں---؟ یہ ڈیوٹی ہے تمہاری!؟"

دونوں نے سہمے ہوئے انداز میں ایڑیاں بجا کر مجھے تعظیم دی۔ دہشت کے مارے ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ--- اور اپنی کمپنی میں "رپورٹ" کرو--- اس "ڈمپ" کی حفاظت میرے جوان کریں گے--- ناؤ گیٹ آؤٹ--- مارچ--- ڈبل کر کے جاؤ۔" میں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے ان کی کمپنی کی طرف روانہ کر دیا۔



بے چارے عام فوجی تھے جنہیں اپنی ملازمت کے سوا اور کسی بات کا خوف دامن گیر نہیں ہوتا۔ انہوں نے بلاچون و چرا میرے احکام کی تعمیل کی اور مجھے سیلوٹ مار کر ڈبل مارچ کرتے ہوئے ایک طرف غائب ہو گئے۔

بمشکل دو منٹ ہی میں میرے ساتھیوں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ انہوں نے گولہ بارود کے ٹرکوں میں ڈائنامیٹ لگا کر ایک مخصوص اور محفوظ فاصلے پر اس کا لیور نصب کر دیا تھا--- اس لیور پر پڑنے والا معمولی سا دباؤ بھی ایک زبردست دھماکے سے اس کھیل کو ختم کر سکتا



تھا۔

ہم لوگ ایک محفوظ آڑ میں اس راستے پر نظریں لگائے بیٹھے تھے جدھر وہ دونوں گدھے غائب ہوئے تھے--- پھر میری توقعات کے عین مطابق اس سمت سے فوجیوں کی ایک ٹولی نمودار ہوئی۔

ظاہر ہے انہوں نے اپنے کمپنی کمانڈر کو کسی "کمانڈو کیپٹن" کی وہاں آمد سے مطلع کیا ہوگا اور اس نے بلا سوچے سمجھے اس طرف "پاکستانی کمانڈوز" کا صفایا کرنے کے لئے ان لوگوں کو بھیج دیا تھا۔

ہم اپنی گنوں کے ٹریگروں پر انگلیاں رکھے بڑی بے چینی سے "مہمانوں" کی آمد کے منتظر تھے۔ ایک ساتھی نے اپنا ہاتھ اس لیور پر رکھا ہوا تھا جسے دبانے سے ڈائنامیٹ پھٹ جاتا۔

آنے والے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے اس طرف آ رہے تھے۔ تھوڑا نزدیک آنے پر وہ نصف دائرے کی ترتیب اختیار کرنے لگے۔ اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

ٹرکوں سے قریباً" پچاس گز دور رہ کر وہ زمین پر لیٹ گئے۔ شاید ہماری طرف سے کسی ردعمل کے منتظر تھے، لیکن ہم یہاں اسلحہ پھونکنے نہیں آئے تھے۔ قریباً" پانچ منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد اچانک ان میں سے ایک نے "چارج" پکارا۔

"جے ہند--- جے ہند" کے نعرے لگاتے وہ بڑی تیزی سے نصف دائرے کی شکل میں ٹرک کی طرف بڑھے۔

عین ان لمحات میں میری سب مشین گن اور میرے ساتھی کی سٹین گن نے ان پر قیامت کا دہانہ کھول دیا۔ ان میں سے ابھی تین چار ہی گرے تھے جب اچانک فضا ایک زوردار دھماکے سے دہل گئی--- میرے ساتھی نے اپنا کام کر دیا تھا۔

آنے والوں میں سے کسی ایک کے بھی زندہ بچ نکلنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ ان کے جسم بھی ٹرکوں کے ساتھ ہی پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں بکھر گئے۔ ہم تینوں بڑے اطمینان سے اٹھے اور اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

مطلوبہ مقام پر پہنچنے تک ہمیں درجنوں بھارتی بوکھلائے ہوئے فوجیوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ اتنے نروس ہو چکے تھے کہ کسی نے ہمارے متعلق تردد نہ کیا۔ یوں بھی ایسی صورت حال میں کوئی کسی کو پہچاننے کے بجائے اپنی جان بچانے پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔

ایک مخصوص مقام پر میرے باقی ساتھی ہمارے منتظر تھے----!

صبح کے آثار ہویدا تھے---- کسی بھی لمحے کچھ بھی ممکن تھا---- جو بھگدڑ دشمن کی صفوں میں مچ چکی تھی اس کے بعد اب کم از کم ہم صبح تک کے لئے محفوظ تھے۔ اس مرتبہ ہم نے ذرا خطرہ مول لیا اور اپنی مطلوبہ جگہ تک پہنچنے کے لئے مختصر راستہ اختیار کیا تھا۔

صبح کاذب کی روشنی اب مشرق کی سمت سے پھوٹنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ میں شدت پیدا ہونے لگی۔

رات کو "اندھے" ہو جانے والے ٹینک اور میڈیم بیڑیاں بھی اب میدان کارزار میں کود پڑی تھیں اور دونوں اطراف سے دھاڑنے لگی تھیں---- ہم اپنے پیچھے دشمن کو جس بربادی سے دوچار کر آئے تھے اس کے بعد کم از کم ہمارے دل قدرے مطمئن ہو گئے تھے۔

اپنے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی میں نے اس دوران کئی کوششیں کیں، لیکن کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ شاید وہ لوگ بری طرح دشمن کے گھیرے میں آ چکے تھے یا پھر ان کا سیٹ بیکار ہو چکا تھا۔ ایک بات کا تو مجھے یقین تھا کہ اگر ایک کمانڈو بھی شہید ہوا ہے تو اس نے دشمن کے یقیناً دس آدمی مارے تھے۔

روشنی کی ایک سرخ لکیر جو یقیناً میرے وطن کے شہیدوں کے لہو سے روشن تھی، آہستہ آہستہ اندھیرے کو نگلنے لگی تھی۔ ہمیں کچھ فاصلے پر ایک گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ فی الوقت ہم نے یہیں قیام کرنا تھا۔

گاؤں کی آبادی اور کاشت شدہ علاقے کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ ہمیں یہیں ایک خاص جگہ کی تلاش تھی جو جلد ہی مل گئی---- یہ گاؤں کے باہر گزرنے والے پہاڑی نالے کے ایک کنارے پر گھنی اور لمبی لمبی جنگلی گھاس کے درمیان وہ ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی جو آج سے صدیوں پہلے شاید کسی بادشاہ نے مسافروں کے دم لینے کو تعمیر کی تھی۔ امتداد زمانہ کے ہاتھوں اب اس کی صرف "باقیات" ہی نظر آ رہی تھیں۔ عمارت کا وجود تو کبھی کا نیست و نابود ہو چکا تھا۔



ہم لوگ جلد ہی یہاں پہنچ گئے----!!

میرے ساتھیوں نے چند منٹ ہی میں اردگرد کے حالات کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس بات کے آثار تو ہمیں مل گئے تھے کہ یہاں نزدیک بھارتی فوج ضرور موجود ہے، لیکن اس طرف



شاید کسی کا دھیان نہیں گیا تھا---- یوں بھی ہندو ضعیف العقیدہ قوم ہے اور ایسی پرانی عمارت اور کھنڈرات سے متعلق ان کے لاشعور میں چھپا خوف خودبخود سے ایسی کہانیاں ترتیب دے لیتا ہے کہ وہ اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتے۔

ہم نے اس خستہ حال سرائے کی چھت پر اپنی "آبزرویشن پوسٹ" قائم کر لی تھی۔ دو ساتھیوں نے پہاڑی نالے کی طرف آنے والے راستے کے سامنے مورچہ لگالیا تھا اور باقی عمارت ہی میں پھیل گئے---- سب سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنے جوانوں کے لئے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا بندوبست کروں۔

ہماری پشت پر بندھے تھیلوں میں چند ہنگامی ادویات اور کچھ بھنے ہوئے چنے موجود تھے۔ چونکہ ہمارا قیام یہاں منصوبے کے مطابق مختصر تھا' اسی لیے سامان رسد و طلب بھی اسی تناسب سے ہم نے رکھا ہوا تھا۔

منصوبے کے مطابق تو ہمیں اس وقت پاکستانی سرحد میں ہونا چاہیے تھا۔ اب یہ الگ بات کہ ہم ابھی تک بھارتی فوج کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے---- جوانوں نے ایک ایک مٹھی چنے پر گزارہ کیا---- ہماری پانی کی بوتلیں بھی خالی ہو رہی تھیں۔

پہاڑی نالے سے ہم نے پانی پیا---- سب نے پہلے شہید کے لئے دعائے مغفرت کی' پھر ہم نے دو دو گھنٹے آرام کے لئے مخصوص کر دیئے۔

میرے جوان بضد تھے کہ سب سے پہلے میں آرام کروں' لیکن میرے لیے ایسا سوچنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے سختی سے اپنے جوانوں کی خواہش کو ٹھکرا دیا۔ میں نے پہلے دو گھنٹے کے لئے او۔پی ڈیوٹی کا فیصلہ کیا تھا۔ یہی سوچ کر اپنی دوربین تھامے میں چھت پر چلا گیا۔

چھت کے ایک محفوظ کونے میں' میں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے سامنے کا منظر بڑا صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔ سورج نے اب جانب مشرق سے اپنا سر نکالنا شروع کر دیا تھا---- دور دور تک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

ماحول پر چھائے سکوت کو کبھی زوردار دھماکے کی آواز توڑ دیتی تھی۔ صبح کے اجالے کے ساتھ ہی دونوں اطراف سے حملوں میں تیزی آگئی تھی اور رات بھر مصروف بھاری توپخانے کی جگہ اب میڈیم بیڑیاں اور ٹینک لے رہے تھے۔



سورج اب مکمل بیدار تھا----!

اچانک ہی میں نے مغربی سمت سے آسمان پر دھاڑ سنی۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان ایئرفورس کے شاہین بھارتی فضاؤں کے کلیجے پر مونگ دلتے نمودار ہوئے۔ مجھے فوراً" احساس ہوا کہ پاک فضائیہ نے اپنی آرمی کے جانبازوں کو بھلایا نہیں---- وہ لوگ جانتے تھے کہ ہم ایک آرمڈ ڈویژن کے جبڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پاک فضائیہ نے صبح ہوتے ہی اس آرمڈ ڈویژن کو نیست و نابود کرنے کی ابتدا کر دی تھی۔ یہ اس سلسلے میں پی اے ایف کی پہلی فارمیشن تھی۔ میری بیقرار نظریں جموں کی سمت کو جانے والی سڑک کے بالکل اوپر درختوں جتنی اونچائی پر دھاڑتے شاہینوں کی بے اختیار بلائیں لینے لگیں۔

وہ ایک کے بعد ایک غوطہ لگا کر نیچے آتے اور اپنی گنوں سے دشمن کنوائے پر جہنم کا دھانہ کھول دیتے۔ ہوا بازوں کے طیارے کمال وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ وہ فضا کو چیرتے ہوئے گولی کی سی رفتار سے نیچے آتے۔ اپنی "گن سائیٹ" کو ٹھکانے پر لا کر راکٹوں کا بٹن دباتے اور اپنے پروں تلے موجود غنیم کے لشکروں کو اس کے بے پناہ اور طاقتور اسلحہ سمیت خس و خاشاک کا ڈھیر بنا کر اسی تیزی سے اوپر اٹھ جاتے۔

اپنے شاہینوں کو اس طرح دشمن کو رگیدتے دیکھ کر میرے بدن میں بجلیاں کوندنے لگی تھیں، لیکن میں کچھ کرنے سے لاچار تھا۔ یہ حملے اسی لئے کیے جا رہے تھے کہ دشمن کو زیادہ دیر تک الجھایا جائے اور کمانڈوز کو نکل جانے کا موقعہ مل جائے۔

پہلی فارمیشن میرے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا کام تمام کر کے واپس روانہ ہو گئی۔ اس کی عین واپسی کے لمحات میں بھارتی طیاروں کا ایک سکواڈرن نمودار ضرور ہوا، لیکن وہ ان جیالوں کی گرد کو بھی نہ پا سکا اور جب تک وہ لوگ آسمان کی بلندیوں سے نیچے اترتے، پاک فضائیہ کے شاہین نیچی پرواز کرتے ہوئے بڑی تیزی سے اپنی سرحدوں کو مراجعت کر گئے۔

ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری فارمیشن نمودار ہوئی---- مجھے یہاں سے دشمن کا لشکر تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ایمونیشن کے دھماکے اور آگ اور دھواں میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

اس دوران دشمن کی اینٹی کرافٹ گنیں بھی بیدار ہو گئی تھیں اور جیسے ہی کوئی فارمیشن پاکستان کی طرف سے حملہ آور ہوتی، یہ لوگ آسمان پر گولوں اور گولیوں کا جال بن دیتے تھے، لیکن آفرین ہے ان شاہبازوں پر کہ وہ اس جال کے عین درمیان میں سے راستہ بنا کر نیچے آتے اور دشمن کو آٹے دال کا بھاؤ بتا کر واپس لوٹ جاتے۔

یہ سلسلہ دوپہر گئے تک جاری رہا----!



دوپہر میری آنکھ لگانے کی باری تھی---- نیند وہاں کس کافر کو آتی بس یونہی ذرا سستانے کے لئے ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ابھی مجھے لیٹے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا جب پہرے پر موجود میرے ساتھی نے مجھے دشمن کی موجودگی کی اطلاع دی۔

میں اس کے ساتھ ہی بھاگم بھاگ اوپری منزل پر پہنچا جہاں ہم نے اپنی "چیک پوسٹ" قائم کر رکھی تھی۔ دوربین میں نے آنکھوں سے لگائی---- سامنے گاؤں کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا---- میں نے دیکھا بھارتی فوج کی پانچ چھ جیپوں نے گاؤں کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔

اپنے ساتھی کو میں نے مخصوص اشارہ کیا اور دوسرے ہی منٹ میں میرے تمام کمانڈوز تک یہ اطلاع پہنچ چکی تھی---- وہ لوگ اپنے اپنے مورچے پر ڈٹ کر اگلے اشارے کے منتظر تھے۔



یہ شاید بھارت کی ایس-ایس-جی (سپیشل سروسز گروپ) کمانڈو تھے۔ وہ لوگ اپنی تربیت کے مطابق بجلی کی سی پھرتی سے چھلانگیں لگا کر جیپ سے اترتے اور گاؤں کے اندر بھاگتے چلے جاتے۔

شاید اس طرح یہ لوگ گاؤں والوں پر ہراس طاری کر رہے تھے۔ بادی النظر میں تو ان کی آمد کا مقصد بالکل واضح تھا---- اس گاؤں میں غالب آبادی چونکہ مسلمانوں کی تھی۔ بھلے وہ بیچارے نام نہاد مسلمان ہی سہی اور دین اسلام سے ان کا دور دور تک کا بھی واسطہ نہ تھا، لیکن نام کے تو وہ بہرحال مسلمان تھے۔

بھارتی فوج شاید اس امید پر یہاں آئی تھی کہ کچھ پاکستانی کمانڈوز یہاں چھپے ہوں گے۔ میں بڑی بے چینی سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک جیپ میں لگے لاؤڈ اسپیکر سے کچھ اعلان کیا جا رہا تھا۔ یہاں آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی---- لیکن میں تصور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

چند منٹ بعد ہی گاؤں کے باہر ایک وسیع قطعہ اراضی پر میں نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مردوں کو جمع ہوتے دیکھا۔ یہ بہت چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی بمشکل ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ان میں ہندو سکھ بھی تھے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں نے اس مجمع کے دو گروپ بنا دیئے۔ ظاہر ہے ایک گروپ مسلمانوں کا تھا اور دوسرا غیر مسلموں کا۔ پھر مسلمانوں کے گروپ میں سے انہوں نے دس بارہ نوجوانوں کو الگ کیا اور ان سے کچھ پوچھنے لگے۔

ان بیچاروں کے پاس بھارتی فوج کے سوالات کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بھارتی سورے ان پر ٹوٹ پڑے اور رائفلوں کے بٹ سے انہیں وحشیوں کی طرح مارنے لگے---- باقی تمام دیہاتی سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے تھے۔ مار کھانے والے زمین پر لوٹتے اور چیختے چلاتے ہوئے ان کے قدموں سے لپٹ کر معافیاں مانگتے، لیکن ان درندوں کا دل نہ پسیجتا بلکہ ان کی وحشت اور بڑھ جاتی اور وہ زخم خوردہ کتوں کی طرح انہیں نوچنے لگتے۔ جب اپنا مقصد حاصل کرنے میں انہیں ناکامی ہوئی تو انہوں نے دو خوفزدہ بوڑھوں کو دھکے مارتے ہوئے باہر نکال لیا----!

اس کے بعد شاید وہاں موجود باقی لوگوں کو دھمکی دی گئی تھی کیونکہ میں نے انہیں باجماعت ہندوؤں کے سامنے ہاتھ باندھتے دیکھا۔ تین چار منٹ اسی جان لیوا منظر کی بھینٹ چڑھ گئے، پھر ریٹ ٹٹ کی آواز سنائی دی اور اگلا منظر دیکھنے سے پہلے میں نے جھٹکے سے دوربین آنکھوں سے پرے ہٹالی۔

میرے ساتھ کھڑے نائب صوبیدار نے شاید کسی لاشعوری عمل کے تابع بڑی آہستگی سے دوربین میرے ہاتھوں سے تھام لی۔ بمشکل ایک آدھ منٹ بعد ہی اس نے وہی عمل دہرایا اور دوربین بڑے احترام سے مجھے تھمادی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں خون تیرتا محسوس ہوا----!

یہ ان بے گناہ بدقسمت اور مقبوضہ کشمیری مسلمان گوجروں کا خون تھا جو نجانے کیوں اب تک بھارت میں موجود تھے---- اور آج جب بھارتی فوج کی گولیوں نے ان کی جان لی تھی۔ یہی خون میرے ساتھی کی آنکھوں میں در آیا---- وہ میری طرف بڑی امید افزا نظروں سے دیکھ رہا تھا---- شاید اس حکم کا منتظر تھا کہ آگے بڑھے اور ان بے گناہ مسلمانوں کے خون کا مول ابھی چکادے۔

لیکن----!

مجھے اس کے علاوہ بھی کچھ سوچنا تھا۔ ابتدا ہی میں قدرت نے میرے نازک کندھوں پر بڑی حساس ذمہ داریاں لاد دی تھیں---- میرا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میری شریانوں میں بھی انگارے تڑپنے لگے تھے۔ جی چاہتا تھا ایک ایک کافر کے جسم سے ہزار ہزار



گولیاں گزار دوں، لیکن میں اس مختصر سی جمعیت کا کمانڈر تھا---- بحیثیت کمانڈر ان لوگوں کے تمام برے بھلے اعمال کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ میرا فی الوقت یہ فرض تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اپنے ان جیالے اور شیر دل کمانڈوز کو بھارتی فوج کے جبڑوں سے نکال کر بعافیت اپنی سرحد تک لے جاؤں---- کیونکہ یہ لوگ میری مملکت کا بہت قیمتی اثاثہ تھے اور انہیں ابھی ایک بہت لمبی لڑائی دشمن سے لڑنا تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر دوربین آنکھوں سے لگالی۔

منظر کی وحشت ناکی میں مزید اضافہ ہونے لگا۔ دونوں بدقسمت بوڑھے تڑپ تڑپ کر جان دے چکے تھے اور کچھ عورتیں اور بچے ان کے گرد گھیرا ڈالے اونچی آواز میں بین کر رہے تھے۔

میں پتھر کی مورت بنا اس کی طرف آنکھوں سے دوربین لگائے کھڑا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک تیز رفتار ٹرک آ کر رک گیا---- کچھ نوجوان عورتوں کو بازوؤں سے کھینچتے ہوئے وہ لوگ ٹرک میں پھینکنے لگے۔ باقی لوگ پھر بین کرنے لگے، لیکن بھارتی بھیڑیئے قہقہے لگاتے ہوئے لڑکیاں لے کر چلے گئے۔

آناً فاناً جیپیں بھی وہاں سٹارٹ ہو گئیں۔ وہ لوگ جس سمت سے آئے تھے اسی سمت جانے لگے۔ ابھی بمشکل جیپوں نے چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا جب اچانک آسمان پر مشرق کی سمت سے دھاڑیں گونجنے لگیں اور چند سیکنڈ بعد ہی رعد کی طرح کڑکتے ہوئے پاک فضائیہ کے شاہین فرشتہ اجل بن کر ان کے سروں پر غوطہ زن تھے۔

آنے والے دو تھے----!

دونوں فائٹروں نے شاید یہ "شکار" دیکھ لیا تھا اور اس کھلے میدان میں اسے چھوڑ کر جانے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا---- ایک دوسرے کے تعاقب میں لپکتے ہوئے وہ اتنی کم بلندی پر آ گئے کہ مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہیں کسی درخت سے نہ ٹکرا جائیں۔ ان کے پہلوؤں سے لٹکتی گنوں کے دہانے کھلے اور موت کی سرخ زبان بھارتی فوجیوں کو جو جیپیں چھوڑ کر کسی آڑ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے، چاٹنے لگی۔ دست غیب نے اس خونیں ڈرامے کے چند ہی منٹ بعد اس کے کرداروں کو آلیا تھا---- بزدلوں کی طرح چیختے چلاتے وہ زمین پر لوٹتے اور ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ چند منٹ بعد ہی وہاں جلتی ہوئی جیپوں اور بھارتی فوجیوں کی لاشوں کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا۔

شاید ہی کوئی خوش قسمت ان میں سے زندہ بچ نکلا ہو----!



آج یہ کہنا بڑا عجیب سا لگتا ہے---- لیکن سچی بات تو یہ ہے اس روز مجھے جو روحا سکون اس "حادثے" کے فوراً بعد نصیب ہوا، وہ شاید پھر کبھی نصیب نہ ہو سکے۔ بھار درندوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھ کر مجھے ایسے خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے کسی بچے بہت ضد کرنے کے بعد اپنی مرضی کا کھلونا ملنے پر ہوا کرتی ہے۔

میرے باقی ساتھیوں کے جذبات بھی یقیناً مجھ جیسے ہی ہوں گے۔

شاہینوں کے لوٹتے ہی کونوں کھدروں میں چھپے وہ بھارتی کمانڈوز جو بچ رہے تھے، باہر نکل آئے۔ اپنے سیکشن کی تباہی کا منظر دیکھ کر وہ بزدلوں کی طرح پاکستان ایئرفورس کو گالیاں دینے لگے۔

چند منٹ بعد وہاں ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔ جس نے فضا ہی میں ایک چکر لگایا اور واپس چلا گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے اور دائیں بائیں سے بھارتی ٹڈی دل وہاں اکٹھے ہونے لگے---- ان لوگوں کے تیور کسی آنے والے طوفان کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی تھے۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا اور ہمارے لیے اندھیرا پھیلنے سے پہلے یہاں سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا کیونکہ رات کے اندھیرے کی اور بات تھی۔ دن کے اجالے میں تو بھارتی سیکورٹی کے کتے ہی ہمیں چن چن کر مار ڈالتے۔

آنے والی قیامت کے آثار محسوس کرتے ہی میں نے اپنے اگلے مورچے والے ساتھیوں کو خصوصی ہدایات روانہ کر دیں۔ اپنے پاس موجود واحد ہیوی مشین گن بھی اس طرف بھیج دی کیونکہ دشمن اگر ہم پر حملہ آور ہوتا تو اس کا پہلا ٹکراؤ ہمارے ان ہی دو جیالوں سے ہونا تھا جو نالے کے کنارے موجود تھے۔



ہم اپنی جگہ چوکس تھے۔

میں نے دوربین بھارتی فوجیوں پر جما رکھی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو ٹرک آ کر رکے اور ان میں سے دس پندرہ تک "بلڈ ھاؤنڈ" کتوں کی زنجیریں تھامے فوجی بھی باہر نکل آئے۔

اس کے ساتھ ہی جموں کی طرف جانے والی سڑک کی طرف سے ایک گن شپ ہیلی



کاپٹر ہمیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ دشمن کی ایس-ایس-جی نے ہمیں بڑے پیمانے پر تلاش کرنے کی منصوبہ بندی کی ہے اور اب دشمن اس پر عمل کرنے جا رہا ہے۔

ہیلی کاپٹر فوجیوں کے سروں پر سے چکر لگاتا اب ہماری طرف آ رہا تھا۔ میرے ساتھی اتنے شاندار طریقے سے "کیموفلاج" ہو چکے تھے کہ اگر ہیلی کاپٹر ہمارے سروں سے دس فٹ بلند بھی ہوتا تو وہ انہیں زمین ہی کا کوئی حصہ سمجھ کر نظرانداز کر دیتا---- اور وہی ہوا۔

ہیلی کاپٹر اتنی نیچی اڑان کر رہا تھا کہ اگر ہم چاہتے تو باآسانی اس کے پائیلٹ کو نشانہ بنا سکتے تھے---- لیکن ہم چاہتے ہوئے بھی یہ خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مجھے تشویش اگر تھی تو صرف ان سدھائے ہوئے کتوں کی طرف سے تھی---- جن کی مدد سے یہ لوگ کسی بھی وقت ہمارے سروں پر پہنچ سکتے تھے۔

ہیلی کاپٹر نے دو تین چکر لگائے، پھر ہماری تلاش میں ہمارے سروں سے آگے نکل گیا۔ میں اپنی گن کے ٹریگر پر انگلی جمائے سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ بہرحال چند منٹ بعد کتوں کی مدد سے ہمیں تلاش کر لیں گے اور دن کے اجالے میں اس طرح کیا ہم ان سے بچ کر نکل سکیں گے----؟ اس سوال کا جواب بظاہر نفی میں تھا، لیکن کمانڈو مایوس نہیں ہوا کرتے---- حالات خواہ کیسے بھی ہوں۔ ہمیں آخری گولی تک لڑنا تھا---- خالی ہاتھوں لڑنا تھا اور زندگی کے آخری لمحات تک اس لڑائی کو جاری رکھنا تھا----!

میری نظریں اب دشمن کے فوجیوں کی اس ٹولی پر گڑی ہوئی تھیں جو پانچ کتوں کے ہمراہ اس پہاڑی نالے کی طرف آ رہے تھے جہاں ہمارا پہلا مورچہ قائم تھا۔

لڑائی ناگزیر ہو چکی تھی----!

میں جانتا تھا کہ میرے جانباز میرے حکم کے بغیر اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کریں گے، خواہ یہ کتے ان کے جسم کی ایک ایک بوٹی نوچ ڈالیں---- میں نے اگلے ہی لمحے اپنے جوانوں کو حکم دے دیا کہ ناگزیر صورت حال میرے حکم کا انتظار کیے بغیر گولی چلا دیں۔

وہی ہوا۔ چند منٹ بعد کتوں نے پہاڑی نالے کے کنارے کھڑے ہو کر ہماری طرف منہ کر کے بھونکنا شروع کر دیا۔ دو تین کتے تو رسیاں چھڑوا کر دوڑے اور نالے میں کود گئے۔ میرے ساتھیوں کی طرف سے ابھی تک مزاحمت نہیں ہوئی تھی۔ وہ لوگ آخری لمحات تک اپنی تربیت کے مطابق خود کو دشمن کی نظروں سے چھپائے رکھنا چاہتے تھے، لیکن میں جان سکتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔

تین کتے بھاگتے ہوئے جنگلی گھاس کے اس جھنڈ کی طرف جا رہے تھے جدھر میرے دو سرفروش اپنا مورچہ جمائے بیٹھے تھے---- جیسے ہی یہ کتے تیزی سے اس طرف لپکے، ایک دوسرے مورچے سے گن کا دہانہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے کتے زمین پر لوٹنے لگے۔

میرے ساتھیوں نے بڑی شاندار چال چلی تھی اور دشمن کو اپنے پہلے مورچے کا علم نہیں ہونے دیا تھا، لیکن جس مورچے سے فائر آیا تھا، دشمن اس طرف متوجہ ہو گیا۔ بھارتی کمانڈوز دوسرے ہی لمحے زمین سے چپک گئے اور ان کی گنوں کے دہانے کھل گئے، لیکن ان کے زمین پر کھڑے ہونے سے زمین بوس ہونے تک کے دوران جو چند سیکنڈ کا وقفہ تھا---- اس کی معمولی قیمت ان لوگوں نے ادا نہیں کی تھی۔

بمشکل آدھے ہی سانس لے رہے تھے----!



دشمن کو ہماری پوزیشنوں کا علم ہو چکا تھا۔ اس مرتبہ دشمن نے سامنے آنے کے بجائے ایک اور چال چلی اور نیم دائرے میں ہمارے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہی ہیلی کاپٹر جو تھوڑی دیر پہلے ہمارے سروں پر سے گزر کر آگے چلا گیا تھا، مجھے لوٹ کر اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

اس مرتبہ اس کے پہلوؤں سے لٹکتی گنیں بھی گھوم کر سیدھی ہو چکی تھیں۔ ہیلی کاپٹر کے پائیلٹ نے کمال ہوشیاری سے اپنا ہیلی کاپٹر قریبا" ترچھا کرتے ہوئے اپنی گنوں کے دہانے کھول دیئے۔ وہ سیدھا ہمارے سروں پر دور ہی سے فائرنگ کرتا آ رہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ ہمیں سر اٹھانے کی بھی مہلت نہ ملے---- لیکن اس بے چارے کو علم نہیں تھا کہ ہم یہاں زندگی کی بھیک نہیں ایک باوقار موت مانگنے آئے تھے۔

جیسے ہی وہ ہماری واحد مشین گن کی رینج میں آیا۔ زمین سے گولیاں انگاروں کی صورت میں ایک قطار میں اس کی طرف لپکیں اور دوسرے ہی لمحے ایک زوردار دھماکے سے ہیلی کاپٹر پھٹ کر فضا میں بکھر چکا تھا۔

اس چوٹ نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا---- بمشکل دو ہی منٹ بعد ہمارے مشین گن والے مورچے پر یکے بعد دیگرے راکٹوں کی بارش ہونے لگی اور دونوں مجاہد جام شہادت نوش کر گئے۔

ہماری مختصر سی جمعیت کے لئے یہ سانحہ بڑا عظیم اور دہلا دینے والا تھا۔ ہمارے نہ صرف



دو ساتھی ہم سے الگ ہو گئے تھے بلکہ ہمارا سب سے اہم ہتھیار واحد مشین گن بھی ختم ہو چکی تھی۔ اب ہمیں اپنے معمولی ہتھیاروں سے دشمن کو اندھیرا ہونے تک روکے رکھنا تھا۔

میرے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا----!

صرف ایک راستے سے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نالے کے کنارے کنارے جھاڑیوں اور پتھروں کی آڑ لے کر راہ فرار اختیار کروں، دوسری صورت میں دشمن ہم کو محض چند منٹوں میں اس جگہ بھون کر رکھ دیتا۔ میں نے وہی کیا اور اپنے ساتھیوں کو نالے کے ایک کنارے کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف پسپائی کا اشارہ کر دیا۔

ابھی ہمارے پہلے ساتھی نے مورچے سے سر اٹھایا ہی تھا کہ مارٹر کے دو گولے اس سے بمشکل دس گز کے فاصلے پر گر کر پھٹے۔ دشمن نے بھی ہماری طرف سے اس ممکنہ اقدام پر نظر رکھی ہوئی تھی اور وہ ہمیں مورچوں سے سر اٹھانے کی مہلت بھی دینے کو تیار نہیں تھا ----! اس روز اپنی فوجی زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے خود پر رحم آ رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ الہی! ہم کیا یونہی چونٹیوں کی طرح مسلے جائیں گے؟ اپنے دل میں کچھ کر گزرنے کی حسرت لے کر مر جانے سے بڑی موت شاید اور کوئی نہ ہو گی---- کمانڈو موت سے نہیں ڈرا کرتے، لیکن کچھ کر کے مر جانے میں جو مزا ہے---- اس کا احساس ہی بڑا روح پرور ہوتا ہے۔

اس لمحے شاید قدرت کو بھی ہماری بے بسی پر رحم آ گیا---- اچانک ہی مغرب کی سمت سے تین شاہین اس طرف آتے دکھائی دیئے۔ ان کی دھاڑوں کے ساتھ ہی دشمن کی فائرنگ رک گئی۔ وہ لوگ اس طرح شاید شاہینوں کو اپنی موجودگی سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ پاکستان ایئر فورس نے ابھی ہمیں بھلایا نہیں---- انہیں علم تھا کہ یہاں کمانڈوز کی مختلف ٹولیاں دشمن کے جبڑوں میں پھنسی ہوئی ہیں جہاں سے انہیں نکالنے کے لئے محض آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ کے وقفہ سے مختلف فارمیشن اس طرف آ رہی تھیں۔

اس فارمیشن کا ٹارگٹ تو شاید کوئی اور ہو گا، لیکن راستے میں مفت کا شکار دیکھ کر ان کی بھی رال ٹپکی۔ میں نے ایک سٹار فائٹر ۱۰۴ کو فضا میں قلابازی کھا کر زمین کی سمت جھکتے ہوئے محسوس کیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ہمارے سروں پر تھا۔

جانباز نے طیارہ انتہائی کم بلندی پر لا کر ہمارے اور دشمن کے سروں پر ایک چکر کاٹا اور

دشمن نے میری توقعات کے عین مطابق ایسی غلطی کر دی جو اس کی موت کا پروانہ بن گئی۔--- کسی بیوقوف بھارتی فوجی نے جوش غضب میں حواس باختہ ہو کر مشین گن کا فائر کھول کر شاہینوں کو وہاں اپنی موجودگی کا ثبوت فراہم کر دیا۔

اس مرتبہ تینوں جہاز ایک دوسرے کے تعاقب میں آئے اور ہمارے گرداگرد ہمیں گھیرے میں لیے ہوئے بھارتی فوجیوں کی چیخوں سے آسمان بھی لرزنے لگا---- اس سے بہتر موقعہ ہمیں اور کب مل سکتا تھا۔ ہم نے برستی گولیوں کے عین درمیان راستہ بنایا اور کہنیوں کے بل نالے کے کنارے کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگے۔ ہماری تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ کہنیاں چھلنی ہونے لگی تھیں، لیکن ہم تیزی سے دور ہی دور نکلتے چلے جا رہے تھے۔

بھارتی ایئرفورس نے بھی شاید اپنی بری افواج کو مروانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ دس منٹ تک ہونے والے اس زندگی موت کے کھیل میں کسی بھارتی جہاز نے مداخلت کا حوصلہ نہ کیا اور جب یہ شاہین اپنا ایمونیشن ختم کر کے لوٹنے لگے تو پٹھانکوٹ کی طرف سے بھارتی مگ طیاروں کی ایک فارمیشن اس طرف اڑ کر آتی نظر آئی، لیکن اب وہ سوائے اپنے سورماؤں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔



شام کی آمد آمد تھی جب ہم اس پہاڑی ندی نالے اور اونچی نیچی گھاس سے اٹے ہوئے علاقے میں میلوں تک پھیلے گھاس کے جنگل میں چلتے جا رہے تھے۔ ہمارے پاس صرف ایک کمپاس بچی تھی جس کی مدد سے ہم اپنی سمت درست رکھ سکتے تھے۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ سرحد یہاں سے کتنی دور ہے---- اور ہم واقعی پاکستان کی طرف جا رہے ہیں یا واپس بھارت میں----!

گھاس کے اس جنگل میں دشمن بوکھلائے ہوئے وحشی درندوں کی طرح ہم پر گولیوں کا مینہ برسا رہا تھا۔ سرحدی علاقہ اور پھر پاکستان ایئرفورس کی دہشت کی وجہ سے اب تک کسی جہاز یا ہیلی کاپٹر نے ہمارے سروں پر آگ برسانے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔

سورج اب پاکستان کی سمت دریائے راوی میں اتر رہا تھا اور میں اور میرے چھ ساتھی اپنے خراشوں بھرے جسم اور زخمی دلوں کے ساتھ اپنی سرحد کی طرف پسپائی اختیار کر رہے تھے۔



ہمارے سروں پر سے اب ہیوی توپ خانے کے چلائے گئے گولے سرحد کے دونوں اطراف پرواز کرتے جا رہے تھے---- جب اچانک ہی ایک گولا ہم سے بمشکل دس گز دور گرا---- اور زوردار دھماکے کی آواز سے پھٹا۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے میں فضا میں کئی فٹ اوپر اچھلا اور پھر زمین پر آن گرا۔ میرے حواس بجا تھے۔ فوجی تربیت کے مطابق میں نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں کے گرد جمائے اور زمین بوس ہو گیا۔

زمین بوس ہونے کا یہ عمل اختیاری ہرگز نہیں تھا۔ محض چند سیکنڈ بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں اپنی مرضی سے زمین پر نہیں لیٹا ہوا بلکہ اٹھنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ میری پتلون اور قمیص بائیں طرف سے خون میں بھیگ رہی تھی۔

خیریت گزری کہ سینہ، ہاتھ اور منہ محفوظ تھے----!

محض دو تین منٹ بعد ہی میں اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔ اپنے پہلو سے لٹکتی بوتل کھول کر میں نے چند گھونٹ حلق میں انڈیلے تو قدرے سکون نصیب ہوا۔

اچانک ہی میری داہنی طرف کسی نے آہستہ سے "سر" کہا۔ میں نے بڑی ہمت کر کے گردن گھمائی۔ میرا حوالدار گھسٹتا ہوا میری سمت آ رہا تھا۔ اس کا منہ بری طرح زخمی تھا۔ ہیلمٹ اس کے سر پر نہیں تھا اور چہرے پر سوائے خون کے اور کچھ دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ وہ بے چارہ اپنے "سر" کی خبرگیری کو دیوانہ وار میری طرف لپک رہا تھا۔

میں نے اپنے پیٹ کے زخم کا جائزہ لیا اور اپنے خون سے بھری اپنی فیلڈ پٹی کھول کر اس پر باندھی، پھر اپنے حوالدار کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے ماتھے سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس کے منہ میں بوتل سے پانی ٹپکایا----!!

حلق میں پانی بھی اس کے لئے باعث تکلیف تھا، لیکن اس سے اس کے اوسان قدرے بحال ہو گئے۔ سب سے پہلے میں نے اس کی فیلڈ پٹی سے اس کے چہرے پر پھیلا خون صاف کیا، پھر پٹی اس کے سر باندھ دی۔

ہم دونوں ہمت کر کے اٹھے کہ باقی ساتھیوں کی خیریت دریافت کریں۔ میرا دل اس احساس سے ڈوبنے لگا تھا کہ ابھی تک کسی کے کراہنے کی آواز بھی ہم نے نہیں سنی تھی۔

ہمارے ساتھی مل گئے---- لیکن سب شہید ہو چکے تھے---- موت نے کیا وقت چنا

تھا ان کے لئے، جب ہم بظاہر محفوظ ہو کر اپنی سرحد کے نزدیک پہنچ چکے تھے تو موت نے انہیں آ لیا۔

ہم نے ایک ایک کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانا چاہا۔ جھک کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں سننے کی ناکام کوشش کی۔ ان کی نبضیں دیوانوں کی طرح ٹٹولتے رہے، لیکن وہ نہ جاگے۔ گہری نیند سو گئے۔

خود میری یہ حالت تھی کہ اب زمین سے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ میرے پیٹ میں مسلسل ایک آگ پھیل رہی تھی۔ پھر یہ آگ میرے خون میں شامل ہو کر میری رگوں میں اترنے لگی۔ میرے بدن کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ کوئی نادیدہ طاقت بڑی بے رحمی سے میرے دل کو مٹھی میں بھینچ بھینچ کر میری جان لے رہی تھی۔

ہم دونوں میں سے کسی کے لئے اتنا بھی ممکن نہیں تھا کہ شہیدوں کے ہتھیار ہی اٹھا سکیں۔ ہم نے ان کے بازوؤں سے لپٹے ان کے نام اور کمپنی کے نمبر الگ کر کے اپنی جیبوں میں ڈال لیے---- لہو برساتی آنکھوں سے ہم نے اپنے ہاتھ آسمان کی سمت پھیلا کر ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کی اور پاکستان کی سمت گھسٹنے لگے۔

چلتے چلتے میں ڈگمگانے لگتا تو میرا حوالدار جو خود بری طرح زخمی تھا، مجھے سہارا دے کر بٹھا دیتا---- صبح تک کا یہ سفر کیسے کٹا---- بڑی لمبی کہانی ہے۔ بس یہ جانئے کہ ابھی ان آنکھوں نے اپنی ذلت کے آخری مناظر دیکھنے تھے کہ کھلی رہیں اور علی الصبح جب ہم پاکستانی رینجرز کے نرغے میں پہنچے تو اس احساس کے ساتھ ہی کہ یہ اپنے لوگ ہیں، بے ہوش ہو گئے۔

☆○☆

مجھے ہوش ایک فیلڈ ہسپتال میں آیا۔ جنگ اپنے نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔ میرے پیٹ پر اکیس ٹانکے لگے تھے اور ٹانگ پر تیرہ۔ میرے واحد زندہ ساتھی کو وہ لوگ پیچھے آرمی ہسپتال میں لے گئے تھے کیونکہ اس کے زخم میں انفیکشن ہو گیا تھا۔

لڑائی کے باقی ایام میں نے ہسپتال کی چارپائی پر کروٹیں بدلتے گزارے۔ ہر لمحے میرا دل چاہتا تھا کہ اڑ کر وہیں پہنچ جاؤں جہاں میرے سربلند ساتھیوں نے جان جان آفرین کو سونپی تھی---- میں تڑپتا رہا کہ اپنے ساتھیوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب دشمن سے



لوں، لیکن مجھ میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہی ہو سکتا۔

اس مہم کے بارے پاک فضائیہ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے:

"گرفتاری یقینی تھی---- لیکن کوئی آسانی سے گرفتار نہیں ہوا۔ وہ اپنی آخری سانس یا اپنی آخری گولی تک لڑتے رہے۔ کئی سنگینوں سے شہید کئے گئے اور کچھ گرفتار ہو گئے۔ جو تلاش نہ کیے جا سکے انہوں نے اپنے مقصد کے حصول اور پاکستان واپس آنے کی کوشش کی۔ انہوں نے گنے، مکئی یہاں تک کہ گھاس کھا کر گزارہ کیا۔ کچھ واپس اپنے وطن میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ انسانی جدوجہد بے مثال تھی مگر افسوس یہ معرکہ جنگ نہ تھا----!"

یہ تھی اس دہشت ناک آپریشن کی مختصر سی روداد جس کا سامنا مجھے فوجی زندگی کی ابتدا ہی میں کرنا پڑا۔ اس حادثے نے مجھے کندن بنا دیا تھا۔

جب لڑائی کے خاتمے پر قریباً ایک ماہ بعد میں رو بصحت ہو کر اپنے سینے پر ستارہ جرأت سجائے گھر پہنچا تو جہاں میرا سر فخر سے بلند تھا وہاں میرے اندر ایک ٹوٹ پھوٹ بھی بدستور جاری تھی۔ میں سوچ رہا تھا کیا یہ لڑائی صرف اس لیے شروع ہوئی تھی کہ میرے شیر دل کمانڈوز دشمن کی سر زمین پر سسک سسک کر اپنے ملک کے لیے جان دے دیں اور ہم ان کا مشن ادھورا چھوڑ کر دشمن سے بغل گیر ہونا شروع ہو جائیں۔

# عظمیٰ

۶۵ء سے ۷۱ء تک کا زمانہ ایک خواب کی طرح یاد ہے۔
بس ایک ہی آرزو ہوتی تھی دل میں کہ اپنے ان ساتھیوں کے سامنے روز قیامت شرمندہ نہ ہونا پڑے، جنہوں نے اس مقدس مشن میں اپنی جانیں نچھاور کی تھیں۔ ۷۰ء کے آغاز میں خصوصی انٹیلی جنس کورس پاس کرنے کے بعد میری ذمہ داریاں اور زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ مجھے وردی میں بھی اور بغیر وردی کے بھی دونوں صورتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔
میری کارگزاری بہت شاندار تھی۔ ساتھیوں کی شہادت نے جو الاؤ میرے اندر روشن کر دیا تھا' اس نے مجھے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ میں یہ جان کر ٹریننگ کی عذاب ناکیاں ہنس ہنس کر جھیل گیا کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اپنے دل کے سارے ارمان نکال لوں گا۔
اور آج جب میں ڈھاکہ پہنچا تو سوچ رہا تھا خدایا کس امتحان میں ڈال دیا ہے تو نے---- میں یہاں ہندو سے لڑنے آیا ہوں یا اپنے مسلمان بنگالی بھائیوں سے؟ روزانہ کوئی نہ کوئی پریشان کن خبر مل جاتی تھی۔ آج فلاں جگہ مکتی باہنی نے محب وطن پاکستانیوں پر حملہ کیا---- آج فلاں جگہ دشمن کی سازش پکڑی گئی۔
یہ خبریں جب گردش کرتی ہمارے میس میں پہنچتیں تو ہم دل مسوس کر رہ جاتے۔
ہمیں سختی سے اپنی بارکوں تک محدود رہنے کا حکم ملا تھا۔
چھاؤنی سے باہر ہم اپنی ذاتی حیثیت سے جاتے تھے۔ پاکستانی فوج کے افسر کی حیثیت سے تو ہم خود کو باہر متعارف ہی نہیں کروا سکتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ احتیاط بھی بسااوقات نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ میں سیاسی آدمی نہیں کہ حالات پر تبصرہ کرنے کے مخصوص منافقانہ انداز سے آپ کے سامنے ان حالات کا "تجزیہ" پیش کر دوں' لیکن ایک بات کہنے میں مجھے باک نہیں کہ ہم نے مشرقی پاکستان میں جو کام بہت بعد میں شروع کیا' وہ کچھ عرصہ پہلے شروع کر دیتے تو عین ممکن ہے حالات اتنی سنگین نوعیت اختیار نہ کرتے---- بہرحال

اس کا فیصلہ تو مستقبل کا مورخ ہی کرے گا کہ کس نے کہاں اور کتنی غلطی کی؟
ڈھاکہ پہنچنے کے چند ہی روز بعد مجھے اپنی "خصوصی ڈیوٹی" سنبھالنے کا حکم مل گیا۔
میرے لئے یہ "حکم" نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ سارا دن چھاؤنی میں بیٹھ کر الٹی
سیدھی خبریں سن سن کر کڑھتے رہتے تھے۔ میدان عمل میں اتر کر دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا
بدرجہا بہتر اور میرا مشن بھی تھا۔۔۔۔!
ہمیں ڈھاکہ شہر میں اپنا خفیہ آفس قائم کر کے حالات پر نظر رکھنی تھی کیونکہ انٹیلی
جنس رپورٹس کے مطابق دشمن نے اپنی تربیت یافتہ ایجنٹ عورتیں اور مرد بہت پہلے سے
یہاں داخل کر رکھے تھے۔۔۔۔ بھارتی انٹیلی جنس "را" کی تربیت یافتہ عورتیں تو اپنے فن
میں یکتائے روزگار تھیں۔ اعلیٰ طبقے میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا' بڑے اور اہم مناصب پر
فائز افسران سے مراسم استوار کر کے اپنے مطلب کی معلومات حاصل کرنا اور انہیں سرحد پار
پہنچانا ان کی ڈیوٹی تھی۔۔۔۔ اس سلسلے میں بھارتی انٹیلی جنس کی خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ
اسے اپنے کام کے لئے بہت سے مقامی غدار میسر آ گئے تھے۔
یہ لوگ نہ صرف خود دشمن کے آلہ کار تھے بلکہ معصوم اور بھولے بھالے ذہنوں کو
زہریلے پراپیگنڈے سے مسموم کر کے انہیں ورغلاتے اور اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے
بروئے کار لاتے تھے۔۔۔۔ بہت سی بنگالی لڑکیاں اور لڑکے ان کے لئے کام کر رہے تھے۔
ان میں سے زیادہ تعداد ان کی تھی جن کے والدین عوامی لیگی ذہن رکھتے تھے یا پھر جو ہندو
تھے۔
بعض اپنی مرضی سے' بعض ورغلائے جانے پر اور کچھ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس
گھناؤنے دھندے میں ملوث تھے۔
ہم مسلمان تھے۔۔۔۔! ہمارا ایمان تھا کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہمارے
افسران نے ہمیں یہی بتایا تھا کہ ہمارے بھائیوں کو ورغلایا گیا ہے۔ انہیں گمراہ کیا جا رہا ہے۔
اگر وہ زیادتی بھی کریں تو ہمیں خاموشی اختیار کرنا تھی۔ میرے علم میں متعدد ایسے واقعات آ
چکے تھے کہ بعض مقامات پر پاکستانی فوج کے جوانوں کو طیش دلانے کے لیے گالیاں دی گئیں'
لیکن یہ لوگ خاموش رہے۔۔۔۔!
انہیں برا بھلا کہا جاتا تو اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔۔۔۔!
اپنے ہی بھائی بندوں کے بہیمانہ قتل کے مناظر دیکھ کر ان کے دل خون کے آنسو ضرور
روتے تھے' لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔۔۔۔ ضوابط نے ان کے ہاتھ باندھ رکھے



تھے۔۔۔۔!
جو لوگ "را" کے لیے کام کر رہے تھے ان کے ماتھے پر کچھ لکھا نہیں ہوتا تھا نہ ہی وہ
باہر کے لوگ تھے۔ ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے یہ "معصوم اور بھولے بھالے بنگالی"
جب ہمیں ملتے تو یہی دکھائی پڑتا تھا کہ وہ سب ہمارے اپنے ہیں۔ وہ پاکستان کی بقاء اور
سلامتی کے لیے مر جانے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔
ہمارے حوصلے بلند کرتے رہتے تھے۔۔۔۔ ان کے منہ میں موجود "رام رام" کی مالا تو
ہمیں سنائی دے جاتی تھی' لیکن ان کی بغلوں میں چھپے خنجر ہمیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔
یہ ایسے "معصوم درندے" تھے جو ذرا موقعہ ملنے پر زہر میں بجھے ان خنجروں کو فوراً
اپنی بغل سے نکالتے اور اپنے ہم وطنوں کی پیٹھ میں گھونپ دیتے۔



بنیادی طور پر میری یہی ڈیوٹی تھی کہ میں ایسے موذیوں پر کڑی نظر رکھوں۔ ان کو تلاش
کروں' پاتال سے نکالوں اور کیفر کردار تک پہنچاؤں۔
میں نے اس کام کی خصوصی تربیت حاصل کی تھی۔ میں یوں بھی پیشہ ور کمانڈو تھا۔
مغربی پاکستان کے بیشتر سرحدی علاقوں میں ایسی کئی خطرناک مہمات انجام دے چکا تھا۔ مجھے
نامساعد حالات میں اپنے ذہن کو بیدار رکھ کر' اپنے حواس کو بحال رکھ کر کام کرنے کا ڈھنگ
آتا تھا' لیکن اس روز جب ڈھاکہ شہر کے راجر باغ پولیس لائن کے نزدیک قائم شدہ اپنے
خفیہ آفس کی طرف جیپ ڈرائیو کرتا جا رہا تھا تو مجھے رہ رہ کر یہی سوچ کھائے جا رہی تھی کہ
اس ماحول میں جہاں سارے اپنے ہیں' اپنوں کے بھیس میں چھپے غیروں کے آلہ کاروں کو
میں کیسے شناخت کروں گا؟
میں سول کپڑوں میں ملبوس آرمی کی جیپ چلاتے ہوئے اکیلا ہی اپنے آفس کی طرف جا
رہا تھا۔
شام ڈھاکہ کی سڑکوں پر دبے قدموں اترنے لگی تھی۔
شام اترنے پر ایک خاموش اور پراسرار سی ہوا جس میں یہاں کی مٹی کی مخصوص باس
گندھی ہوتی ہے' ہولے ہولے پورب سے پچھم کی طرف رینگ رہی تھی۔ گزشتہ تین چار
روز سے وقفے وقفے سے ہونے والی بارش اب تھم چکی تھی' لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا
تھا۔

ڈھاکہ پر وحشت و بربریت کے سائے روز بروز گہرے ہو رہے تھے۔ سرشام ہی لوگ کاروبار زندگی سمیٹ کر گھروں میں دبک جاتے تھے اور تخریب کار سڑکوں پر نکل آتے تھے۔ ہمیں ان دنوں خصوصی ہدایات جاری کی جاتی تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہم اشد ضرورت کے بغیر شام ڈھلنے کے بعد بلاوجہ اپنے ٹھکانوں سے باہر نہ نکلیں کیونکہ اکا دکا جوان پر گھات لگا کر حملوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا----!

میں نے کبھی ایسے احکامات اور احتیاطوں کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ یوں بھی میری ڈیوٹی تو "سول" تھی۔ میں وردی میں تو ہوتا نہیں تھا۔ اسی لیے شاید میں نے لاشعوری طور پر خود کو ان احکامات سے مستثنیٰ جاننا شروع کر دیا تھا۔

میں جس سڑک پر جیپ چلاتا جا رہا تھا وہاں سڑک کے دونوں اطراف پام کے گھنے درختوں کے سوا اور دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بادل گھنے ہونے کی وجہ سے اندھیرا معمول سے زیادہ تھا۔ اسی لیے میں نے ہیڈلائٹس روشن کر دی تھیں۔ سڑک دور دور تک ویران تھی----!

اچانک مجھے سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ ہیڈلائٹس کی روشنیاں اب ایک لڑکی پر منعکس ہو رہی تھیں۔

میں نے ونڈ سکرین پر مکمل انہماک سے نظریں جمائیں۔ سامنے سڑک کے عین درمیان ایک لڑکی دونوں ہاتھ مدد کے سے انداز میں اوپر اٹھائے مجھے رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔



سڑک کے درمیان اس طرح اچانک ایک لڑکی کا سامنے آ جانا حادثہ ہی کہلا سکتا ہے۔ بلا شبہ یہ حادثہ بعد میں میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ بنا، لیکن تب میں نے اپنی تربیت کے مطابق فوراً" ہی سوچا تھا کہ میں کسی سازش کا نشانہ بننے والا ہوں۔

ان دنوں پاکستانی فوج کے اکا دکا افسروں اور جوانوں کو گھیر کر ان پر حملہ کرنا مکتی باہنی کے تربیت یافتہ درندوں کا دل پسند مشغلہ تھا۔ مجھے ان لوگوں کے "ذرائع اطلاعات" کے متعلق بھی خوش فہمی نہیں تھی۔ آخر یہی بنگالی ہمارے ساتھ کام کرتے تھے۔ کسی کو ثبوت کے بغیر غدار کہنا یا اس پر شک کرنا ہمارے اصولوں کے خلاف تھا اور یہ لوگ بھی اپنے ماتھے پر غداری کا لیبل سجا کر کام نہیں کرتے تھے۔ یہ الگ بات کہ اپنی سی کر گزرنے سے کبھی چوکتے بھی نہیں تھے۔



میری "خدمات" کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ میں ان کا اولین شکار بنتا۔ عین ممکن تھا کسی آستین کے سانپ نے تخریب کاروں کو مطلع کر دیا ہو کہ میں اکیلا اس سڑک سے گزروں گا اور یہ ان کے لئے ایک خاصی کار آمد اطلاع تھی۔

مجھ ایسے فوجی کو نکل جانے کا موقعہ دے کر غالباً" وہ کفران نعمت کے مرتکب ہونا نہیں چاہتے تھے----!

میں نے ایک لمحے کے لئے یہ سوچا کہ بھلے لڑکی کو جیپ کے پہیوں تلے کچل ڈالوں، لیکن مجھے نکل جانا چاہیے---- کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

لیکن----

میں بہرحال ایک مسلمان ملک کی فوج کا مسلمان سپاہی تھا۔ میری غیرت ایمانی نے یہ گوارہ نہ کیا کہ ایک بے یار و مددگار عورت کو جس نے عین ممکن ہے واقعی مصیبت زدہ ہونے کی وجہ سے مجھے روکنا چاہا ہو، اس طرح چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔

ڈیش بورڈ میں رکھا پستول میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا---- پستول ہمہ وقت فائر کرنے کے لئے تیاری کی حالت میں رہتا تھا---- لڑکی کے بالکل قریب آنے پر میں نے زور سے بریک لگائے۔ پستول میرے بائیں ہاتھ میں تھا اور لڑکی دائیں طرف کھڑی تھی۔

"خدا کے لیے میری مدد کیجئے----!" اس نے میرے کسی استفسار کے بغیر بڑے ملتجی لہجے میں کہا۔

میری آنکھیں بیک وقت لڑکی اور ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے تربیت کے مطابق بریک لگانے کے صرف چند سیکنڈ بعد ہی سڑک کے چاروں اطراف خطرے کی بو سونگھنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

"بیٹھ جاؤ---- راستے میں بات کریں گے----" میں نے انجن بند نہیں کیا تھا اور بات کہنے کا انداز ایسا تھا کہ اگر اس نے انکار کیا تو میں ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالوں گا اور جیپ کو بھگا کر لے جاؤں گا۔

"شکریہ----!" لڑکی نے کہا، جیسے اسے اسی بات کی توقع تھی۔

اس کے ساتھ ہی وہ قریباً" بھاگ کر بونٹ کے آگے سے چکر لگا کر میرے بائیں ہاتھ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اس کے بیٹھتے ہی میں نے فوراً" اسٹیرنگ گھمایا اور جیپ کو اسی راستے پر بھگانے لگا جدھر سے میں آ رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے لڑکی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے کی

کیفیت چند لمحے کے لئے ضرور بدلی تھی پھر وہ نارمل ہو گئی۔

یہ صورت حال قدرتی بھی ہو سکتی تھی یا پھر میں اس کی توقعات کے برعکس ان کے جال سے نکل گیا تھا۔۔۔۔ جو بھی تھا۔ ابھی میں کسی فیصلے پر پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے بطور احتیاط یہ راستہ چھوڑ دیا تھا اور ایک ذیلی سڑک سے لمبا چکر کاٹ کر اپنی منزل کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرا یہ قدم صدفی صد احتیاطی تھا۔۔۔۔!

میں نہیں چاہتا تھا کہ اگر صورت حال وہ ہے جس کی توقع تخریب کاروں سے کی جا سکتی ہے تو میں ان کے لئے تر نوالہ بن جاؤں۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اپنے سامنے شیشے پر نظریں جماتے ہوئے اسے دیکھے بغیر پوچھا۔

"عظمیٰ۔۔۔۔!" اس نے جواب دیتے ہوئے گردن میری طرف موڑ لی تھی۔

"کیا بات ہے؟ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟" میں نے ایک اور موڑ مڑتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھئے وہ بات نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔۔۔۔! آپ شاید آرمی آفیسر ہیں۔ اس لیے......" اس نے بڑا نفسیاتی حربہ آزمایا۔

شاید اسے یہ شک تھا کہ میں اسے مشکوک سمجھ رہا ہوں۔ ان حالات میں ہم دونوں کی سوچ ٹھیک تھی، لیکن اسے شاید میری سوچ سے الجھن ہو رہی تھی۔

"میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ تمہارا اندازہ ٹھیک ہے میں پاکستان آرمی سے ہوں۔" میں نے دانستہ انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

اسے احساس تھا کہ میں جان بوجھ کر انجان بن رہا ہوں، لیکن اس نے مجھے جتلایا نہیں۔ میری بات سن کر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش رہی، پھر کہنے لگی۔

"میرا مطلب تھا آپ شاید مجھے بھی کوئی گمراہ بنگالی لڑکی سمجھیں۔۔۔۔!" اس نے اب [illegible] ذو معنی بات کی تھی۔

"جب تک آپ کچھ بتائیں گی نہیں، میں کیسے کوئی رائے قائم کر سکتا ہوں؟" میں نے اس کی بات کا بھرم رکھتے ہوئے کہا۔

"میں ایڈن کالج میں بی-اے کی سٹوڈنٹ ہوں۔ ادھر ہم لوگ پکنک منانے آئے تھے۔ میں اور میری سہیلیاں۔ ان کے دوست بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بہت بدتمیز لوگ تھے



......" اس نے روہانسی ہو کر کہا۔

بات نامکمل چھوڑ کر شاید وہ اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے خود اسے مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی تک اس کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت بھی نہ کی تھی۔

بادل گہرے اور نیچے ہونے لگے تھے۔ جو اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ کسی بھی لمحے بارش آئی کہ آئی۔ میں چاہتا تھا کہ بارش کے آغاز سے پہلے اس سے جان چھڑا لوں ورنہ زیادہ دیر لگتی۔ یہاں بارش گزشتہ چند دنوں سے اتنی تیز ہوتی تھی کہ اس میں ڈرائیونگ کرنا خاصا مشکل ہو جاتا تھا۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔

اچانک بڑے بڑے اولے گرنا شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"میرے خدایا!" میں نے سوچا۔ "میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔" اس حالت میں اسے میرے ساتھ دیکھ کر کوئی کچھ بھی رائے قائم کر سکتا ہے۔ سڑک ویران تھی لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ دیر تک یہ صورتحال رہے۔

میں نے جیپ سڑک کے کنارے ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی کر لی، کیونکہ جیپ کے دروازے نہ ہونے کے سبب بارش بڑی تیزی سے کھلے دروازوں سے حملہ آور ہونے لگی تھی۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔۔۔۔؟ کچھ خیال کیجئے۔۔۔۔!" جانے میرے منہ سے یہ دو فقرے کیسے ادا ہوئے تھے۔ مجھے تو بولنے کی ہمت ہی نہ ہو رہی تھی۔

"اوہ سوری!" اس نے آنسوؤں سے رندھے گلے سے کہا۔

میں نے اپنی سیٹ کے پیچھے رکھے جیپ کے دروازے اٹھائے اور اندر بیٹھے بیٹھے پہلے اس کی سائیڈ والا پھر اپنی سائیڈ والا دروازہ فٹ کر دیا۔

اچانک بادل اتنی زور سے گرجا کہ لڑکی سہم کر رہ گئی اور اس نے گھبراہٹ میں بڑی مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا۔

میں نے اس کی طرف گردن موڑی اور پہلی ہی نظر میں محبت کی وینس نے میرے دل میں بھالا اتار دیا۔ خدا کی پناہ! کیا آنکھیں تھیں وہ! جیسے کسی نے پڑھ کر مجھ پر فسوں پھونک دیا ہو۔ باہر دم بدم برستا ساون جیسے ٹپ ٹپ کرتا ان جھیل سی گہری آنکھوں میں اتر آیا

تھا---! میں ان لمحوں میں مکمل اس ساحرہ کی آنکھوں کی گرفت میں تھا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے چند لمحے اور اسی کیفیت میں گزرے تو میرا بدن پتھر کا ہو جائے گا۔

اسے بھی شاید اپنی بدحواسی کا احساس ہو گیا تھا۔

عظمیٰ نے فوراً" میری کلائی سے ہاتھ الگ کر لیا--- مجھے یوں لگا جیسے کلائی کے اس حصے میں انگارے اتر آئے ہوں جو آہستہ آہستہ اب میرے سارے بدن میں رینگنے لگے تھے۔

میں ابھی سحرزدگی کے عالم ہی میں تھا جب اس کی آواز مجھے سنائی دی۔

"اگر آپ نہ آجاتے تو نجانے آج........" پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

"کوئی بات نہیں۔ زندگی میں ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے کبھی کبھی---!" میں نے فوجیوں [illegible] بات [illegible] کر کہہ دی۔

"آپ کا شکریہ---!" [illegible] نے چند لمحوں ہی میں اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔

میں بظاہر ونڈ سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا' لیکن چوری چوری کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیتا۔ یہ الگ بات کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے چوری چوری دیکھ رہے تھے۔ جانے کون سی شبھ گھڑی تھی جب گہری آنکھوں والی عظمیٰ اس طرح چوری چوری چپکے چپکے میرے نہاں خانۂ دل میں اتر گئی۔

میرے دل کا آنگن تو کب کا سونا تھا۔

اس سونے آنگن کو جس مہمان کا انتظار تھا' آج وہی مہمان محبت کی پاربتی دیوی کے سمان حسن کے تمام ہتھیاروں سے لیس بڑے کروفر سے' بڑے ٹھاٹ سے اور پورے اعتماد کے ساتھ اس سونے آنگن میں براجمان ہو گئی۔

محبت کا پہلا تجربہ کتنا وحشت ناک ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی کر پائیں گے جو اس راہ پر خار کے سفر پر آبلہ پا نکلے ہوں---- ان امر لمحات میں جب ڈھاکہ کے آسمانوں پر سیاہ بدلیاں جھوم جھوم کر ناچ رہی تھیں۔

اور---- ان کی اوٹ میں چمکتی' کڑکتی رعد کسی بھی لمحے کارزار حیات کو نیست کر دینے پر تلی تھی۔ تب عظمیٰ نے بنگال کا روایتی سحر پھونک کر مجھے اپنی سیاہ زلفوں کا اسیر بنا لیا۔ موسلادھار بارش نے زور پکڑ لیا۔

قریباً" دس منٹ تک ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو چوری چھپے دیکھتے رہے۔ اس دوران متعدد مرتبہ میں نے عظمیٰ کی اور عظمیٰ نے میری چوری پکڑی۔



ہمارے درمیان ان لمحات میں صرف ایک دو فقروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ اس نے میرا نام پوچھا تھا اور میں نے بتا دیا--- اور بس!!

اس کے علاوہ ہم دونوں کے پاس کہنے کے لئے شاید کچھ اور تھا ہی نہیں۔

☆○☆

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔

بدلیاں پھٹ رہی تھیں۔

آسمان کا بدن آہستہ آہستہ ننگا ہونے لگا تھا۔

ریشم کے لچھے جیسی سفید بدلیاں اب تیز رفتاری سے پچھم کی سمت سفر کرنے لگی تھیں۔ شاید یہاں ان کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

"چلنا چاہیے---!" جانے کیوں میرے منہ سے نکلا اور میں نے اگنیشن میں کنجی گھما دی۔

"جی---!" عظمیٰ نے صرف اتنا ہی کہا اور آنکھیں جھکا لیں۔

جامنی رنگ کی ساڑھی کو اس نے مضبوطی سے اپنے گرد کس لیا تھا۔ شاید اس "آہنی قلعے" میں وہ خود کو لاشعوری طور پر محفوظ خیال کرنے لگی تھی۔ میں نے ایکسیلٹر پر دباؤ بڑھایا اور جیپ آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ بارش کا زور ضرور ٹوٹا تھا' لیکن وہ تھمی نہیں تھی۔ رہ رہ کر برستی تھی۔

"کہاں رہتی ہیں آپ---؟" میں نے اس مرتبہ تھوک نگلتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

"جی "فیل خانہ"---!" گہری آنکھوں نے پھر فسوں پھونکا۔

شام اس کی پلکوں پر جھک آئی تھی۔ شاید نذر گزار رہی تھی اس کی گہری بادامی آنکھوں کو۔ میں نے جیپ کا رخ نیو مارکیٹ کی طرف کر دیا۔ سڑک پر اکا دکا بسیں یا کاریں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے بار بار جیپ کے اندر سے ونڈ سکرین کو صاف کرنا پڑتا تھا کیونکہ باہر والے وائپر مسلسل چلنے کے باوجود اندر دھند سی چھا جاتی تھی۔ عظمیٰ نے شاید میری تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے یہ ذمہ داری اب خود سنبھال لی تھی کیونکہ اس مرتبہ جب میں نے ڈیش بورڈ پر رکھا کپڑا اٹھانا چاہا تو اس نے میرے ہاتھ پر پھر اچانک ہاتھ رکھ دیا۔

"میں صاف کرتی ہوں۔" شاید اپنی اس حرکت پر وہ خجالت محسوس کر رہی تھی۔

"شکریہ!" میں نے ہاتھ ہٹا لیا۔

ایک مرتبہ پھر میرے سارے بدن کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس زور سے ہونے والے چھناکے کی گونج فیل خانہ پہنچنے تک میرے اندر شور پیدا کرتی رہی۔

ڈھاکہ شہر کے ایک روایتی مکان کے سامنے ہماری جیپ رکی تو شام نے رات کا کفن اوڑھ لیا تھا۔ بارش نے پھر یکدم زور پکڑا۔ میں نے جیپ اس کے گھر کے دروازے کے بالکل ساتھ پارک کی تھی۔ ایک ذیلی سڑک سے ملحقہ کارنر والے مکان میں وہ رہتے تھے۔ عظمیٰ جیپ کے اندر بیٹھے ہوئے انگلی کے اشاروں کی مدد سے مجھے اس مکان تک لائی تھی۔

مکان کے سامنے میں نے جیپ روک دی، لیکن انجن بند نہ کیا۔

"آیئے ناں آپ بھی----!" اس نے مجھے گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔

"نہیں مجھے ذرا جلدی ہے۔" میں نے یوں ہی بہانہ کر دیا۔

"دیکھئے اس طرح تو میرے ممی پاپا بھی برا مانیں گے کہ آپ کو چائے پلائے بغیر ہی جانے دیا۔ آیئے ناں پلیز!!" اس کے کہنے کا انداز اتنا جان لیوا تھا کہ مجھ سے "ناں" نہ ہو سکی۔

عظمیٰ کے گھر کے برآمدے تک ہم دونوں ہی بھیگتے ہوئے پہنچے تھے۔ گھر کے دروازے سے برآمدے تک کا فاصلہ بمشکل پندرہ بیس فٹ رہا ہو گا، لیکن بارش اتنی زوردار تھی کہ پام کے بڑے بڑے پتوں کو بارش کے قطرے چھیدتے ہوئے زمین کی چھاتی پر رقص کر رہے تھے۔

برآمدے میں قدم رکھتے ہی ہم دونوں نے اپنے اپنے سر پر ٹکے بارش کے قطرے ہاتھ کی ہتھیلی سے صاف کرنے شروع کر دیئے۔ میں نے کن انکھیوں سے عظمیٰ کی طرف دیکھا۔ اس کے گھنیرے چمکدار بالوں سے بارش کے ننھے منے قطرے پھسل کر ماتھے اور گالوں پر آ گئے تھے---- یہ منظر ایسا دیدنی تھا کہ پھر میری آنکھوں نے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس کے چہرے پر سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔

اچانک بادل اتنی زور سے چنگھاڑا کہ ماحول کا کلیجہ دھڑک کر رہ گیا۔ نجانے کس طرح اچانک سہم کر ایک مرتبہ پھر عظمیٰ بے اختیار مجھ پر آ رہی۔ اس مرتبہ بادل کی چنگھاڑ پندرہ بیس سیکنڈ طویل تھی۔

سہمی ہوئی بادامی آنکھوں والی بنگالی ساحرہ اس دوران---- مسلسل کپکپاتی رہی۔ یہ کپکپاہٹ اب میرے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی تھی۔ مجھے اپنا دم ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا---- یہ اس کاتب سے اب تک تیسرا اور بھرپور حملہ تھا----!

اچانک بجلی کی سی سرعت سے وہ "سوری" کہہ کر مجھ سے الگ ہو گئی۔



اس کے سینے کا زیر و بم اس کے اندر چکراتے طوفانوں کی نشاندہی کرنے کے لیے کافی تھا۔

لیکن---- اس دوران جو "جوار بھاٹا" میرے اندر پھوٹا تھا، اس کی تباہ کاریوں کا احساس سوائے میرے اور کون کر سکتا تھا۔

برآمدے میں کھلنے والے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اندر داخل ہونے کے ساتھ ہی میری توجہ بارش اور بادلوں سے ہٹ کر اندر سے پیدا ہونے والی آوازوں پر لگ گئی۔ اندر کسی مرد اور عورت کی بنگالی میں گفتگو کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں---- میرے پلے کچھ نہ پڑ سکا۔

بمشکل دو منٹ بعد ہی دروازہ کھلا۔

ایک ڈھلتی عمر کے مدبر چہرے والے بنگالی نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا اور میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ "میرا نام پروفیسر شمس الدین ہے۔"

"کیپٹن شیرافگن----!" میں نے بھی اپنا تعارف کروا دیا۔

"کم ان ینگ مین۔" آدمی خاصا آزاد خیال دکھائی پڑتا تھا۔



تھوڑی دیر بعد ہم تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

"اس کی ماں یعنی میری بیوی----" پروفیسر نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔ "گھر پر نہیں ہے---- میرے علاوہ آج سب لوگ گھر سے باہر ہیں۔ اگلی مرتبہ تعارف ہو جائے گا۔" اس کے بے حد خوشگوار موڈ سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عظمیٰ نے شاید اسے اپنے ساتھ ہونے والے حادثے سے آگاہ نہیں کیا۔

بات ختم کرتے ہی پروفیسر نے خود ہی قہقہہ لگایا۔ میرے ہونٹوں پر بھی خوامخواہ مسکراہٹ رینگ گئی لیکن عظمیٰ سیریس رہی۔

اچانک ہی اس نے باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور بنگالی میں کچھ بولنا شروع کیا۔ مجھے اس کی گفتگو کی سمجھ تو نہ آئی، لیکن اس کی شفاف آنکھوں میں چمکتے موتی یہ بات سمجھانے کے لئے کافی تھے کہ وہ اپنے ساتھ گزرنے والے حادثے سے باپ کو آگاہ کر رہی ہے۔

پروفیسر اب خاصا سیریس نظر آ رہا تھا۔

بیٹی کی بات کے خاتمے پر اس نے انگریزی میں بڑے پرجوش انداز میں میرا شکریہ ادا کیا---- اس نے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کیے اور دوبارہ اپنے چہرے پر عینک جماتے ہوئے وہ بولا۔

"نوجوان میں واقعی تہ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم جانتے ہو ہم مڈل کلاس کے لوگوں کے پاس سوائے عزت کے اور ہوتا ہی کیا ہے۔ یہی ہمارا سرمایہ حیات ہے۔ بس یہی عزت---- سفید پوشی---- اف میرے خدایا جانے ہم سب کیوں حیوان بنے جا رہے ہیں----؟" وہ اپنا تعارف نہ بھی کرواتا تو مجھے علم ہو جاتا کہ یہ دانشور قسم کا پروفیسر ہے۔

"جاؤ بیٹی تم کافی بنا کر لاؤ----!" اس نے عظمیٰ سے کہا اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

ہم دونوں خاموش رہے۔

سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا بات کریں---- ماحول کی خاموشی اب مجھے کھلنے لگی تھی۔

پھر پروفیسر ہی نے ہمت کی۔ وہ مجھ سے میرے گھربار کے متعلق پوچھنے لگے اور سلسلہ گفتگو پھر ملکی حالات کی طرف مڑ گیا۔

سیاسی صورت حال پر پروفیسر شمس الدین کا تبصرہ بڑا محتاط تھا۔ وہ غیر جانبداری کا تاثر قائم رکھتے ہوئے بھی میرے سامنے پاکستان آرمی کی تعریف کر رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔

گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا جب سامنے کا دروازہ کھلا اور عظمیٰ ٹرالی گھسیٹتی اندر آ گئی۔

اس نے اپنی ساڑھی تبدیل کر لی تھی اور بال بھی سلیقے سے باندھ لیے تھے۔ اس لمحے مجھے اچانک ہی یوں لگا جیسے میں کسی دوسری دنیا کا باشندہ ہوں یا پھر عظمیٰ نے زمین پر جنم لے لیا ہے۔

مجھے ناریل کے جھنڈ میں کھڑی لڑکی کا وہ پورٹریٹ رہ رہ کر یاد آنے لگا جو میں نے کسی آرٹ کی نمائش میں دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تصویر والی لڑکی کے پس منظر میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

اور---- میری آنکھوں میں شام اتر رہی تھی۔

ڈھاکہ کی خوبصورت شام اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ---- میرے دریچہ دل پر دستک دینے لگی تھی۔

محبت کی وینس میرے دل کے نہالچے پر خراماں خراماں چلتی جا رہی تھی۔ اس کا میری سمت بڑھتا ہر قدم مجھے اپنے آپ سے ہوش و خرد کی دنیا سے دور کرتا چلا جا رہا تھا۔



"چینی کتنی لیں گے آپ----؟" ستارہ آنکھیں وا ہوئیں۔

"ایک چمچ----!" میں بمشکل کہہ پایا۔

"بس ایک!!" پروفیسر کو تو بات کا بہانہ چاہیے تھا۔ "یار کیا کرتے ہو جوان آدمی ہو۔ مجھے دیکھو اس عمر میں تین چمچ چینی لیتا ہوں ایک کپ میں۔" حسب معمول اپنی بات کے اختتام پر اس نے خود ہی قہقہہ لگایا۔

یوں لگتا تھا کہ اپنی بیٹی کے ساتھ گزرنے والے واقعات کا اس پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔

رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ ان لوگوں کے بضد ہونے کے باوجود میں نے وہاں کھانا نہیں کھایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب مجھے بھوک پیاس کا احساس رہا ہی نہیں تھا۔ روانگی پر عظمیٰ اور پروفیسر دونوں نے مجھ سے دوبارہ واپس آنے کا وعدہ لیا۔

پہلی ملاقات پر ہی عظمیٰ نے جس بے رحمی سے میرے جذبات کو جھنجھوڑا تھا' ہماری محبت کا آغاز ہی جس طوفانی انداز میں ہوا تھا----!

اس سے انجام کا اندازہ لگانا کچھ مشکل بھی نہیں تھا' لیکن تب میں تجزیہ نگار نہیں تھا یا پھر عملی زندگی میں شاید پہلی مرتبہ محبت کی گہری دلدل میں قدم رکھا تھا میں نے---- میری حالت تو اس پیراک کی سی تھی جس کو تربیت حاصل کیے بغیر پہلی ہی مرتبہ سمندر کی طوفانی لہروں میں اتر جانے پر مجبور ہونا پڑا ہو۔

اپنے آفس پہنچنے تک عظمیٰ میرے دل و دماغ پر چھائی رہی۔

میری تربیت عام فوجیوں سے ہٹ کر ہوئی تھی۔ خصوصاً" جو انٹیلی جنس کورس میں نے پاس کیے تھے ان کے ذریعے مجھے انسان شناسی کے فن پر قدرے دسترس ضرور حاصل ہو گئی تھی----!

مجھے عظمیٰ معصوم لڑکی ضرور لگی لیکن اس کا باپ----!

نجانے کیوں میں پروفیسر شمس الدین کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کر سکا---- مجھے یوں لگا جیسے اس نے وہ کچھ کہا ہے جو اس کے دل میں نہیں تھا۔ جیسے وہ مجھے خوش کرنے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔

میں نے ان تمام خیالات کو جلد ہی ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے نائب کی مدد سے اس علاقے کی صورت حال کو سمجھتا رہا۔ دیوار گیر نقشے پر مختلف مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں مشتبہ لوگ رہائش پذیر تھے۔

تین چار روز تک ہم اپنے علاقے کا سروے کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں اس روز میں نیومارکیٹ میں گھوم رہا تھا۔ دراصل میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ ایک مشتبہ شخص کا تعاقب کرتا یہاں تک آیا تھا۔ وہ شخص مارکیٹ میں آگیا۔ میں بھی یہیں موجود تھا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ اسے کہیں میرے متعلق شک نہ ہو جائے اور وہ محتاط نہ ہو جائے، میں نے اپنے صوبیدار کو جو مقامی بنگالی تھا۔ اپنی جگہ اس شخص کے تعاقب کا حکم دیا اور خود صورت حال سے قدرے لاتعلق ہو کر وہیں ایک بکسٹال پر رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔



اچانک ہی "ہیلو" کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
گردن موڑ کر میں نے بائیں طرف دیکھا اور پھر پتھر کا ہو کر رہ گیا---!
یہ عظمیٰ تھی---!
بنگال کے سر پر چڑھ کر بولنے والے جادو کی جیتی جاگتی تصویر---!
ہمالہ کی پراسرار دیوداسیوں کی طرح اس نے اپنے جوڑے میں سفید گجرے ٹانک رکھے تھے--- اس کے دونوں بازوؤں میں بھی چوڑیوں کی جگہ ایسے ہی گجرے دکھائی دے رہے تھے۔

اس موسم میں عموماً یہاں لڑکیاں پھولوں کے ایسے ہی زیورات استعمال کیا کرتی تھیں--- ایک مرتبہ پھر اس کے قرب کا احساس میرے لیے جان لیوا بننے لگا۔
"ہیلو---!" میں نے بھی جواباً کہا۔
"کمال ہے ہم آپ کے منتظر ہیں اور آپ آئے ہی نہیں---!" اس کی بادامی آنکھوں نے فسوں پھونکا۔
کاش میں اسے بتا سکتا کہ میں گیا ہی کہاں تھا۔ اس روز سے اب تک میں اس کے سحر سے آزاد ہی نہیں ہو سکا تھا۔
"میں ذرا مصروفیت........" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
ساتھ والی دکان سے ایک درمیانی عمر کی خاتون ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔
"ممی یہ ہیں شیرافگن---!" اس نے اپنی ماں سے میرا تعارف کرایا۔
اس کی بات سے مجھے بھی احساس ہوا کہ وہ میرا مکمل تعارف اپنی ماں سے کروا چکی



تھی۔ یہ سب ہی لوگ پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی والدہ بھی شکل سے کوئی پروفیسر دکھائی دیتی تھی۔ بعد میں میرے اس عندیے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ ایک مقامی سکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔
"جیتے رہو بیٹا--- کیسے ہو؟" اس نے روایتی انداز میں دعا دیتے ہوئے میری خیریت دریافت کی۔
"ہاں جی ٹھیک ہوں---!" میں نے مختصر جواب دیا۔ چاہتے ہوئے بھی میں اپنی نظروں کو عظمیٰ کے مسلسل طواف سے نہ روک سکا۔
"تم آئے نہیں، آؤ نہ کسی روز--- پروفیسر صاحب بھی تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔ ماں بیٹا کچھ باتیں کریں گے۔"
"جی ضرور آؤں گا---!" میں نے کہا۔
میرے انکار کے باوجود وہ مجھے ایک نزدیکی بار میں لے گئیں۔ ہم نے یہاں مشروبات پیے۔ بل میں نے زبردستی دیا۔ گو کہ عظمیٰ کی والدہ نے اس کا برا مانا کیوں کہ وہ میری میزبان تھیں، لیکن مجھے یہ گوارہ نہیں تھا۔
انہیں ایک رکشہ پر سوار کر کے میں لوٹ آیا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ابھی تک ان لوگوں نے میرا ایڈریس دریافت نہیں کیا تھا۔

# سَرحد کے اُس پار

حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ اب کسی بھی افسر کو اکیلے سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ خصوصاً" ہم جیسے "اسپیشل ڈیوٹی" افسروں کو تو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ چھاؤنی سے باہر ہرگز اکیلے نہ جائیں---- ہم لوگ عموماً" ایسے احکامات نظر انداز کر دیتے تھے کہ کون اپنے ساتھ باڈی گارڈوں کی فوج پالتا پھرے۔ بمشکل چند لمحے ہی تو میسر آتے تھے جنہیں حفاظتی اقدامات کی نذر کر دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اس روز جب میں شہر کی طرف آنے لگا تو کرنل صاحب نے ایک حوالدار کو زبردستی میرے ساتھ کر دیا۔ اب وہی میری جیپ میں موجود تھا۔ جیپ میں نے احتیاطاً" آفس سے قریباً" دو فرلانگ دور کھڑی کی تھی۔ واپس پہنچا تو جیپ میں لگے وائرلیس پر ایک پیغام میرا منتظر تھا۔

"ہوائی اڈے پر پہنچو۔"

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہمیں اچانک ہی احکامات ملا کرتے تھے' لیکن اس روز نہ جانے کیوں مجھے تشویش سی ہوئی۔ میں نے حوالدار کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنی گن سنبھالتا دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ابھی ہم لوگ ہوائی اڈے سے کچھ دور ہی تھے کہ اچانک حوالدار نے بریک لگائے اور جیپ الٹتے الٹتے بچی۔ یکے بعد دیگرے دو گولے زوردار دھماکوں کے ساتھ ہمارے قریب سے اپنے پیچھے چنگاریوں کی ایک لکیر چھوڑتے آگے گزر گئے۔

میں دل ہی دل میں حوالدار کی حاضر دماغی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ دوسرے ہی لمحے میں گن سمیت چھلانگ لگا کر جیپ سے باہر تھا۔ حوالدار نے بڑی پھرتی سے جیپ کا اسٹیئرنگ گھمایا اور جیپ ایک آڑ میں کھڑی کر کے اگلے حکم کا منتظر ہو گیا۔

کچھ دیر خاموشی طاری رہی' پھر ایک اور گولا ہمارے سروں پر سے پرواز کرتا گزر گیا۔ آواز سے ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ فائرنگ "مارٹر" سے کی جا رہی تھی جو میرے لیے ہی نہیں

بلکہ مجھ جیسے بہت سے لوگوں کے لئے تشویش کا باعث تھی۔
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تخریب کار شہر میں مارٹر گنیں کس طرح لے آئے ہیں؟ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ہمارے انتظامات میں انہیں کہیں بہت بڑا خلا نظر آ گیا تھا جسے ان لوگوں نے خوب خوب استعمال کیا۔ اس کے بعد کوئی گولا نہ پھٹا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم ان کے گرنے کی جگہ تک پہنچے تو میں نے اندازہ لگایا کہ فائرنگ کرنے والے یا تو بالکل نااہل تھے یا پھر ان کی گنوں میں "سائٹ" نصب نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ نشانہ صحیح نہیں لے پائے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ مضافاتی علاقے ہمارے کنٹرول سے بالکل باہر ہیں جس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہی لگا لیجئے کہ سدھیر گنج کا پاور سٹیشن جو ڈھاکہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے، تخریب کاروں کی کارروائیوں کا نشانہ بن گیا اور جب وہاں مغربی پاکستان سے عملہ منگوا کر مرمت کے لیے بھیجا گیا تو ان کے محافظوں کی موجودگی میں تخریب کاروں نے پانچوں ٹیکنیشنوں کو مار ڈالا۔
عموماً" مضافاتی علاقوں میں سفر کرتے ہوئے ہمیں یوں لگتا تھا جیسے ہم Enemy Territory سے گزر رہے ہوں۔ وہ افسران جن کے سر اندرون شہر نظم و نسق قائم رکھنے کی ذمہ داری ڈالی جاتی، خود درد سر میں مبتلا ہو کر رہ جاتے۔ مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے معصوم، بے گناہ، ورغلائے گئے، پوربو پاکستانی بھائیوں کے خلاف کارروائی کرتے ہچکچاتے یا پھر اس وقت ان پر فائرنگ کرتے جب دشمن عین سر پر آ جاتا۔ ان کی اس "رحم دلی" کے ہاتھوں اب تک سینکڑوں جوان بغیر ایک گولی فائر کیے شہید ہو چکے تھے۔
عموماً" سو یا ڈیڑھ سو افراد کی ایک کمپنی کے ذمے پورے شہر کی حفاظت ڈال دی جاتی۔ ان کے فرائض میں متعلقہ علاقوں کے ریڈیو اسٹیشنوں، بجلی گھر، تار گھر اور اسی نوعیت کی دوسری حساس قسم کی تنصیبات کی حفاظت کرنا اور انہیں دشمن کے ممکنہ حملے سے محفوظ رکھنا شامل ہوتا تھا۔ اول تو اتنے کم افراد سے اس بات کی توقع ہی رکھنا فوجی نقطہ نگاہ سے سوائے بیوقوفی کے اور کچھ نہیں۔ اس کے باوجود جوان معجزاتی طور پر اپنی ذمے داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہو رہے تھے۔

اس طرح مجھ جیسے افسران جنہیں زیادہ تر میدان عمل میں رکھا جاتا، خود کو خوش قسمت جانتے۔ ہم لوگ زیادہ کارروائیاں دشمن کے علاقے میں گھس کر ہی انجام دیا کرتے تھے یا عموماً" دشمن کے "بھرپور حملے" کا سامنا کرنے جاتے تھے۔ چھاؤنیوں میں ہمیں لمبے آپریشن



کے بعد محض ایک دو روز آرام کرنے ہی کے لیے بلایا جاتا تھا۔ یہ رعایت بھی کچھ خوش قسمتوں ہی کو حاصل تھی جن میں سے اتفاق سے ایک میں بھی تھا۔ ورنہ تو میرے کئی ساتھی افسران پچھلے کئی کئی مہینوں سے مستقل اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی کمپنی ہیڈکوارٹر یا بٹالین ہیڈکوارٹر میں ان کی خیریت کی اطلاع کسی محاذ سے آ جاتی یا ان سے الگ ہو کر یہاں پہنچنے والے شدید زخمیوں کے ذریعے ان کے حالات کا علم ہو جاتا۔ ایک ہی کمپنی یا بٹالین میں رہتے ہوئے جب کہ ہمارے فرائض کی نوعیت بھی قریباً" ایک ہی جیسی ہوتی، ہمیں مہینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔

☆○☆

ہوائی اڈے کی طرف جاتے ہوئے مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ معاملہ انتہائی اہم نوعیت کا ہے ورنہ تو بہرحال مجھے چھاؤنی واپس آنا ہی تھا۔ ان دنوں ڈھاکہ ایئرپورٹ کے نزدیک ہی ہم نے ایک "ہنگامی آپریشن روم" قائم کر رکھا تھا۔ اس ایمرجنسی آپریشن روم میں تازہ دم افسران کی ایک ٹیم موجود تھی۔ جسے ایک خصوصی اسکواڈ کی خدمات حاصل تھیں جو مختلف کمپنیوں کے جوانوں پر مشتمل تھا۔ میرا نام بھی اگلے ہی روز اس اسکواڈ میں بھیجا گیا تھا اور مجھے صبح وہیں رپورٹ کرنی تھی، لیکن صبح تک کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔
ایمرجنسی آپریشن روم کے باہر میرا استقبال ایف۔ آئی۔ یو کے ایک کرنل صاحب نے کیا۔ وہ جیپ رکتے ہی میرے نزدیک پہنچے اور مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کر کے حوالدار کو وہیں رکنے کا اشارہ کر کے میرا ہاتھ پکڑے مجھے ہنگامی دفاتر میں سے ایک دفتر میں لے آئے جہاں میرے انسٹرکٹر صاحب ہمارے منتظر تھے۔
"ہیلو ینگ مین! کیسے ہو؟" انہوں نے حسب سابق بے تکلفی سے میری کمر پر ہاتھ مار کر پوچھا۔
"فائن سر!"
"میں نے محسوس کیا تمہارا دل یہاں نہیں لگ رہا........" انہوں نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر اپنے لہجے کی شوخی برقرار رکھی۔
میں فوراً" سمجھ گیا کہ مجھے سرحد کے پار کوئی اہم مہم سونپی جا رہی ہے۔ انہیں علم تھا کہ دشمن کی نظروں کے سامنے اس کے درمیان رہ کر اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ ابھی مجھے "ایک مہم" سے واپس آئے بمشکل دس

پندرہ روز ہی گزرے تھے اور کمانڈوز ایسی ڈیوٹیاں عموماً "رضاکارانہ" انجام دیا کرتے تھے' لیکن اپنے وسائل کی کمیابی' افرادی قوت کی کمی اور حالات کی نزاکت میرے سامنے تھی۔ ان کی دانست میں مجھے دوبارہ بھارت بھیج کر وہ میرے ساتھ زیادتی کر رہے تھے حالانکہ میرے ذہن میں اس بات کا شائبہ تک نہ تھا۔ مجھے تو سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ "غازی یا شہید!"

مجھے علم تھا حالات کس نہج پر جا رہے ہیں اور میں ہی نہیں' خود میرے "سر" بھی مشین کی طرح دن رات کام میں جتے ہیں۔ مجھے تو آرام کی چند گھڑیاں میسر آ جاتی تھیں مگر ان کے لیے تو شاید اتنا وقت بھی نکال لینا ممکن نہیں تھا۔ دوران تربیت ہم روزانہ علی الصبح ورزش کے بعد ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ میجر صاحب ٹینس کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے زندگی میں اگر کوئی "غیر ضروری" مشغلہ اپنایا تھا تو وہ ٹینس ہی تھا۔ صبح و شام ٹریننگ سے فراغت پاتے ہی وہ ٹینس کورٹ کا رخ کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے ازراہ مذاق مجھ سے کہا تھا۔

"نوابزادے! مورچے میں بھی میرے ساتھ ریکٹ ہو گا۔"

اور آج حالات نے انہیں جس "کورٹ" میں دھکیلا تھا' وہاں انہیں ٹینس کھیلنے کی تو کیا سر کھجانے کی مہلت بھی میسر نہیں تھی۔

مجھے شرمندگی سی ہوئی کہ میرے عظیم استاد مجھ سے آنکھیں ملا کر بات کیوں نہیں کر پا رہے۔

"سر" میں نے اپنی ساری توانائیاں مجتمع کیں اور اپنے لہجے کو بے حد شوخ بنا کر انہیں مخاطب کیا۔ "خدا کا شکر ہے آپ نے میرے لیے تفریح کا کوئی موقع تو ڈھونڈا۔ یہاں تو روزانہ ٹھائیں ٹھائیں سن کر تنگ آ گئے ہیں۔ اگر اتفاق سے سونے کو چند گھڑیاں میسر آ ہی جائیں تو رات کو خواب میں بھی خود کو "مصروف جہاد" پاتے ہیں۔ وہاں کم از کم زندگی کی کوئی رنگینی سونگھنے کو تو میسر آتی ہے۔"

اپنی بات کے اختتام پر میں نے خود ہی ایک قہقہہ بھی اپنی دانست میں بلند کیا تھا' لیکن اس بات سے میں بخوبی آگاہ تھا کہ اس ہنسی کے کھوکھلے پن کا احساس مجھے ہی نہیں' میرے محترم استاد کو بھی ہے۔

وہ میرے قریب آئے۔ میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور بے اختیار مجھے سینے سے چمٹا لیا۔

"بیٹے! مجھے فخر ہے تم پر۔" انہوں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔



"سر! اول تو ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر میں کسی قابل ہوں بھی تو وہ صرف آپ کی مہربانی اور ریاضتوں کے طفیل۔" میں نے انکسار سے کہا۔

"جن استادوں کو تم جیسے شاگرد میسر آئیں بیٹا! انہیں خود پر فخر کرنا ہی چاہیے۔"

ان کی بات کے خاتمے پر ایف۔ آئی۔ یو کے کرنل صاحب خود ہی چائے کے برتن اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ ہم دونوں انہیں دیکھتے ہی مستعد ہو گئے' لیکن انہوں نے ہمیں "نارمل" ہونے کی ہدایت کی اور بڑی بے تکلفی سے ہنستے ہوئے چائے بنانے لگے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے چائے کی ایک ایک پیالی ہمیں تھمائی اور ہم دونوں کو ساتھ لیے ملحق کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ غالباً" ان کا دفتر تھا۔

میز پر کلکتہ شہر کا نقشہ بچھا پڑا تھا اور سرخ پنسل سے انہوں نے دو تین جگہ مارک کر رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے نقشے کا سرسری مطالعہ کرنے کو کہا' پھر مجھ سے گویا ہوئے۔

"جنٹل مین!" کرنل صاحب نے باری باری دو تین نشان زدہ جگہوں پر چھڑی کی نوک جماتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں وہ جگہیں جہاں اس شخص کے ملنے کے امکانات ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی میز کی دراز سے ایک تصویر نکالی۔ یہ نیپالی خدوخال رکھنے والے کسی شخص کی تصویر تھی۔ وہ کسی ریاست کا پرنس بنا سگار کے کش لگا رہا تھا۔ پس منظر کسی نائٹ کلب کا تھا۔ مجھے علم ہو گیا کہ ہمارے کسی ایجنٹ کے کیمرے نے انتہائی چالاکی سے تصویر کشی کی ہے۔

"یہ شخص ایک غیر ملکی ایجنسی کے لئے کام کر رہا ہے۔ اس ایجنسی کے لیے جسے مشرقی پاکستان میں بروئے کار آنے والی بھارتی اسٹریٹجی سے بہت زیادہ دلچسپی ہے اور جو اس سے مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ دوسری طرف یہ خاتون بھی ایسی ہی ایک غیر ملکی ایجنسی کی ایجنٹ ہے۔"

انہوں نے دوسری تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ خدا کی پناہ! ایسی عورت-----! ایک نظر اس پر ڈال کر تو واقعی ایمان ڈگمگانے لگتا تھا۔

"اصل میں تو یہ سب کچھ ہمارے کام کی چیزیں ہیں' لیکن حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ ہمیں کوئی بھی "لائن" ترتیب دینے کا وقت نہیں مل رہا۔ پھر اللہ کی مہربانی سے ہمیں اگر سب کچھ "کیا کرایا" میسر آ جائے تو ہم اپنے کسی ایجنٹ کی جان کا خطرہ کیوں خواہ مخواہ مول لیں۔" رک کر انہوں نے چائے کا گھونٹ اپنے حلق میں اتارا' پھر میز پر رکھے

پائپ میں تمباکو بھر کر اسے سلگانے لگے۔ "ہاں اس خاتون کا نام مس ریکھا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا---- "یہ نام ظاہر ہے اصلی نہیں ہو گا' لیکن آج کل یہ مس ریکھا کے نام ہی سے پہچانی جاتی ہے---- پٹاخہ عورت ہے۔" انہوں نے فوجیوں کے مخصوص لہجے میں قہقہہ لگا کر کہا---! "لیکن اس کے پاس خوبصورت جسم اور مکار ذہن کے علاوہ ایک اضافی خوبی بھی ہے۔" میں ہمہ تن گوش تھا۔ کرنل صاحب نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا۔ "مارشل آرٹ پر اسے بہترین عبور حاصل ہے۔ اس نے متعلقہ ایجنسی کے لیے نہ صرف بھارت بلکہ یورپ کے کئی ممالک میں بھی اہم خدمات انجام دی ہیں---- عورت کیا---- چنڈال ہے---- چنڈال! انسانی جان سے کھیلنا اس کا مشغلہ ہے---- اس سے ہوشیار رہنا۔ بہت ہوشیار!" انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

میں نے شکریہ کہہ کر تصویر انہیں لوٹا دی۔ یہ عورت میرے ذہن میں نقش ہو چکی تھی۔ اب میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

میں نے اسی نیپالی نقش و نگار والے "پرنس" کی تصویر دوبارہ اٹھائی اور اس کے خدوخال اپنے ذہن کی سلیٹ پر اتارنے لگا۔

"برخوردار" کرنل صاحب نے مسکراتے ہوئے پائپ سے اٹھتے دھوئیں کی اوٹ میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اصل میں اس "ماسٹر" کی محنت پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔ یہ کام کسی مقامی ایجنٹ کے ذریعے اس لیے ممکن نہیں کہ تم تو جانتے ہی ہو گے وہ سب "شریف قسم کے شہری" ہیں اور انتہائی ناگزیر حالات میں ہی اپنے ہاتھ پاؤں چلانے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ ان کے بزنس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ذرا مار دھاڑ سے اپنا دامن بچا کر ہی رکھیں۔ تمہیں البتہ وہ ہر قسم کی "اخلاقی" مدد ضرور بہم پہنچائیں گے۔" انہوں نے لفظ "اخلاقی" کچھ زیادہ ہی زور سے ادا کیا تھا۔

بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ میرے استاد بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

کرنل صاحب دوبارہ مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ان کی موجودگی کے تینوں پوائنٹ ہم نے "ریڈ لائن" کر رکھے ہیں اور ہمارے "دوست" سرگرمی سے ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں "پن پوائنٹ ایریا" تک پہنچائیں گے اور ہر پوائنٹ کے نزدیک "ڈیڈ ڈراپ" بھی انہوں نے مارک کر رکھے ہیں۔ تمہیں جس وقت وہاں داخل کیا جائے گا' ہمارا یہ دوست "سٹف" سمیت وہاں سے نکلنے کی



...ہیں ہو گا۔ اس بات سے بے خبر کہ ریکھا کے آدمی اس کے تعاقب میں ہیں۔ وہ اس کی ... پر ہاتھ ضائع کرنا چاہتی ہے۔"

"میرے دوست تمہیں ان دو بھیڑیوں میں سے کسی ایک کے منہ سے نوالہ چھین کر ... متعلقہ ایریا کے نزدیک مقررہ پوائنٹ پر "ڈی ڈی" (ڈیڈ ڈراپ) کرنا ہے' پھر وہاں سے ... بڑھتے ایک خاص جگہ تک پہنچنا ہے جس سے پہلے تمہیں مدد میسر نہیں آئے گی کیونکہ ہماری انٹیلی جنس کے کسی بھی مرحلے پر اس "کھیل" میں دخل انداز ہونے کے چانسز موجود ہیں اور ہم ان کے تعاقب کا خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رک کر میرے چہرے پر اپنی کہی ہوئی باتوں کا ردعمل تلاش کرنے لگے' پھر مطمئن ہو کر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئے:

"دوست! میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تمہارے سامنے تصویر کا دوسرا رخ پیش نہ کروں۔ یہ مشن صرف تمہاری صلاحیتوں پر بے حد اعتماد کرتے ہوئے تمہیں سونپا جا رہا ہے۔ اس کی اہمیت کاش میں تم پر واضح کر سکتا۔"

انہوں نے مجھے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔ میں بدستور مسکراتا رہا----!

"اس مرتبہ تم پیراٹروپر لینڈنگ کرو گے اور آج رات ہی ہم ہر معاملہ جلد از جلد نمٹا دینا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے اپنی بات ختم کر کے دوبارہ پائپ سلگایا اور مجھے مشن سے متعلق دیگر تفصیلات سے آگاہ کرنے لگے۔

عموماً" ایجنٹ کو مشن کی باریکیوں سے آگاہ نہیں کیا جاتا اور اسے صرف اس کے حصے کا متعلقہ کام ہی بتایا جاتا ہے' لیکن یہاں معاملہ الگ تھا---- وہ مجھے "اپنا" جان کر اعتماد میں لے رکھے تھے حالانکہ وہ اس کے پابند نہیں تھے۔



تھوڑی ہی دیر بعد میں تیز رفتاری سے جیپ دوڑاتا اپنے میس کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں سے فراغت پا کر میں دوبارہ وہیں جا پہنچا۔ رات کے دوسرے پہر تک میرے انسٹرکٹر میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی کرنل صاحب بھی ہماری گفتگو میں شریک ہو جاتے۔ ان کی نظریں بار بار گھڑی کی سوئیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں سویلین لباس میں ... پہنے اب ایک جیپ میں ان کے ہمراہ آن بیٹھا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہی ہمیں یہ حکم

جیسے ہی چھاتا تنا اور میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے مجھے اندھیرے میں چمکتی ٹارچ کی وہ روشنی دکھائی پڑی جو میرے استقبال کے لئے روشن کی گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی کے جلنے بجھنے کا عمل تین چار مرتبہ دہرایا گیا۔

میرے پاؤں زمین پر لگے تو ریت کا احساس ہوا۔ میں نے ساحل سمندر کے نزدیک لینڈنگ کی تھی۔ زمین پر گرتے ہی میں نے پیرا شوٹ سنبھالا۔ بڑی پھرتی سے خود کو اس کی ڈوریوں سے نجات دلائی اور سب سے پہلے اپنی پتلون میں اڑسے خنجر کی مدد سے زمین کھود کر اسے ریت میں دفن کر دیا۔

خنجر کو مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے، میں اندازے سے ٹارچ بردار کی سمت بڑھ گیا۔۔۔ اس خنجر پر پینٹ کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے چمکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں بلیوں کی طرح پنجوں کے بل ساحلی جھاڑیوں سے بچتا بچاتا ہوا چل رہا تھا۔

دس بارہ قدم چلنے کے بعد مجھے اپنے داہنے ہاتھ پر ٹارچ کی راہنمائی میسر آئی۔ نووارد بھی بڑے نپے تلے قدموں سے میری طرف آ رہا تھا۔

میں فوراً وہیں رک کر ایک سرکنڈے کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ میرا ہی راہبر ہے، لیکن خطرے کو نظر انداز کرنا یا تصویر کے منفی رخ سے روگردانی کرنا میرے لیے سم قاتل ثابت ہو سکتا تھا۔

اس کی بے آواز آہٹ جیسے ہی میرے نزدیک پہنچی، میں اچانک نکل کر اس کے سامنے آگیا اور دوسرے ہی لمحے میرا خنجر اس کی گردن پر تھا۔

"پہچان؟" میں نے غراہٹ نما سرگوشی کی۔

"بلیک برڈ!" اس کی پرسکون آواز سنائی دی۔

"سمت بتاؤ؟" میں نے دوبارہ وہی عمل دہرایا۔

"پچھم!"

"نمبر؟"

"زیرو!"

"ٹارگٹ؟"

"پرنس!"

جیسے ہی اس کے منہ سے آخری کوڈ ادا ہوا، میں نے معذرت کر کے خنجر دوبارہ وہیں اڑس لیا۔۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا رخ سمندر کی طرف تھا۔



تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک ایسے علاقے میں موجود تھے جو لمبی لمبی گھاس سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس گھاس میں ہم دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں دس پندرہ گز چلنے کے بعد ٹھہر گئے۔ نووارد کا چہرہ چاند کی روشنی میں اب میرے بالکل سامنے تھا اور میرے لیے کرنل صاحب کے کہنے کے مطابق بالکل اجنبی!

اس نے وہاں رکھا نائیلون کا ایک تھیلا کھولا اور اس میں سے کپڑے نکال کر مجھے تبدیل کرنے کا کہہ کر خود باہر نکل آیا۔ ان کپڑوں میں سے ماہی گیروں کی مخصوص بو آ رہی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ٹخنوں سے اونچا پائجامہ اور کرتا پہنا۔ خنجر کو بڑے حساب سے چھپایا اور اپنے کپڑے اسی تھیلے میں ٹھونس کر باہر آگیا۔

میرے دوست نے سب سے پہلے اس تھیلے میں اچھی طرح ریت اور گھاس پھونس ٹھونسا، پھر اسے سمندر کی پرشور لہروں کے حوالے کر دیا۔

صبح کاذب کی روشنی افق سے پھوٹنے لگی تھی۔۔۔۔ دور۔۔۔۔ حد نگاہ سے پرے جہاں آسمان اور سمندر کا پانی آپس میں بغلگیر ہوتے دکھائی دے رہے تھے، ایک سرخ رنگ کی پراسرار سی، پرتقدس سی روشنی سمندر کے نیلے پانیوں میں منعکس ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سمندر کے پانی کو آگ لگ گئی ہو۔

ہم لوگ سمندر کے کنارے کنارے سفر کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سورج کی خون رنگ ٹکیہ بھی ہمارے عقب سے نمودار ہونے لگی تھی۔ پھر روشنی کی لمبی لمبی لکیریں سمندر کے پرشور پانیوں پر جھلمل جھلمل کرنے لگیں۔

یہاں سے کچھ فاصلے پر اب جھونپڑیوں کی وہ قطاریں نمایاں ہونے لگی تھیں جہاں ہمیں پڑاؤ ڈالنا تھا۔ میرے ہمراہی نے مجھے راستے میں یہاں کے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔

میری پہچان۔

میرا پس منظر۔۔۔ پیش منظر۔

میرے عزائم۔

سب کچھ نیا تھا۔ میں اب بدمعاش قسم کا ماہی گیر تھا جو اکثر کچھ رقم لے کر سمگلروں کے لیے جان کی بازی لگا دیا کرتا تھا اور میرا ساتھی مجھے مقامی "دادا" کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا تھا۔

جب ہم جھونپڑیوں کے نزدیک پہنچے تو وہاں زندگی بیدار ہو چکی تھی۔ جس کا ثبوت ان اسٹیمروں اور لانچوں کے انجنوں کی پرشور آوازیں تھیں جو ساحل سمندر سے بندھے تھے اور

جن میں سوار ہو کر مچھیرے اب رزق کی تلاش میں پانی کھنگالنے جا رہے تھے۔

مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی کہ ہم بخوبی ان لوگوں کو نظر آ رہے تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی ہم میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔

"مسٹر رمیش!" میرے ہمراہی نے مجھے نئے نام سے مخاطب کیا۔ "بادی النظر میں یہی دکھائی پڑتا ہے کہ یہاں گنگو دادا کا مکمل کنٹرول ہے اور کوئی پرندہ بھی اس کے حکم کے بغیر پر نہیں مار سکتا۔۔۔۔ لیکن حقیقت میں ایسی بات نہیں، یہاں انٹیلی جنس کا جال بڑی مضبوطی سے بچھایا گیا ہے اور اپنی دانست میں انہوں نے اس میں کوئی خلا نہیں چھوڑا جس میں سے کوئی ایجنٹ نکل سکے۔" بات کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔۔۔۔!!

"شکریہ۔" میں اور کیا کہتا۔

یہ جھونپڑے ایک نیم دائرے کی شکل میں بنے ہوئے تھے اور سامنے کا حصہ سمندر کی طرف کھلتا تھا۔ میرا ہمراہی جس نے اپنا نام مجھے پانڈے بتایا تھا، مجھے دانستہ جھونپڑیوں کی پشت کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہاں سے قریباً دس بارہ گز دور مجھے کھڑا رہنے کا حکم دے کر وہ نیم دائرے کی طرف گھوم گئے۔

میں ایک چٹان پر بیٹھ کر بستی میں انگڑائی لیتی زندگی کا مشاہدہ کرنے لگا۔ ادھ ننگے پیٹ والی عورتیں اور ننگے بچے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ کہیں کہیں جھونپڑیوں سے دھوئیں کی لکیر اٹھ کر آسمان کی سمت پرواز کر رہی تھی۔ یہاں کے تمام مکینوں کی حالت سے ان کی عسرت بخوبی عیاں تھی۔

پانڈے کی واپسی بمشکل پانچ منٹ بعد ہی ہو گئی لیکن اکیلے نہیں، اس کے ساتھ دھوتی بنیان پہنے اور سر پر لال رنگ کے کپڑے کا پٹکا باندھے ایک سیاہ رنگ کا لحیم شحیم دیو نما آدمی بھی زمین پر اپنے پاؤں کی دھمک پیدا کرتا آ رہا تھا۔

میں محتاط ہو کر بیٹھ رہا۔ رہا سہا اطمینان تو پانڈے کی اس بات نے رخصت کر دیا تھا کہ یہاں انٹیلی جنس بھی سرگرم عمل ہے۔ میرے نزدیک پہنچ کر وہ تناور درخت کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔



"نمسکار" میں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اسے آداب کیا، لیکن وہ الف لیلہ کا جن بنا ایک ٹک مجھے گھورے چلا جا رہا تھا۔ شاید نظروں ہی نظروں میں مجھے تول کر میری اوقات



ان رہا تھا۔

"پنجاب کا ہے تو؟" قریباً ایک ڈیڑھ منٹ کی جان لیوا خاموشی کے بعد بالآخر اس نے راتے ہوئے زبان کھولی۔

"ہاں!" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"کس کے ساتھ کام کرتا ہے؟" دوبارہ اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں سمع خراشی کی۔

"تو کون ہے؟" میں سنبھل گیا۔

پانڈے کے چہرے سے کچھ اندازہ لگانا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سرد آنکھوں سے بار بار ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔

"ارے تو بولتا کیسا ہے؟" اس کی خوفناک آواز گونجی۔

"ہم ایسا ہی بولتا ہے دادا۔ دھندے کی بات کرو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

ابھی میری بات بمشکل مکمل ہی ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ بڑے زوردار طریقے سے گھوما۔۔۔۔ یہ الگ بات کہ میرے منہ پر پڑنے کے بجائے محض ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ کیونکہ میں اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ میری بات پر اس کا ممکنہ ردعمل بالکل میرے اندازے کے مطابق تھا۔ ابھی تک میں نے ایسے ساحلی بدمعاشوں کی فلمیں ہی دیکھی تھیں، اس مرتبہ یہ ڈراما حقیقی زندگی میں دیکھنے کا اتفاق بھی ہو گیا تھا۔

"بات منہ سے کرو استاد۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

پانڈے اس دوران ہم دونوں سے بالکل لاتعلق سا ایک طرف کھڑا رہا، جیسے یہ سب کچھ اس کی مرضی کے عین مطابق ہو رہا ہو۔ میری گفتگو کے انداز اور اس کے پہلے ہی حملے پر میرے اچانک اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے اس نے میرے متعلق یقیناً مثبت رائے قائم کر لی تھی۔۔۔۔!

میری بات کا جواب اس کے منہ سے نکلنے والے مغلظات کا طوفان تھا۔ اس کے ساتھ دھاڑتے ہوئے وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ارنے بھینسے کی طرح بڑی تیزی سے جھک کر میرے سینے پر ٹکر مارنی چاہی تھی۔

میں نے عین آخری لمحوں میں اپنی جگہ چھوڑی اور اس کی جھکی ہوئی گردن پر زوردار ہتھیلی جما دی۔۔۔۔ یہ ضرب میرے خیال میں ایسی تھی کہ اسے تگنی کا ناچ نچا دیتی، لیکن

اس کا ردعمل حیرت انگیز تھا۔ وہ محض اپنی جھونک میں آگے نکل گیا اور سنبھل کر دوبارہ مکہ تاننے میری سمت بڑھا۔

میں نے پہلے ہی وار سے اس کی جسمانی طاقت کا اندازہ لگا لیا تھا اور یہ رائے بھی قائم کر لی تھی کہ اگر اس کی ایک بھی بھرپور ضرب میرے جسم کے کسی حصے پر لگ گئی تو مجھے کئی دن تک اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔

"دفاع اور دھوکے سے حملہ۔۔۔۔! حریف کتنا ہی شہ زور کیوں نہ ہو، دماغ کو چھٹی کر دو۔ اس کے خلاف دفاع کرو۔ اسے اسی دھوکے میں رکھو کہ تم اس کی ضربات سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور جیسے ہی وہ تمہارے داؤ پر آئے، اپنی سی کر گزرو۔" میرے خضر صورت استاد نے راہنمائی کی۔

میں نے اس کے ہاتھ گھومنے کا انتظار کیا اور عین آخری لمحوں میں نیچے جھک گیا۔ حملہ آور کا بازو پھر ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ پے در پے ناکامیوں سے اس کی جھنجلاہٹ خاصی بڑھ چکی تھی اور میرے لیے یہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ یہی تو میں چاہتا تھا کہ وہ کسی طور جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر کوئی غلط حرکت کرے۔

اس نے وہی کیا اور کسی ساحلی زبان میں گالیاں بکتا دونوں ہاتھ پھیلائے میری طرف اس طرح بڑھنے لگا جیسے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر بھینچ ڈالے گا۔ اس کی دانست میں، میں پھر وہی حملے سے بچنے والی حرکت دہرانے جا رہا تھا۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں بھی اس پر حملہ کر سکتا ہوں اور یہی غلط فہمی اسے مار گئی۔

میں نے اس کے اور اپنے درمیان مناسب فاصلہ قائم ہوتے ہی اپنی جگہ سے اچھل کر اپنی پوری قوت سے فلائنگ کک ماری اور دونوں ٹانگیں اتنی زور سے اس کے سینے پر ماریں کہ وہاں سے اچھی خاصی آواز بلند ہوئی تھی۔

حملہ آور پیچھے کی طرف جھکا، لیکن زمین پر گرنے سے پہلے ہی اس نے سنبھل کر اٹھنا چاہا۔ اب میں اسے مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ابھی وہ بمشکل مکمل دھڑ سیدھا کر پایا تھا کہ اس کے بائیں پہلو پر میں نے اچھل کر دونوں پاؤں بڑے زوردار طریقے سے جما دیئے۔

حملہ آور تڑپ کر دائیں پہلو کی طرف آیا۔ میں اپنی جگہ سے جست لگا کر اس کی پشت پر آ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے صورت حال کا علم ہو، میری دونوں کہنیوں کی زوردار ضرب نے اس کی پسلیاں بجا دیں اور وہ منہ کے بل زمین پر جا گرا۔



"رک جاؤ!" قبل اس کے کہ میں اگلا داؤ آزماؤں، ایک زوردار آواز نے مجھے وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔

ہم دونوں ہی اپنی لڑائی میں اس سیاہ رنگ کے چھریرے جسم اور سفید سر والے ماہی گیر کی طرف توجہ نہ دے سکے جو بڑے وقار سے ہم دونوں پر آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔ وہ شاید انہی جھونپڑیوں سے نکل کر آیا تھا۔

"گنگو داوا!" پانڈے نے اسے قریبا" جھکتے ہوئے نمسکار کیا۔

"جے بھوانی کی۔" میں نے بھی ہاتھ جوڑتے ہوئے اسے نمسکار کیا۔

"کالیا!" اس نے ہم دونوں کے سلام کا جواب دینے کی بجائے اسی دیو کو مخاطب کیا جو اپنے پاؤں پر کھڑا مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"مہمانوں کے ناشتے کا بندوبست کر۔"

اور حملہ آور جس کا نام کالیا تھا، اس کے سامنے قریبا" کورنش بجا لاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

"کیا نام ہے تیرا؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"رمیش۔۔۔!" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ادھر کب سے ہو؟"

"پچھلے تین سال سے!"

"ہاتھ پاؤں کا اچھا ہے۔" وہ میرے بجائے پانڈے سے مخاطب ہوا۔ "گنگو کھلے ہاتھ پیروں کی قدر کرتا ہے پانڈے۔"

"دیا ہے مہاراج کی۔" پانڈے نے بڑے انکسار سے کہا۔

"آؤ وہیں باتیں کریں گے۔" اس نے ہم دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔



"ویل ڈن۔" پانڈے نے میرے نزدیک پہنچ کر سرگوشی کی اور مجھ سے پرے ہٹ گیا۔

ہم لوگ گنگو داوا کے تعاقب میں جھونپڑیوں کی بستی میں داخل ہوئے۔ اسے دیکھتے ہی وہاں موجود عورتیں اور بچے مودب ہو کر ایک طرف ہٹ گئے۔ بالکل ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ ان کی ننھی منی ریاست کا شہنشاہ ہے جس کی سواری کو گزرنے کے لیے وہ لوگ

راستہ دے رہے تھے۔۔۔۔ لیکن مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ:

ان کے اس احترام کے پیچھے یقیناً خوف کا جذبہ کارفرما تھا جس کا اظہار ان کے سہمے ہوئے چہروں سے ہو رہا تھا۔ واقعی گنگو یہاں کا "دادا" تھا اور عام قسم کے "دادا" سے بالکل الگ تھلگ۔ شاید کالیا کے ذریعے وہ آنے والوں کے "ہاتھ پاؤں" ٹیسٹ کروایا کرتا تھا اور میرا پہلا ہی تاثر بھرپور اور اثر انگیز تھا۔

ہم دونوں اس کے پیچھے نسبتاً ایک بڑے جھونپڑے میں داخل ہوئے جس کی دیواریں پتھروں کی بنی ہوئی تھیں اور چھت پر گھاس پھونس ڈال کر لیپا پوتی کر کے کام چلایا گیا تھا۔

"بیٹھو۔" گنگو دادا نے دیوار سے لگے ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا۔

ہم دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سروں پر جدید ترین آٹومیٹک رائفلیں دیوار میں لگی کھونٹیوں سے لٹک رہی تھیں۔ اس جھونپڑے کے باہر کوئی پہرے دار نہیں تھا نہ ہی ہمیں راستے میں کوئی خوفناک شکل والا باڈی گارڈ دکھائی دیا۔ بنچ کے سامنے بان کے کچھ مونڈھے پڑے تھے جن میں سے ایک پر وہ بیٹھ گیا۔

"کیا نام بتایا تھا؟" اس نے بیٹھتے ہی اچانک پوچھا۔

"رمیش۔" میں نے دوبارہ کہا۔

"خیر نام میں کیا رکھا ہے۔ بات تو کام کی ہے۔ تیرے ہاتھ بتاتے ہیں تو نے مار کٹائی کی کوئی "گپت ودیا" (خفیہ تعلیم) حاصل کی ہے۔ کون ہے تیرا گرو؟"

"بچپن ہی میں گھر سے نکل گیا تھا دادا۔ ایک جاپانی جہاز پر دو سال گزارے ہیں۔ وہ لوگ ادھر ہمارے ہی علاقے میں کسی دادا سے مل کر دھندا کرتے تھے۔ جہاز کا نائب کپتان ایک بوڑھا مگر حیرت انگیز قوتوں کا مالک تھا۔ "باشی کا" نام تھا اس کا۔ مجھ پر وہ بڑا مہربان تھا۔ اس نے مجھے تربیت دینا شروع کی۔ شروع شروع میں تو میرا من نہ لگا۔ سوچا بھاگ جاؤں لیکن اگلی زندگی کے لیے مفید جان کر لگا رہا۔ باشی کا ہی میرا گرو تھا۔ ایک روز کیبن میں سونے کے بعد اس نے "ہاراکاری" کر لی۔" میں نے فوراً ہی اسے رٹی رٹائی کہانی سنا دی۔

"کیا کر لی؟" گنگو دادا کو دلچسپی پیدا ہوئی۔

"مقدس آتم ہتھیا (خودکشی)۔ وہ لوگ تلوار سے اپنا پیٹ چاک کر کے اپنے دیوتاؤں کے حضور "بلی" دیا کرتے ہیں۔" میں نے ہاراکاری کی وضاحت کی۔

"گرو کی موت کے بمشکل دس بارہ دن بعد ہی میں وہاں سے بھاگ آیا۔ اس کے بعد سے یہیں ہوں۔ اس فن کے ذریعے ہی روٹی کما رہا ہوں۔"



میری بات ابھی مکمل ہی ہوئی تھی جب میں نے کالیا کو جھک کر اندر آتے دیکھا۔ وہ ایک بڑی ٹرے اٹھائے ہوئے تھا جس میں "مہذب دنیا کا ناشتہ" دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے گنگو دادا مجھے بنا رہا ہو۔

کالیا نے بنچ کے سامنے رکھے لوہے کی میز پر ناشتہ چن دیا۔ دادا نے اپنا مونڈھا نزدیک کر دیا اور ہم ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتہ کرتے ہوئے میں انتہائی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"شراب کون سی پیتا ہے؟" گنگو دادا نے اچانک سوال داغا۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"مطلب؟" گنگو نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے دادا کہ اپن کو گرو نے چھوکری اور شراب کے نزدیک بھی پھٹکنے سے منع کیا تھا اور گرو کے حکم کا پالن کرنا اپن کا فرض ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تو کبھی مار نہیں کھائے گا۔" گنگو دادا نے بڑی فلسفیانہ قسم کی پیش گوئی کی۔

ناشتہ ہم تینوں نے ہی ڈٹ کر کیا تھا۔ اس کے بعد گنگو دادا نے پانڈے کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں شکاری باز کی طرح مجھ پر گڑی تھیں۔ اس نے مجھے میری ممکنہ ڈیوٹی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں اس کے معیار پر پورا اترا ہوں۔ وہ مجھے میری توقع سے بڑھ کر کام کا معاوضہ دے گا۔



گنگو دادا سے ہم لوگ اگلے چند روز تک کی چھٹی لے کر الگ ہو گئے۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے مجھے پانچ ہزار روپے ایڈوانس دیئے تھے تاکہ میں وعدے سے منحرف نہ ہو جاؤں۔ میں نے روپے اپنے کرتے کی جیب میں ٹھونستے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"دادا آج سے رمیش تیرا غلام بن گیا۔" اور اس کے بعد زندگی بھر کبھی اس سے نہ ملا۔ ممکن ہے پانڈے بھی اس کے بعد گنگو دادا سے کبھی نہ ملا ہو یا گر ملا بھی ہو تو اس نے کسی بحری جھڑپ میں میری موت کی کہانی اسے سنا دی ہو گی اور اسے مطمئن کر دیا ہو گا۔



پانڈے مجھے شہر تک بڑی آسانی سے لے آیا تھا۔ ہمارا قیام کلکتہ کے ایک پرانے محلے میں تھا جہاں ایک کمرہ ہمارے لیے موجود تھا۔ شام تک میں اس کمرے میں گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔ شام کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو وہاں پانڈے کے علاوہ ایک اور "ذات شریف"

بھی موجود تھے اور یہ تھے یہاں کے اسٹیشن سپائی ماسٹر جو عمر میں مجھ سے بمشکل تین چار سال بڑے تھے۔

"دیکھو بھائی یہاں آرمی والا ڈسپلن نہیں چلے گا نہ زیادہ تکلف برتنے کی ضرورت ہے۔ مجھے تم مسٹر ناگرک کے نام سے پکار سکتے ہو۔"

انہوں نے مجھ سے مصافحہ کرنے اور اپنی شناخت کروانے کے بعد بڑی بے تکلفی سے کہا اور میں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔

دراصل "سپائی ماسٹر" کا کام کرنے کا اپنا طریق کار ہوتا ہے۔ یہ میری دنیا نہیں تھی۔ مجھے تو سوئے اتفاق سے اس دنیا میں آنا پڑا تھا۔ بالکل اس خلائی جہاز کے مسافروں کی طرح جو اپنے سفر کے دوران خراب موسمی حالات کی وجہ سے اپنے مطلوبہ سیارے کے بجائے کسی دوسرے سیارے پر لینڈ کر جائیں۔

"او۔کے مسٹر ناگرک۔ جیسا آپ پسند فرمائیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ چلے گا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا جوان اب اٹھو اور فوراً نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ ہم ایک شاندار ہوٹل میں ڈنر کریں گے۔"

"او۔کے!" کہہ کر میں نے اپنے اوڑھی ہوئی چادر ایک طرف پھینکی اور اس مختصر سے غسل خانے میں جا گھسا جو اس کمرے کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد جب میں ایک معزز شہری کے روپ میں ڈنر سوٹ پہن کر تیار ہو چکا تھا تو مسٹر ناگرک وہاں سے غائب تھے۔ پانڈے مجھے اس محلے کی مختلف گلیوں میں گھماتا بالآخر اس سڑک پر لے آیا جہاں ایک کونے میں ایک۔۔۔۔ شاندار فلیٹ کار میں میرے "ماسٹر" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے میرے منتظر تھے۔

اگلا دروازہ کھول کر میں ان کے برابر بیٹھ گیا۔

پانڈے وہیں سے ہی رخصت ہو گیا۔ روانگی کے وقت میں اپنا خنجر چھپانا نہیں بھولا تھا۔ مجھے پستول سے زیادہ اپنی خنجر بازی پر اعتماد تھا کیونکہ مجھے اس کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ دوران تربیت میں نے کبھی "ٹارگٹ" کو ہٹ کرتے ہوئے دھوکہ نہیں کھایا تھا۔ مجھے خدا کے فضل سے اپنی ذات پر اعتماد تھا کہ اب بھی ایسا نہیں ہو گا۔

دروازہ بند ہوتے ہی مسٹر ناگرک نے گاڑی سٹارٹ کی اور دوسرے ہی لمحے ہم تیز رفتاری سے اس پہلے پوائنٹ کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے جہاں ہمارے نیپالی دوست کے پائے جانے کے امکانات تھے۔ شہر کی ماڈرن آبادی کی ایک کوٹھی کے سامنے رک کر مسٹر



ناگرک نے وہاں مجھے ایک ڈی۔ڈی (ڈیڈ ڈراپ) کرنے کی جگہ دکھائی۔

اسی طرح دوسرا اور پھر تیسرا ٹھکانہ اور وہاں ڈیڈ ڈراپ پوائنٹ ہم نے مارک کیے۔ دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد ہماری یہ مہم اپنے اختتام کو پہنچی۔ اب ہمارا رخ شہر کے ایک شاندار ہوٹل کی طرف تھا جہاں بقول مسٹر ناگرک کے ہم ڈنر کھانے جا رہے تھے۔ روانگی سے پہلے ہم نے ڈنر سوٹ ہی پہنے تھے۔

لیکن کیا اس ہوٹل تک جانے کا مقصد محض شکم پری ہی تھا؟ یہ تھا وہ سوال جو مجھے سارے راستے تنگ کرتا آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہم وہاں صرف کھانا کھانے نہیں جا رہے، لیکن مسٹر ناگرک سے کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر کام کی کوئی بات ہوتی تو وہ خود مجھے اس سے آگاہ کر دیتے۔ جو بات انہوں نے خود مجھے نہیں بتائی وہ میرے پوچھنے پر بھی نہیں بتائیں گے۔

اس بزنس کا یہی بہترین اصول تھا۔۔۔۔!



ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ہمارا استقبال ایک خوبصورت حوا زادی نے کیا جس نے اپنے مہین لباس میں اپنے جسم کی مکمل نمائش سجا رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے محبت کے خمار کے نہیں، شراب کے نشے کی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ موصوفہ "آؤٹ" ہونے کے قریب ہی تھیں جب اتفاق سے ان کے "ہنی" تشریف لے آئے۔

"اوہ! یور آر ٹو لیٹ ہنی۔" اس نے مسٹر ناگرک کے گلے کا ہار بنتے ہوئے کہا۔

"ایکسکیوز می ڈارلنگ۔ میرے دوست کی فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی۔" انہوں نے اپنے دوست یعنی مجھ غریب کی طرف اشارہ کیا تو وہ ان کے پہلو سے الگ ہو کر میری سمت لپکی۔

"رمیش" میں نے دور ہی سے ہاتھ بڑھا دیا۔

"شاردا" اس نے میرا ہاتھ تھاما اور جھک کر اپنا مکمل تعارف کروا دیا۔ اس سے پہلے کیونکہ مجھے ایسی "شارداؤں" کے متعلق "بریفنگ" ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس کے جھکنے سے جو بجلی اس کے گریبان سے نکل کر میرے خرمن دل کی طرف لپکی تھی، اس کی تباہ کاریوں سے میں مکمل محفوظ رہا کیونکہ میں اس سلسلے میں بالکل غیر موصل دھات بن چکا تھا جس میں سے بجلی کی لہروں کے گزرنے اور اثر انداز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا تھا۔

"مس شاردا بہت اچھی ڈانسر ہیں۔" ناگرک نے ایک میز کی سمت قدم بڑھائے۔

"اوہ!" میں نے اچانک رک کر اس کے اینگلو سیکسن قسم کے سراپے پر آنکھیں جما کر لفنگوں کی طرح سسکاری لی۔

مسٹر ناگرک نے مسکرا کر مجھے اس شاندار اداکاری پر داد دی۔

"مسٹر رمیش پنجاب کے بہت بڑے مل اونر ہیں۔ کپڑے کی چھ ملوں کے مالک ہیں۔ ہر پہاڑی مقام پر ان کے کاٹیج ہیں۔" انہوں نے میرا تعارف کروایا۔

اب شاردا کی باری تھی----!

"اوہ! لولی سویٹ----!" اس نے اپنی دانست میں اچانک خود کو جھٹکا دے کر میرا جھٹکا ہی کر ڈالا تھا۔

ہم تینوں ایک میز کے گرد جو پہلے ہی سے "ریزرو" تھی بیٹھ گئے۔ مسٹر ناگرک نے بیرے کو پر تکلف کھانے کا آرڈر دیا اور ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔ وہ مجھ سے "ڈلہوزی والے خوبصورت بنگلے" کی باتیں کر رہے تھے جو میں نے دوستوں کے ساتھ گلچھرے اڑانے کے لیے حال ہی میں خریدا تھا۔ انہوں نے میری امارت کا اتنا بھرپور اور شاندار نقشہ کھینچا کہ شاردا جیسی لڑکی تو کیا خود میں اپنے آپ کو برلا اور ٹاٹا قسم کی کوئی چیز سمجھنے لگا تھا۔

دوران گفتگو شاردا اپنی کہنیاں میز پر جمائے اس انداز میں جھک کر میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی کہ مجھے کسی بھی لمحے پھسلنے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔

کھانا لگا۔ شاردا نے کھانے سے پہلے میرے لیے "ڈرنک" تجویز کرنا چاہا تو مسٹر ناگرک نے اسے منع کر دیا۔

"تین مہینے کا برت رکھا ہوا ہے پنڈت جی نے۔"

"ارے یار! کیا بتاؤں اب تو ایک پل گزارنا مشکل ہے، لیکن اس سالے ڈاکٹر نے بری طرح ڈرایا ہے مجھے۔" میں نے مجبوری ظاہر کی۔

"مسٹر رمیش واقعی مرنے کے موڈ میں آ گئے تھے۔ پینے کے معاملے میں یہ بھی تمہاری طرح بلانوش ہیں۔" ناگرک اس کی طرف پلٹا۔

"اوہ----!" شاردا کی سسکاری بڑی خطرناک قسم کی تھی۔

ہم لوگ کھانا کھا ہی رہے تھے جب ڈائننگ ہال سے ایک اجنبی شخصیت اندر داخل ہوئی جسے دیکھ کر چونک اٹھنا بالکل فطری فعل تھا۔ یہ ہمارا وہی نیپالی دوست تھا جسے میں پرنس کے



نام سے جانتا تھا۔ مسٹر ناگرک نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے احتیاط ملحوظ خاطر رکھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے شرمندگی محسوس ہوئی۔ واقعی ایک لمحے کے لیے میں ابنارمل ہوا تھا، لیکن دوسرے ہی لمحے میں حقائق کی دنیا میں لوٹ آیا۔

"مسٹر رمیش یہاں ایک بڑے اہم کام سے آئے ہیں۔" مسٹر ناگرک نے بالآخر مطلب کی گفتگو کا آغاز کر دیا۔

"کیا کام؟" شاردا نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"میرا خیال ہے کہیں اور چل کر گفتگو کی جائے۔" میں نے بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"ہاں۔ جیسا آپ پسند فرمائیں۔" شاردا بولی۔

"کہاں چلا جائے؟" مسٹر ناگرک نے آہستگی سے کہا۔

"میرا کمرہ حاضر ہے اگر مسٹر رمیش پسند فرمائیں؟"

"اوہ۔ تھینک یو ڈارلنگ۔" مسٹر ناگرک نے کہا۔



بل میں نے خود ادا کیا اور بیرے کو اس کے ساتھ اتنی بڑی ٹپ دی کہ شاردا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہم وہاں سے اٹھ کر شاردا کے کمرے میں چلے آئے جو اس کے نام سے ہمیشہ بک رہتا تھا کہ ایسے ہی کمرے اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھے۔ وہ بڑے اونچے پیمانے کی طوائف تھی۔ مسٹر ناگرک سے اس کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کا تو مجھے علم نہیں تھا، لیکن یہ بات میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ جس منصوبے پر ہم دونوں عمل کرنے جا رہے تھے----!

وہ یہاں آنے کے بعد ان کے ذہن میں آیا تھا ورنہ وہ راستے میں مجھے تھوڑا بہت اشارتاً ہی بریف کر دیتے۔

کمرے میں نصب ٹیلی فون پر شاردا نے ہمارے لیے کافی منگوائی۔

"مسٹر رمیش بزنس مین ہیں۔" انہوں نے کافی آنے کے بعد گفتگو کا آغاز کیا۔

"بدقسمتی سے ان کو ایک شخص بزنس میں نقصان پہنچانے پر تلا ہوا ہے۔ تم اسے جانتی ہو شاردا۔ پرنس دھن بہادر۔"

مسٹر ناگرک نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

شاردا کے ساتھ میں بھی ہمہ تن گوش تھا۔

"اوہ وہی نیپالی بیوقوف۔" شاردا نے ہنستے ہوئے کہا۔

معاملہ دور تک پہنچا ہوا تھا۔۔۔۔۔!!

"ہاں! لیکن اس کے متعلق ایسی غلط رائے کبھی قائم نہ کرنا۔ وہ بہت مکار ہے۔ اگر اس نے کبھی مجھے دیکھا ہوتا تو میں اس ہوٹل کا رخ بھی نہ کرتا۔ اسے یہ بھی علم نہیں کہ وہ جس کنٹریکٹر کے ٹینڈر منسوخ کروا رہا ہے وہ اصل میں، میں ہوں۔ وہ کسی اگروال کو جو میرا منیجر ہے اس فرم کا مالک سمجھتا ہے۔ میں اسے کھٹمنڈو سے جانتا ہوں۔ بڑا حرام خور ہے یہ۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر رمیش شاردا بجلی ہے بجلی۔" ناگرک نے اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ہم ڈلہوزی والی تفریح گاہ پر پہلی محفل مس شاردا کے اعزاز میں منعقد کریں گے۔" میں نے پکے تماش بینوں کی طرح دانت نکالے۔۔۔۔۔!

"اوہ تھینک یو۔" شاردا جھوم اٹھی۔

اس نے کافی کا مگ ایک طرف رکھتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "مسٹر رمیش ایسے کئی ہوشیار اور مکار میری جوتیاں چاٹتے ہیں۔ آپ آزما دیکھیے۔"

"دیکھ لو اس دفعہ معاملہ ذرا سخت ہے، کہیں مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔" ناگرک نے اس کو بڑا واہیات سا اشارہ کیا۔

"اوہ ڈارلنگ اس سے پہلے کتنی مرتبہ میں ناکام رہی ہوں؟" شاردا نے اس کے پہلو سے چمٹتے ہوئے کہا۔

"وہ اور قسم کی مہمیں تھی ڈارلنگ۔" ناگرک اسے پکا کر رہا تھا۔

"شاردا سے کوئی مائی کا لال بچ نہیں سکتا۔ مجھے کرنا کیا ہو گا؟" اس نے بڑے پرعزم لہجے میں بات کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے ناگرک یار! تمہاری دوست واقعی قابل اعتماد ہے۔" میں نے مسٹر ناگرک کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

نجانے اس کے ذہن نے کیا نقشہ ترتیب دیا تھا۔ میں خوامخواہ بات بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ انہوں نے صرف چند سیکنڈ کے لیے سوچا پھر گلا صاف کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"کل رات ایک بڑے کنٹریکٹ سے متعلق خفیہ فائلیں لے کر ایک شخص پرنس دھن



ادر سے ملنے آ رہا ہے۔ تم اس سے چپک جاؤ۔ دونوں کو مشروب میں یا کسی اور طریقے سے صرف بے ہوشی کی دوائی ملا کر پلا دو اور بریف کیس اٹھا کر لے آؤ۔ باہر کار میں ہم تمہارے منتظر ہوں گے۔۔۔۔۔!" بالآخر انہوں نے آخری پتہ بھی شاردا کی طرف پھینک دیا۔

"یہ ہے تمہارا ایڈوانس۔" میں نے دس ہزار روپیہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ شاردا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ حیرت سے کبھی روپوں اور کبھی میری اور ناگرک کی طرف دیکھنے لگی۔

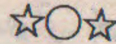
"یہ اس انعام کا حصہ ہے جو تمہیں اس کارنامے کے بعد ملے گا۔"

میں نے اسے مزید حیرتوں کے سمندر میں غوطے دیئے۔

"مسٹر رمیش آپ کو شاردا مایوس نہیں کرے گی۔" اس نے نوٹوں کا بنڈل چوم کر اٹھایا اور بڑی سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا۔

ہم دونوں اسے اس سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں سے آگاہ کرتے رہے اور مختلف کاش بھی ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے مقرر کر لیے۔ جانے سے پہلے مسٹر ناگرک نے اسے بے رنگ سا سفوف دیا جو اس نے نیپالی پرنس دھن بہادر کے حلق میں انڈیلنا تھا اور ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

ہمیں رخصت کرنے کے بعد شاردا نے ڈائننگ ہال کا رخ ہی کیا تھا۔



"خدا کرے آگے بھی مسائل اسی طرح طے ہو جائیں۔" باہر نکل کر کار میں بیٹھتے ہوئے مسٹر ناگرک نے مجھے کہا۔

میں صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ سارے راستے میں ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی کی داد دیتا آیا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اس حرافہ کو شیشے میں اتارا تھا۔ گو کہ اس سے پہلے بھی اس نے مسٹر ناگرک کے لیے کچھ کام کیے تھے جس کا اندازہ میں نے اس کی گفتگو سے بخوبی لگا لیا تھا اور اس بات کا بھی مجھے احساس ہو چلا تھا کہ مسٹر ناگرک کا طریق واردات انتہائی معصومانہ ہے۔۔۔۔۔! وہ شاردا کو بالکل اندھیرے میں رکھ کر اس سے بڑے بڑے کام کروا لیتے تھے۔ ممکن ہے اسے اس سلسلے میں لمبی ادائیگی بھی کی جاتی ہو، لیکن وہ اتنے اونچے درجے کی عورت تھی کہ صرف پیسے ہی کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزرنے والی نہیں تھی۔ یقیناً اس میں ناگرک اور اس کی دوستی کا بھی عمل دخل رہا ہو گا۔

وہ کامیاب سپائی ماسٹر تھا۔۔۔۔!

وہ لوگ جانے کب سے نیپالی کا تعاقب کر رہے تھے اور ان معاملات میں کتنی دور تک ان کی نظر تھی۔ مجھے ان لوگوں میں چونکہ اس سے پہلے بھی کام کرنے کا موقع مل چکا تھا' اسی لیے مجھے ان کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جس طرح تن من دھن سے یہ لوگ ملک کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں' کامیابی انشاء اللہ ضرور ان کے قدم چومے گی۔

راستے میں مجھے مسٹر ناگرک اس سلسلے میں پیش آنے والے حالات سے آگاہی بہم پہنچاتے رہے۔ ایک جگہ رک کر انہوں نے کہیں فون کیا اور واپس گاڑی میں بیٹھ کر اس کا رخ ایک ہوٹل کی طرف موڑ دیا جہاں ایک شاندار کمرہ رمیش دوبے کے نام سے بک ہو چکا تھا۔ مجھے ہوٹل چھوڑ کر وہ صبح تک کے لیے الوداع کہہ کر چلے گئے۔

رات کے قریباً بارہ بج رہے تھے جب میں ایک بیرے کی رہنمائی میں اپنے کمرے تک پہنچا۔ میرے بریف کیس میں جو مجھے مسٹر ناگرک نے کار سے اترتے ہوئے دیا تھا' ایک شب خوابی کا لباس موجود تھا۔ کپڑے بدل کر میں بستر پر لیٹ گیا اور خیالات کے دوش پر پرواز کرتا بالآخر گہری نیند کی آغوش میں سما گیا۔

صبح میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی۔ سب سے پہلے میری نظر سرہانے رکھی گھڑی پر پڑی جو صبح کے چھ بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی کہ میں ابھی تک کیوں سوتا رہا۔

"ہیلو۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ابھی تک استراحت ہی فرما رہے ہو۔" دوسری طرف مسٹر ناگرک تھے۔ "تیار ہو جاؤ۔ ناشتہ ہم اکٹھے ہی کریں گے۔"

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور بستر سے چھلانگ لگا کر باہر نکل آیا۔ تین چار منٹ تک ہلکی پھلکی ورزش کی اور باتھ روم میں جا گھسا۔ میں تیار ہو کر کمرے میں رکھے سنگھار میز کے سامنے کھڑا اپنا جائزہ لے ہی رہا تھا جب دروازے پر دستک سنائی دی۔ شاید مسٹر ناگرک آ گئے تھے۔ یہی خیال کر کے میں آگے بڑھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ پھر جس طرح دروازہ کھلا تھا اتنی ہی تیزی سے مجھے واپس اندر آنا پڑا۔

اندر آنے والے نے دروازے کا لاک کھلتے ہی دھکا دیا اور پھر دروازہ مجھ سے ٹکرایا تو میں سیدھا پلنگ پر جا گرا۔ جب اٹھ کر کھڑا ہوا تو ایک پستول کی نالی میری طرف اٹھی ہوئی

# شکار اور شکاری

"خوش آمدید۔" میں نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے چہک کر کہا۔ میں بزدلی کا مظاہرہ کر کے انہیں خود پر حاوی ہونے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

"کون ہو تم؟" نووارد نے میرے چہکنے کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے بڑی سرد لہجے میں پوچھا۔

"وہ نہیں ہوں جو سمجھ کر تم یہاں آئے ہو۔" میں نے دوبارہ سنبھل کر کہا۔

"کس کے لیے کام کر رہے ہو؟" اس کا لہجہ بدستور وہی تھا۔

"تمہارے لیے بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے ہوا میں تیر چلایا۔

نووارد نے چند لمحے کے لیے شاید میری بات کو تولا۔ اس کی خاموشی کا مطلب کم از کم یہی لیا جا سکتا تھا۔

"زیادہ چالاکی مت دکھائی۔ پستول میں نصب سائیلینسر تمہیں نظر آ رہا ہو گا۔" اس نے میری نقل و حرکت کا نوٹس لیا۔

"دیکھو مہاشے جی! مجھے مرنے کی کوئی ایسی جلدی نہیں ہے اور ویسے بھی میں ہنگاموں سے دور بھاگتا ہوں۔ آپ کچھ کہیے گا بھی۔" میں نے قریباً کھسیاتے ہوئے کہا۔ مجھے امید تھی کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔

"شاردا کے کمرے میں تمہارے ساتھ دوسرا آدمی کون تھا؟" اس نے میری باتوں پر گویا کان بالکل نہ دھرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

ایک بات تو بالکل صاف تھی کہ اس کا تعلق بھارتی انٹیلی جنس سے ہرگز نہیں تھا ورنہ اس کی آمد یوں چوروں کی طرح نہ ہوتی۔ وہ بھی شاید میری طرح نیپالی پرنس کا کوئی عاشق تھا جو اس کی جنت پر ہاتھ صاف کرنے کے چکر میں تھا اور جسے ہمارا اس کھیل میں کودنا ناگوار گزرا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس معاملے میں ملوث تھے۔

"شاردا کے کمرے میں جانے کا مطلب تو کسی گدھے کی سمجھ میں بھی آ سکتا ہے۔"

میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
"شٹ اپ!" اس نے مجھے ڈانٹا۔
"تمہارا دوسرا ساتھی کون تھا؟" دوبارہ اس نے اپنے پہلے سوال کی طرف توجہ دلائی۔
"دلال!" میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہہ دیا۔
"نام کیا ہے اس کا؟"
"ناگرک۔ یہاں اچانک ہی مل گیا تھا۔ پہلے تو اس کی کمیشن سن کر مجھے غصہ آیا، لیکن
لونڈیا دیکھ کر اس پر بھی پیار آنے لگا۔" میں نے بات سے بات نکالی۔ میری معمولی سی
گھبراہٹ کسی بھی لمحے کھیل کا پانسہ پلٹ سکتی تھی۔ مجھے اس حقیقت کا شدت سے احساس
تھا۔

نووارد پھر کچھ سوچنے لگا۔
"اگر برا نہ مانو تو ہاتھ نیچے گرا لوں۔" میں نے بڑے ملتجی لہجے میں اس سے پوچھا۔
اس نے میرے چہرے پر نظریں جما کر شاید ایکٹنگ نام کی کوئی چیز تلاش کرنے کی
کوشش کی تھی، لیکن وہاں اس کو سوائے خوف اور زبردستی کی مسکراہٹ کے جو عموماً" کسی
خوفزدہ صورت حال سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہونٹوں پر چپکائی جاتی ہے اور کیا مل
سکتا تھا؟

"دیکھو مسٹر میرا پیشہ بھی ناگرک والا ہی ہے اور گاہک پہلے میں نے پھنسایا تھا۔ میں نہیں
چاہتا کہ کوئی اور اس کے نزدیک بھی پھٹکے۔ اگر تمہیں پیسے اڑانے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں
شاردا سے بڑھ کر بھی کئی چیزیں تمہیں دکھا سکتا ہوں۔"
میں نے اس کے اس جواب کا مطلب پہلے تو یہی سمجھا کہ اسے میری معصومیت پر یقین
آگیا ہے۔ اس لیے فوراً" ہاتھ گرا لیے۔ جس پر اس نے کسی سخت ردعمل کا اظہار نہ کیا۔
پھر میں نے دل ہی دل میں اس کی حاضر دماغی کو سراہا۔ اس نے فوراً" کیسا شاندار پلاٹ گھڑا
تھا۔ کھلاڑی تو وہ بھی بڑا کائیاں تھا، لیکن مات کھا گیا۔
"لیکن مہاشے جی! تم ہی ان چیزوں کی طرف کیوں نہیں چلے جاتے؟" میں نے طنز سے
کہا۔

"دیکھو مسٹر یہ میرے دھندے کا معاملہ ہے اور میں اپنے راستے میں آنے والوں کو کبھی
معاف نہیں کیا کرتا۔ تم نوجوان ہو اور مرنا یقیناً پسند نہیں کرو گے۔ جس طرح میں کہہ رہا
ہوں اسی طرح ہونا چاہیے ورنہ........" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔



اب اسے شاید یقین آ چکا تھا کہ میں محض ایک ریشہ خطمی قسم کا سرمایہ دار ہوں اور
شاردا سے میرا تعلق اگر کوئی ہے تو اسی نسبت سے ہے۔ میں دل ہی دل میں اپنی اداکاری پر
خود کو داد دے رہا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ نووارد نے مجھے کوئی شریف قسم کا تماش بین
سمجھا اور دھمکی دینے پر ہی اکتفا کیا تھا ورنہ اس کے سائیلینسر لگے پستول کی صرف ایک گولی
اس کے خدشات اور میری زندگی کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی تھی----!
شاید یہ لوگ اپنے کھیل میں زیادہ خون خرابہ کر کے وقت سے پہلے کھیل بگاڑنے کا خطرہ
مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اگر اس کی جگہ میں بھی ہوتا تو یہی کرتا۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں آج ہی اس شہر سے چلا جاتا ہوں۔" میں نے سہم جانے
کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔
"میری یہاں آمد کا ذکر بھی اپنے ساتھی سے نہ کرنا۔ سمجھے!"
"بالکل نہیں کرے گا بالکل نہیں۔" میں نے اس کی تسلی کروائی۔
پستول کے منہ سے لگا سائیلینسر اتار کر اس نے اپنی جیب میں ڈالا اور دوسری جیب میں
پستول ڈال کر جس طرح آیا تھا، اسی طرح واپس چلا گیا۔



ابھی اسے وہاں سے نکلے بمشکل ایک ڈیڑھ منٹ ہی ہوا تھا جب دروازہ دوبارہ کھلا اور
"ماسٹر" اندر داخل ہوئے۔
"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، میں نے سارا ڈرامہ دیکھ لیا ہے۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر
میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔
"کون ہو سکتا ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔
"کوئی بھی---- لیکن اتفاق سے تمہارے جھانسے میں آ گیا۔ پھر بھی ہم اس پر نظر
رکھے ہوئے ہیں۔"
"شاید پلان بدلنا پڑے۔" میں نے کہنا چاہا۔
"اوہ نہیں۔" انہوں نے میری بات درمیان سے کاٹ دی۔
"ایسی معمولی سی باتوں کے لیے پلان نہیں بدلے جاتے، اگر ہم نے اس طرف سے خطرہ
محسوس کیا تو اس لائن پر سوچیں گے۔" انہوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
انہوں نے اسی ہوٹل سے شاردا والے ہوٹل کا نمبر ملایا اور اب وہ کسی بیرے سے
بات کر رہے تھے----!

مصروف گفتگو تھے جو شاید ان کا آدمی تھا جسے انہوں نے شاردا کی نگرانی کے لیے مقرر کر رکھا
تھا۔ گفتگو چونکہ بنگالی زبان میں ہو رہی تھی' اس لیے میرے پلے کچھ پڑنے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا تھا۔ فون بند کر کے وہ میری طرف پلٹے اور بولے۔
"بات کچھ بنتی نظر آتی ہے۔ نیپالی نے وہ رات شاردا کے کمرے میں گزاری ہے۔ وہ
صبح رخصت ہوا تھا۔ اس پیشے کے لوگوں کی یہی ایک کمزوری ایکسپلائٹ ہو سکتی ہے۔"
میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا' ان سے پوچھوں کہ شاردا ان تک اپنا پیغام کیسے
پہنچائے گی؟ لیکن چپکا ہو رہا۔ اگر یہ بات جاننے کی ہوتی تو وہ خود اس سے آگاہ کر دیتے۔
"نکلو اب یہاں سے----- کیونکہ تمہیں واپس تو جانا ہی ہے۔" انہوں نے کہا۔
اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے ایک ڈرامہ بھی سمجھا دیا جو وہیں انجام پانا تھا۔
مسٹر ناگرک نے اس بات پر یقین کر لیا تھا کہ حملہ آور یہاں سے چپ چاپ رخصت
ہو گیا ہے' لیکن یہ بات شاید ان کے ذہن میں رہی تھی کہ اس کا کوئی آدمی ابھی یہاں میری
نگرانی کے لیے موجود ہو گا اور اسی امکان کے پیش نظر انہوں نے مجھے یہ ڈرامہ سمجھایا تھا۔
ان کے کہنے کے مطابق میں نے غصے کا موڈ بنایا اور کمرے سے ہوٹل کا کاؤنٹر ملایا۔
"میں اسی وقت آپ کا ہوٹل چھوڑ رہا ہوں۔ بل بھیج دیجئے۔" یہ کہہ کر میں نے فون کریڈل
پر پٹخ دیا۔

"فائن!" مسٹر ناگرک نے داد دی۔
چند ہی منٹ بعد ایک مودب ویٹر اور ہوٹل انتظامیہ کی ایک چاق و چوبند میزبان میرے
کمرے میں موجود تھیں اور مسٹر ناگرک ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر رک جانے کی بینتی مجھ
سے کر رہے تھے۔
"پرماتما کے لیے مہاراج! مجھے بتایئے تو سہی ہوا کیا؟" انہوں نے قریبا" گھگھیاتے ہوئے
کہا۔

"شٹ اپ!" میں نے ڈانٹ پلائی۔
"مہاراج جی! میری ساکھ ختم ہو جائے گی۔ میں........"
"جہنم میں گئے تم اور تمہاری ساکھ۔ تم سب فراڈ لوگ ہو۔ میں آج شام کی فلائٹ سے
واپس پنجاب جا رہا ہوں۔" میں نے ان کی بات کاٹ کر دھاڑتے ہوئے کہا۔
"لیکن مہاراج-----!"
"چپ رہو۔" میں نے لڑکی کو پرس سے پیسے نکال کر بل دیتے ہوئے انہیں پھر ڈانٹا۔



"ٹھیک ہے مہاراج۔ جیسی آپ کی اچھیا۔ ورنہ میرے پاس مال تو اور بھی........" وہ
اصل بات کہہ کر خاموش ہو رہے۔
اس دوران وہ لڑکی جو ویٹر کے ساتھ کمرہ خالی کروانے آئی تھی' احساس دلائے بغیر گہری
نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ سپائی ماسٹر کا شک صحیح نکلا۔
میں نے انہیں بھاری ٹپ دے کر رخصت کیا۔ ان کے سامنے ہی مسٹر ناگرک کو بھی
دفع کیا اور ہوٹل سے باہر آ کر ٹیکسی کا منتظر ہو رہا۔ اس دوران ایک اور محترمہ مجھ سے چپکی
رہیں۔
وہ خاتون بظاہر بڑی عقل مندی سے مجھے نظروں میں رکھے ہوئے تھی۔ جیسے ہی ایک
ٹیکسی سے سواری اتری میں لپک کر اس میں بیٹھا اور ایک دور کی منزل کا پتہ بتا دیا تاکہ ٹیکسی
ڈرائیور "لمبی سواری کی امید پر" مجھے انکار نہ کر دے۔
وہ بے چاری ہاتھ ملتی ہی رہ گئی۔
ایک مناسب جگہ ٹیکسی رکنے کا اشارہ کر کے ایک بڑا نوٹ اس کی گود میں پھینک کر میں
باہر نکل آیا اور ایک دوسری ٹیکسی کے ذریعے ہوٹل تک جا پہنچا۔ کمرہ نمبر اٹھائیس پر
مخصوص دستک کے جواب میں وہاں سے مسٹر ناگرک برآمد ہوئے جو میرے دیر سے آنے پر
فکر مند تھے۔ میں نے اپنی ساری رام کہانی سنا دی۔

☆○☆

رات کا وقت وہیں گزرا۔ اس دوران فون کی گھنٹی ایک دو دفعہ بجی۔ مسٹر ناگرک نے
بنگالی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ہم نے آٹھ بجے تک کا وقت تاش کھیل کر گزارا' پھر وہیں
کھانا منگوا لیا۔ ابھی بمشکل کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے جب دوبارہ ٹیلی فون ٹرایا۔ اس
مرتبہ مسٹر ناگرک نے فون رکھتے ہی مجھے مخاطب کیا۔
"آل رائٹ کمانڈو۔" یہ میرے تیار ہونے کا اشارہ تھا۔
میں نے پستول کا میگزین نکال کر دوبارہ اس کا جائزہ لیا۔ دوسری جیب میں رکھی نائیلون
کی مضبوط رسی اور پتلون کے نیچے پاؤں کے نزدیک اڑسے خنجر کی موجودگی کی تصدیق کی اور
اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم لوگ وہاں سے باہر آ گئے۔ کمرے سے ہوٹل کے
دروازے تک کا سفر ہم نے الگ الگ کیا تھا۔
ہوٹل سے قریبا" ایک میل دور کار ہماری منتظر تھی۔ یہ راستہ بھی ہم نے ایک دوسرے

کے تعاقب میں پیدل ہی طے کیا۔ شاید مسٹر ناگرک اس امکان کو مدنظر رکھے ہوئے تھے کہ ممکن ہے کوئی اس ہوٹل کی نگرانی کر رہا ہو۔
کار ایک جگہ پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی جس کے نزدیک اس کا ڈرائیور بھی موجود تھا جو مسٹر ناگرک کو دیکھتے ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہم دونوں نے اگلی سیٹیں سنبھال لیں۔



"ہم پوائنٹ نمبر۲ کی طرف جا رہے ہیں مسٹر۔ وہیں نیپالی پرنس اور اس کا شکار ملاقات کریں گے۔ شاید آنے والا نیپالی کے لیے مائیکرو فلم لے کر آئے گا کیونکہ فائلیں اٹھا لانا اس کے بس کا روگ نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر الگ ہو جائیں گے۔"
انہوں نے مجھے بقایا تفصیلات سمجھاتے ہوئے پوائنٹ نمبر۲ کا "ڈیڈ ڈراپ" دہرانے کے لیے کہا جو میں نے دہرایا۔
شاردا کی طرف سے ملنے والے "کاشن" کی نشاندہی اور اگلی ملاقات کے لیے جگہ کا تعین کرنے کے بعد انہوں نے مجھے مطلوبہ مقام سے قریباً ڈیڑھ میل دور اتار دیا اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔
اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور شاردا کی اطلاعات کے مطابق ان دونوں کی ملاقات دس اور گیارہ بجے کے درمیان متوقع تھی۔ یہ ڈیڑھ دو گھنٹے گزارنا ہی میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ تھا جس کا مجھے فی الوقت کوئی حل نہیں سوجھ رہا تھا۔ پوائنٹ نمبر۲ ایک ماڈرن کالونی کا بنگلہ تھا جس کے سامنے کالونی کا تفریحی باغ بنا تھا اور سڑک گزرتی تھی۔ یہ دونوں جگہیں میرے لیے غیر محفوظ تھیں کیونکہ میرے علاوہ بھی کچھ لوگ اس چکر میں ضرور موجود تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے اپنی اطلاعات کے لیے ہم سے بہتر ذرائع اپنائے ہوں یا پھر شاردا جیسی حرافہ سے یہ توقع بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ "ڈبل کراس" کر رہی ہو۔
ان دونوں امکانات کو رد کر بھی دیا جاتا تو بھی میں کم از کم اس شخص کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا جو ہوٹل کے کمرے تک پہنچ گیا تھا اور شاردا جس کی نظر میں آ چکی تھی۔ اس بات کے سو فیصد امکانات موجود تھے کہ اس نے شروع سے آخر تک شاردا پر نظر رکھی ہو گی اور اسے یہاں نیپالی کے ساتھ اس کی موجودگی کا بھی علم ہو گا۔



ایک اور گروہ کی اس معاملے میں دلچسپی بھی میرے علم میں تھی اور میں یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اتنے لمبے کہ انہیں کم از کم نیپالی تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی۔
سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ اگر یہ معاملہ مار دھاڑ کے بغیر حل ہو سکتا تھا تو مجھے زحمت نہ دی جاتی اور مقامی دوست ہی اُس کو سنبھال لیتے۔ کچھ یہی تھے وہ خیالات جنہیں لے کر میں اس طرف بڑھ رہا تھا۔ قریباً نو بجے میں اس تفریحی پارک کے سامنے سے گزر رہا تھا جس کے ایک کونے میں پڑے بنچ پر ایک شخص سر جھکائے سگریٹ نوشی میں مشغول تھا۔ سڑک کے کنارے ایک کھمبے سے لٹکے بیمار بلب کی زرد سی روشنی میں مجھے ایک اور شخص بھی بخوبی دکھائی دے رہا تھا جو بظاہر ماحول سے بے پروا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ دو اپنے جیسے مشتبہ ان کے علاوہ میرے نزدیک سے گزر چکے تھے۔ اگر مجھے کوئی خوش فہمی بھی اس سلسلے میں تھی تو وہ اب دور ہو چکی تھی۔



میں گہری نظروں سے ماحول کا جائزہ لیتا بالآخر گھوم کر بنگلے کی پشت پر پہنچ گیا جہاں سے مجھے اوپری منزل کے ایک کمرے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ پشت والا حصہ میری دانست میں قدرے مضبوط بھی تھا اور "مقامی دوستوں" نے محل وقوع کا جائزہ لے کر اس سمت کو میرے لیے زیادہ محفوظ جانا تھا۔
مجھے اور تو کوئی مناسب جگہ نظر نہ آئی البتہ ایک کوٹھی کے باہر بنے چھوٹے سے باغیچے میں جس کے چاروں کونوں پر گھنے درخت نظر آ رہے تھے، گھس گیا۔ میں نے تربیت کے مطابق اس جگہ کو غنیمت جانتے ہوئے خود کو چھپا لیا تھا اور اب میری نظریں اس کمرے کی اپنی سمت کھلنے والی کھڑکی پر جمی تھیں جہاں سے "لائن کلیئر" کا اشارہ ملنے والا تھا۔
رات کے تقریباً دس بجے میری مراد بر آئی جب میں نے ایک خاتون کو کھڑکی کھول کر اس میں سے باہر جھانکتے دیکھا۔ وہ ایک مخصوص انداز سے جھک کر دوبارہ اٹھی اور کھڑکی بند ہو گئی۔
یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ شاردا کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس نے دونوں کو شراب میں گہری نیند طاری کرنے والا سفوف پلا کر بے ہوش کر دیا ہے۔ میں بلی کی طرح دبے پاؤں باہر نکلا اور پشت والی چھوٹی سی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ بنگلے کی نچلی منزل تھی جس پر

مکمل تاریکی طاری تھی۔ میرے پاؤں زمین پر لگے تو کچھ نمی کا احساس ہوا۔ میں لان میں کودا تھا جسے شاید آج ہی پانی دیا گیا تھا۔

مسٹر ناگرک نے اگرچہ مجھے بنگلے میں آمدورفت کے راستوں سے کاغذ پر لکیریں کھینچ کر آگاہ کر دیا تھا، لیکن یہاں اندھیرا اس غضب کا تھا کہ ٹھیک طور سے سمت کا اندازہ بھی نہیں کر پایا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جب میری آنکھیں اندھیرے میں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے اندازے سے ذہن میں بنگلے کے اندرونی نقشے کو دہراتے ہوئے ان سیڑھیوں کی طرف پیش قدمی شروع کی جو اوپر جا رہی تھیں۔

میں ایک دیوار کے ساتھ چپکا ہوا برآمدے کی طرف کھسک رہا تھا جس سے گزرنے کے بعد ہی ان سیڑھیوں تک پہنچ سکتا تھا۔ ابھی میں بمشکل دیوار کے کونے تک ہی پہنچا تھا جہاں سے برآمدے کی حدود شروع ہوتی تھیں کہ کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ دوسرے ہی لمحے خنجر میرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔

دیوار کی حد پر پہنچ کر میں نے برآمدے سے گردن باہر نکالتے ہوئے نظریں دوڑائیں تو کسی کو پنجوں کے بل سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اتنی دور سے سوائے پستول کی گولی مارنے کے اس کا اور کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا، لیکن ابتدائی مراحل ہی میں پستول کی فائرنگ کی آواز کا خطرہ مول لینے کا مطلب سوائے سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کے اور کچھ نہ ہوتا۔

اسے اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنے قریب لانے کا بھی اس وقت مجھے کوئی مناسب طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ اسے آگے نکل جانے دیا اور جیسے ہی اس نے سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھا، میں برآمدے میں جا گھسا۔

یہ سیڑھیاں کچھ اس انداز سے بنی ہوئی تھیں کہ دو چار سیڑھیاں چڑھنے کے بعد برآمدے کا منظر دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ میں بغیر آواز پیدا کیے پنجوں کے بل تیزی سے چلتا دوسرے ہی لمحے سیڑھیوں کے نزدیک جا پہنچا اور پہلا پاؤں ان پر رکھا۔ اب اس طرح سے میں اپنے پیشرو کے تعاقب میں سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا۔ ان سیڑھیوں کا خاتمہ اس بالکنی پر ہوتا تھا جس کے ایک طرف ان کمروں کی قطار تھی جن میں سے ایک میں شاردا یہ ڈرامہ رچائے میری منتظر تھی اور دوسری طرف سڑک کے سامنے چقیں پڑی ہوئی تھیں۔

جب میرے آگے جانے والا بالکنی سے آہستہ آہستہ اس کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا، اس وقت میں بالکل آخری سیڑھی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ابھی میں نے آخری سیڑھی پر قدم



رکھا ہی تھا کہ ایک دل دوز چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ اتنی اذیت ناک تھی جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں وہیں سیڑھیوں کی دیوار سے چپک گیا۔ اس کے ساتھ ہی بالکنی میں جلتا انتہائی محدود روشنی کا بلب بھی بجھ گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے بنگلے میں ایک طوفان بدتمیزی در آیا ہو---- میں ایک جھٹکے سے گھوما اور جیسے نیند سے بیدار ہو گیا۔

میں نے بڑی پھرتی سے وہاں ایک کونے میں بڑے سلیقے سے سجائی گئی کین کی ہلکی پھلکی چاروں کرسیاں اٹھا کر سیڑھیوں میں رکھ دیں تاکہ اوپر آنے والوں کے لیے رکاوٹ کا باعث بن سکیں اور بڑی تیزی سے سیڑھیوں اور بالکنی کے درمیان والا دروازہ بند کر کے اس کا بولٹ چڑھا دیا۔

اب میں بڑی تیز رفتاری سے آواز پیدا کیے بغیر دیوار سے چپکا اس کمرے کی سمت بڑھ رہا تھا جس کی روشنی بجھ چکی تھی۔ شاید کسی نے نیچے سے فیوز اڑا دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے رک کر میں نے صورت حال کا جائزہ لینا چاہا۔

اسی لمحے میں نے خود کو نارمل بھی کر لیا----!

اب میں کسی بھی پیش آمدہ طوفان کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل تیار تھا۔

ایک لمحے کے نوٹس پر کچھ بھی کر گزرنے والا کمانڈو بن چکا تھا----!

بڑی مضبوطی سے میں نے اگلا قدم اٹھایا تھا۔

# موت کی شاہراہ پر

ابھی بمشکل پانچ چھ قدم ہی اٹھائے تھے کہ میرے پاؤں کسی جسم سے ٹکرائے اور میں گرتے گرتے بچا۔ اندھیرے ہی میں جھک کر میں نے جائزہ لیا۔ یہ کسی عورت کی لاش تھی۔ قتل تازہ ترین نظر آ رہا تھا جس کا اندازہ مجھے اس کے جسم کی گرمی سے ہوا۔

یقیناً یہ شاردا ہی تھی----!

چیخ کا مطلب بخوبی میری سمجھ میں آ گیا۔ میرے پیش رو نے اسے خنجر کا نشانہ ہی بنایا تھا۔ آدمی یا تو اناڑی تھا یا پھر جلدی میں اس نے صحیح پوزیشن نہیں لی تھی ورنہ اس کے منہ سے آواز کبھی نہ نکلتی اور بنگلے کے مختلف کونوں کھدروں میں چھپے باقی شکاری بھی ہوشیار نہ ہوتے۔

میں بڑی پھرتی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا جس کے اندر وہ شخص شاید پنسل ٹارچ روشن کیے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اب میں دل کی دھڑکنوں سے اس کے باہر نکلنے کا منتظر تھا کیونکہ کسی بھی لمحے نیچے موجود باقی لوگوں کے اوپر آنے کے امکانات موجود تھے اور بالکنی والے دروازے کی مضبوطی کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ دو تین زوردار دھکے اس کے کیل قبضے اکھاڑنے کے لیے کافی تھے۔

اندر داخل ہونے والا اتنی افراتفری اور جلدی میں تھا کہ اس نے دروازہ بند کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کی پنسل ٹارچ کی رینگتی ہوئی روشنی کی لکیر یہاں سے بخوبی دکھائی دے رہی تھی۔ دروازے کے کونے سے ایک ہاتھ میں مضبوطی سے خنجر پکڑے میں اس کے باہر آنے کا منتظر تھا۔ اس انتظار کی شدت سے میرے اعصاب تڑخنے لگے تھے کیونکہ دوسری طرف اب سیڑھیوں سے اٹھنے والے شور کی آوازیں بھی صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ اندر موجود شخص نے بھی جس کے کان یقیناً میری ہی طرح باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے ہوں گے، یہ شور سن لیا تھا کیونکہ اب وہ تیزی سے باہر آ رہا تھا۔

شاید گوہر مقصود اس کے ہاتھ لگ گیا تھا----!

جیسے ہی وہ میری زد میں آیا۔ میرا ایک ہاتھ پشت سے بل کھا کر اس کے منہ پر ٹکا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے خنجر اس کے دل میں اتار دیا۔ قریبا" آدھ منٹ تک میں نے اسے اپنی گرفت میں لیے رکھا تاکہ اس کے منہ سے یا تڑپنے مچلنے سے کوئی آواز پیدا نہ ہو سکے۔ اس سے زیادہ دیر اس کے زندہ رہنے کے امکانات نہیں تھے کیونکہ خنجر ایک سریع الاثر زہر میں بجھا ہوا تھا اور اس کا شکار لمحوں میں قید حیات سے رہائی پا جاتا تھا۔ خنجر اس کے جسم سے نکال کر میں نے ماہر قصابوں کی طرح شکار کے کپڑوں سے صاف کیا اور دوبارہ اسی جگہ چھپا کر اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تو ایک لفافہ برآمد ہوا جس میں موجود رول کا احساس تو مجھے ہو گیا تھا لیکن اپنی تشفی کے لیے میں نے کمرے کے اندر گھس کر اس کی دوسری جیب سے برآمد شدہ پنسل ٹارچ کے ذریعے لفافے کا جائزہ لیا اور اس میں موجود مائیکرو فلم دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ میں نے لفافہ فورا" جیکٹ کی محفوظ جیب میں منتقل کر دیا۔

ٹارچ گھما کر میں نے کمرے کی فضا دیکھنی چاہی۔ دونوں گدھے ایک ہی صوفے پر گہری نیند میں مبتلا تھے۔ ان کے سامنے میز پر رکھی شراب کے قریبا" دو خالی جام بھی دکھائی دے رہے تھے۔ شاردا بے چاری اپنی سی کر گزری تھی۔

ابھی میں نے ٹارچ بجھا کر ایک کونے میں پھینکی ہی تھی کہ "دھڑ دھڑ" بالکنی کا دروازہ کوٹنے کی آواز سنائی دی جس کا مطلب تھا دشمن سر پر آ پہنچا ہے اور اس طرف سے فرار کی راہیں بھی مسدود ہو گئی تھیں۔ میں نے فورا" کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے لاک کر دیا۔

جیب سے نائیلون کی مضبوط ڈوری نکالی۔ میز پر کھڑے ہو کر اسے پنکھے میں پھنسا کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور اس کا دوسرا سرا کھڑکی کے راستے باہر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور بالکنی دوڑتے قدموں کی آواز سے دھمکنے لگی۔ میں ان کی آمد سے پہلے ہی باہر لٹک چکا تھا اور بڑی مہارت اور تیزی سے دیوار پر پاؤں جماتا نیچے آ رہا تھا۔ میں نے واپسی کے لیے وہی راستہ منتخب کیا تھا جہاں سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ ابھی اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا اور کمرے میں کسی کے داخل ہونے سے پہلے اس طرف ان کو خیال کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

میں نے بڑی تیز رفتاری سے دیوار پھلانگی اور اس بنگلے کے خاتمے پر اس "ڈسٹ بن" تک پہنچ گیا جو میرا "ڈیڈ ڈراپ" تھا۔ اس ڈسٹ بن میں کالونی کے لوگ کچرا وغیرہ پھینکتے تھے اور اس کے ایک کونے میں میرے ساتھیوں نے چھوٹا سا بظاہر نہ دکھائی دینے والا گڑھا کھود



رکھا تھا۔ یہی "ڈیڈ ڈراپ" (وہ جگہ جہاں جاسوس کوئی ڈاکومنٹ وقتی طور پر چھپا دیتے ہیں اور ان کا دوسرا ساتھی اسے وہاں سے حاصل کر لیتا ہے) مقرر ہوا تھا۔

میں نے لفافہ گڑھے میں رکھا اور قریب رکھے ہوئے پتھر سے اسے ڈھانپ دیا۔ یہاں کی صبح ۹ بجے کے بعد ہی بیدار ہوا کرتی تھی اور مجھے علم تھا کہ علی الصبح ہمارا کوئی ساتھی "واکنگ" کے بہانے گھومتے ہوئے اس طرف آئے گا اور وہ "گوہر مقصود" یہاں سے حاصل کر لے گا۔

شاید اندر ہونے والے ہنگامے کی آوازیں باہر نہیں آئی تھیں یا پھر یہاں کسی کے پاس ایسی آوازوں پر کان دھرنے کی مہلت ہی نہیں تھی کیونکہ کسی بنگلے کی کھڑکیوں سے ابھی اس طرف کسی چہرے کو جھانکتے ہوئے میں نے نہیں پایا تھا۔



واپسی کا سفر میں نے سڑک پر چلنے کے بجائے بنگلوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ہی طے کرنے کا فیصلہ کیا اور بجائے بھاگنے کے معمول کی رفتار ہی سے چل رہا تھا تاکہ کسی کو خوامخواہ شک نہ ہو جائے۔ ابھی بمشکل چند گز ہی چل پایا تھا کہ اچانک چھٹی حس نے چیخ کر کسی خطرے کی نشاندہی کی اور اس کے ساتھ ہی ایک گولی "شائیں" کی آواز پیدا کرتی کان کے بالکل قریب سے گزر گئی۔

میں فورا" زمین سے چپک گیا اور تیزی سے کہنیوں کے بل رینگنا شروع کر دیا۔ فائرنگ کرنے والا شاید کہیں رک کر مجھ پر گولیاں برسا رہا تھا کیونکہ اس کے بعد میرے تعاقب میں لپکنے والی گولیاں اب مجھ سے کچھ فاصلے پر ہی دم توڑنے لگی تھیں۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں فائرنگ رینج سے نکل چکا ہوں تو میں نے اٹھ کر محفوظ انداز سے قدرے ترچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے ہوئے جہاں مجھے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اب تو سوئے مردے بھی جاگ اٹھے ہوں گے وہاں ایک اور احساس بھی رہ رہ کر میرے ذہن میں سر اٹھا کر مجھے دلاسے دے رہا تھا کہ میرے ساتھی میری اس حالت سے لاعلم نہیں ہوں گے۔

اب چونکہ میں خطرے کی حدود سے نکل چکا ہوں' وہ ضرور میری مدد کو آئیں گے۔ یہی تھے وہ احساسات جن کے زیر اثر میں اس کار کو دیکھ کر ٹھٹک گیا جو اندھیرے میں ایک کونے سے نکل کر میرے ساتھ ساتھ رینگتی کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"کم آن۔" مجھے ایک آواز سنائی دی اور بڑی پھرتی سے دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا۔ کار میں سوائے ڈرائیور کے اور کوئی نہیں تھا۔ میرے بیٹھتے ہی کار جس کا انجن سٹارٹ تھا' تیز رفتاری سے آگے بڑھی۔ ڈرائیور خاصا مشاق دکھائی دیتا تھا۔



"اکیلے ہی چلے آئے ہو۔ اپنی اس کو تو لے آتے۔" یہ فقرہ ڈرائیور کے منہ سے نکلا تو مجھے یوں لگا جیسے سیٹ کے نیچے لگے طاقت ور اسپرنگوں نے مجھے اچانک فضا میں اچھال دیا ہو۔ میں تو سن ہو کر رہ گیا تھا' لیکن صرف چند سیکنڈ کے لیے---! ڈرائیونگ کرنے والے نے اپنا چہرہ قریباً" چھپا رکھا تھا۔ اس کی جیکٹ کے بڑے بڑے کالر اٹھے ہوئے تھے اور کار میں موجود تاریکی نے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ میں اس کے "درشن" کر سکوں۔ اچانک ہی کار کے اندر کی بتی روشن ہو گئی---!

اندر لگے شیشے میں اب میں بخوبی اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ ریکھا تھی---! وہی ریکھا جس کی تصویر دکھاتے ہوئے انٹیلی جنس کے کرنل صاحب نے مجھے تاکید کی تھی کہ اس عورت کو کبھی "عورت" سمجھ کر نظرانداز کرنے کی غلطی نہ کرنا۔

میں نے اس کے منہ سے نوالا چھینا تھا اور ایسی بوکھلائی ہوئی شیرنی سے کچھ بھی امید کی جا سکتی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی---- میں نے خود کو ذہنی طور پر کسی بھی ناخوشگوار صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

اندازے کی جو غلطی مجھ سے ہوئی تھی اور میں اس کو "اپنے ساتھیوں" کی طرف سے بھیجی جانے والی امداد سمجھ کر اس کار میں سوار ہو گیا تھا۔ اب اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا تھا۔

میں نے سوچا بوکھلا کر صورت حال کو بگاڑنے کے بجائے مجھے جم کر حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ یوں بھی مجھے بہرحال یہ اطمینان حاصل تھا کہ "گوہر مقصود" ہمارے ہاتھ لگ چکا ہے اور تشدد یا تحریص کا کوئی بھی حربہ خدا کے فضل سے مجھ سے صبح ۹ بجے تک "ڈیڈ ڈراپ" کا بھید نہیں اگلوا سکتا۔



"ارے واہ!" میں نے چہکنا چاہا۔ "اس طرح اچانک ملاقات بھی کبھی کبھی کتنی عجیب اور خوبصورت لگتی ہے۔"

"صرف عجیب---! خوبصورت نہیں۔" اس کی آواز قدرے سنجیدہ تھی۔



"کیا مطلب ہے ریکھا دیوی؟" میں نے ہوا میں تیر چلایا کہ وہ اپنی پہچان پر بوکھلا جائے۔ عین اس لمحے ایک رائفل کی ٹھنڈی نال گردن سے آ لگی۔

"مسٹر---! زیادہ چالاکی مت دکھایئے۔" پچھلی سیٹ سے کسی نے وارننگ دی۔

"آپ کی تعریف؟" میں نے ابھی گردن کو ذرا سا ہی خم دیا تھا کہ اچانک نالی کا دباؤ گردن پر بڑھ گیا اور مجھے اسی پوزیشن میں واپس آنا پڑا۔

"یہاں زیادہ جوکر بننے کی کوشش نہ کرنا مسٹر! جو کوئی بھی تم ہو اگر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو تو کوشش کر دیکھو۔" ریکھا کی پھنکار سنائی دی۔

"مجھے تو کوئی خوش فہمی نہیں مس' لیکن آپ کو غلط فہمی ہونے لگی ہے۔"

"شٹ اپ!" پیچھے بیٹھے غنڈے نے میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے ڈانٹ دیا۔

"یار تم کیوں بیچ میں بولتے ہو۔" میں جانتا تھا کہ وہ مجھے فی الوقت مارنا نہیں چاہتے۔ اگر ان کو اس بات کا علم ہے کہ میں نے ہی مائیکرو فلمیں اڑائی ہیں تو وہ مجھے ہر صورت زندہ رکھیں گے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کہ انہیں فلمیں نہ مل جائیں۔

"یہ صرف بولتا ہی نہیں' ہاتھ بھی چلا سکتا ہے۔" اس مرتبہ ریکھا نے جواب دیا۔

"اچھا!" میں نے بڑی حیرت ظاہر کرنے کی ایکٹنگ کی۔

"اگر حکم ہو تو میڈم" پیچھے سے آواز آئی جو کسی انسان کی کم اور سانپ کی پھنکار زیادہ سنائی پڑتی تھی۔

"اگر اس کتے کو اتارو تو ہم ڈھنگ کی بات کر پائیں۔" میں نے اسے طیش دلانے کا حربہ آزمایا۔

"ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کم از کم سزا موت ہے اور تم نے خود اپنی موت کو دعوت دی ہے۔" اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے مجھے بشارت دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پاؤں سے میرا پاؤں دبایا۔

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ شاید وہ اکیلی ہی "سودے بازی" کے چکر میں تھی۔ میرا ہوا میں چلایا ہوا تیر عین نشانے پر لگا۔ فی الحال تو مجھے اس کے ساتھی سے نجات حاصل کرنا تھی۔

"کیسا معاملہ---؟ کس کی ٹانگ؟" میں نے بڑے تمسخر سے کہا۔

"ابھی جان جاؤ گے۔" ریکھا بولی۔

"اگر ایسے پلوں کے سر پر اکڑ رہی ہو تو ضرور سمجھا پاؤ گی۔" میں نے فضا ہموار کی۔

"مسٹر! تم مجھے طیش دلا رہے ہو۔ میں اکیلی تم جیسے دس گدھوں کو اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور کر سکتی ہوں۔" اس کی آواز میں رعد کڑکنے لگی۔ بڑی شاندار اداکاری کر رہی تھی وہ۔

"میں جانتا ہوں تمہیں پتلی بائی۔" (سیتل گھاٹی۔ انڈیا کی مشہور ڈاکو عورت) میں نے اسے چڑایا۔

"شٹ اپ۔ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو گھمایا اور زوردار تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔ میرا خون ہی کھول اٹھا' لیکن ضبط کرنا پڑا کہ یہ بھی ڈرامے کا ہی حصہ معلوم ہوتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی کار کے بریک چرچرائے اور گاڑی رک گئی۔

"تم نیچے اترو اور اڈے پر پہنچو۔ میں خود اسے لے کر آتی ہوں۔" اس نے پیچھے بیٹھے اپنے ساتھی کی طرف گردن گھما کر اسے حکم دیا۔

"لیکن دیوی جی........" اس کے ساتھی نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

"شٹ اپ اینڈ گیٹ آؤٹ۔" ریکھا کی آواز میں چھلکتے قہر نے اسے مزید کچھ کہنے کی مہلت نہ دی اور وہ اپنی رائفل سمیت نیچے اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی کار تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

"شما کرنا۔" اس کے اترتے ہی اس نے معذرت کی۔

"اوہ کوئی بات نہیں۔ اپنے دھندے میں سب چلتا ہے۔" میں نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

"کس کے لیے کام کر رہے ہو؟" اس نے فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے سوال داغا۔

"اس کے لیے۔" میں نے پیٹ پر کچھ اس انداز سے ہاتھ مارا کہ وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"خیر چھوڑو۔ میں نے بھی کیسی بات پوچھ لی۔ یہ بتاؤ "مال" کہاں ہے؟"

"میرے پہلو میں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل ہی نہ ہونے دیا۔

"مسٹر ان باتوں کے لیے میں تمہیں بہت وقت دوں گی۔" اس کی آواز اور لہجہ یکسر بدل گیا۔ "فی الوقت صرف مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب کی بات تو یہ ہے دیوی جی کہ مجھے سخت نیند آ رہی ہے اور باقی باتیں کسی خواب گاہ میں۔" میں نے تماش بینوں کے سے انداز میں کہا۔





"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے بھی دھوکہ دو گے۔ جس نے تمہارے لیے اپنے باس کو اپنے خون کا پیاسا بنا لیا ہے۔ مسٹر! وہ شخص جسے میں نے گاڑی سے اتارا ہے چند منٹ بعد ہی باس سے رابطہ کر کے اسے ساری رپورٹ دے دے گا۔ اس کے بعد جانتے ہو وہ میرا کیا حشر کرے گا؟ میں لاکھ اسے مطمئن کرنا چاہوں' لیکن اسے تھوڑا سا بھی شک ہو گیا تو وہ مجھے اذیتیں دے دے کر کتے کی موت مار ڈالے گا۔ تمہیں اس کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔" وہ خاصی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"کبھی کسی غیر ملکی کے ساتھ کام کیا ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"ریکھا دیوی! آپ کے اعتماد کا دھنواد۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں "لمبے انعام" کے وعدے اور خاصا ایڈوانس قبول پانے کے بعد ایک پارٹی کے لیے یہ کام کر رہا ہوں' لیکن یقین کرنا میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کچھ اور لوگ بھی اس معاملے میں ملوث ہیں۔"

"اور میرا بھی یہی خیال تھا' لیکن اصلیت اب میں بھی کچھ کچھ سمجھنے لگی ہوں۔" اس کی نامکمل بات نے میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک لمحے کے لیے تو سنسنی کی لہر دوڑا دی تھی۔

"میں نہیں سمجھا۔" میں نے انجان بننا چاہا۔

"خیر چھوڑو مسٹر ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اپنے دھندے میں سب چلتا ہے۔" اس نے گول مول سا جواب دے کر بظاہر مجھے مطمئن کر دیا' لیکن ایک پھانس سی میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئی۔ میں نے سوچا اگر اسے میرے متعلق ذرا سا بھی شک ہے کہ میں انڈین شہری ہونے کے باوجود پاکستان انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہا ہوں تو وہ مجھے بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھی۔

"ریکھا جی!" میری آواز خاصی رومانٹک قسم کی ہو رہی تھی۔ "یہ ٹھیک ہے کہ دولت میری کمزوری ہے۔ میں تو پروفیشنل آدمی ہوں۔ ایک پارٹی نے مجھے خود ہی اپروچ کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ کسی بڑے "بزنس ایگر یمنٹ" سے متعلق معلومات ہیں جن کی انہیں بھی دوسری پارٹیوں کی طرح ضرورت ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق وہ نیپالی شخص بھی کوئی بہت بڑا ٹھیکے دار تھا جو خود اس چکر میں تھا۔ میں نے بیچاری شاردا کے ذریعے اس تک رسائی حاصل کی۔ اسی کے ذریعے انہیں بے ہوشی کی دوا شراب میں ملا کر پلائی' لیکن "مال"

تک پہنچنے سے پہلے کوئی اور جو تمہاری طرح اس کے چکر میں تھا' میری محنت پر ہاتھ صاف کر گیا۔ مجھے تو ان کمبختوں نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ دوسری بھی کوئی پارٹی اس نیپالی کے علاوہ اس چکر میں ہے۔ ورنہ تم جانو میں ان لوگوں کا بھی بندوبست کر کے وہاں پہنچتا۔ جب میں نیپالی تک پہنچا تو وہاں دو لاشوں نے میرا خیر مقدم کیا اور میں کسی ممکنہ ہنگامے کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے جان بچا کر دوڑ رہا تھا کہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا۔ خیر میری طرف سے سب کچھ جائے جہنم میں۔ اپن کو ایڈوانس ہی اتنا مل گیا ہے کہ اب چھ ماہ تک کوئی دھندا کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے اپنا بیان ختم کیا۔

ہم لوگ ایک خاصی کشادہ سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ یہاں اکا دکا کاریں ہی ہمارے قریب سے کبھی کبھی گزر رہی تھیں۔ میری بات کے خاتمے پر اس نے میری طرف غیر یقینی کے سے انداز میں دیکھا' لیکن میرے چہرے پر پھیلی بے نیازی اور معصومیت نے شاید اسے اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ اتنی جلدی ہار کیسے مانتی۔

"تمہیں یقین ہے کہ تم سچ بول رہے ہو؟" اس نے اچانک میری طرف پلٹ کر پوچھا۔

بڑا زبردست نفسیاتی حربہ آزمایا تھا کم بخت نے۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے تمہارے سامنے جھوٹ بولنے کی ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں ریکھا دیوی۔ حالات سے نمٹنے کی ہمت مجھ میں ہے۔ پھر تم نے میری گردن پر کوئی تلوار تو رکھی ہوئی نہیں' نہ ہی میں کوئی ایسا گیا گزرا مرد ہوں کہ تم مجھے اغوا کر کے لے جا رہی ہو۔ پھر میرے جھوٹ بولنے کا مقصد؟" میں نے بظاہر اسے لاجواب کرنے کی کوشش کی تھی۔



"مسٹر---! اگر بات صرف دولت ہی کی ہے تو تمہیں میرے ساتھ سودا بازی کرنے میں کیا اعتراض ہے؟ آدھ گھنٹہ کے نوٹس پر میں تمہیں منہ مانگی رقم مہیا کر سکتی ہوں۔ اگر دھوکا دینا مقصود ہوتا تو میں اپنے ساتھی کو اتار کر اس طرح خوامخواہ اپنی موت کو دعوت نہ دیتی---!"

وہ بار بار اپنا یہ احسان جتلا کر میری مردانگی کو للکار رہی تھی یا پھر یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ بھی ان لوگوں کی کوئی اسکیم کا حصہ ہو۔ ممکن ہے انہوں نے یہی طریقہ زیادہ بہتر جانا ہو اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں چوکس ہو گیا۔ اگر یہ بات ممکن تھی تو اس کے ساتھی یقیناً ہمارے اردگرد موجود تھے اور ہم پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے کیونکہ میرے فرار کا خطرہ ان



کے سامنے بہرحال تھا۔

"ریکھا دیوی! ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔" میں نے اپنے ذہن میں ترتیب شدہ نئے منصوبے پر کام شروع کر دیا تھا کیونکہ اب جلد از جلد میں ان لوگوں کے چنگل سے نکل جانے کی فکر میں تھا۔

"کیا؟" اس نے بڑی پرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مال ابھی وہیں ہے۔ اس کے غائب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں نے اس طرف سے کسی کو بھاگتے نہیں دیکھا۔ بعد میں مجھ پر فائرنگ ضرور ہوئی ہے' لیکن کس نے کی اس کا مجھے علم نہیں۔"

"صاف صاف بات کرو مسٹر۔ میری پیش کش برقرار ہے۔" اس نے میری بات کا نوٹس لیے بغیر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آفر لگاؤ۔" میں نے پینترا بدلا۔

"ایک لاکھ۔" ریکھا کی آواز سنائی دی۔

"دس لاکھ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"پانچ لاکھ پر ختم کرو۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تمہارے علاوہ اور کوئی اس معاملے میں نہیں کودے گا۔" میں نے اسے پکا کرنا چاہا۔

"مسٹر! تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔" اس نے پریقین لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے کیش چاہیے اور ابھی۔"

اس نے یہ سنتے ہی گاڑی روک کر اسے واپس موڑ لیا۔

"کدھر؟" میں نے پوچھا۔

"میں نوٹ جیبوں میں بھر کر تو نہیں گھومتی۔ ظاہر ہے وہ کہیں سے حاصل کروں گی۔" اس نے میری تسلی کروائی۔

"لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ریکھا دیوی جیونڈیاں دے میلے۔ اگر سانس کا تانا بانا بندھا رہا تو دولت بہتیری۔ ظاہر ہے ان حالات میں میرے پیشے سے متعلق کوئی گدھا بھی ایسا خطرہ مول نہیں لے گا کہ تمہارے پلوں کے ہاتھ جا لگے۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"تمہاری تو عقل گھاس چرنے گئی ہے۔" اس نے کار کے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

"مس ریکھا! کسی انسان کی قیمت میرے نزدیک کتنی کم ہے اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتی۔" میں نے اسے وارننگ دی، لیکن اس نے پروا نہ کی۔ دوسرے ہی لمحے میرے پاؤں کے قریب چھپا خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور اس کی نوک اس کے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔

☆○☆

"گاڑی روک دو۔" میں نے اسے حکم دیا۔

"نہیں روکوں گی۔ کوشش کر دیکھو۔ کم از کم اب بھی اسٹیرنگ میرے ہاتھ میں ہے اور میں کار کو کسی بھی درخت یا دیوار سے ٹکرا دوں گی۔"

میں چکرا کر ہی تو رہ گیا تھا۔ کمبخت کسی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ واقعی کار کی رفتار اتنی تیز تھی کہ کسی بھی شے سے ٹکرانے کے بعد کار سمیت دونوں کے پرخچے اڑ جاتے۔ سڑک بھی کشادہ تھی جہاں اسے رفتار بڑھائے رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں مبتلا ہی تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں کہ اچانک کار نے جھٹکا کھایا۔ ریکھا نے نہایت تیز رفتاری سے موڑ کاٹا تھا۔ میرا سر اچانک ڈیش بورڈ سے ٹکرایا، لیکن میں سنبھل گیا۔

اس نے بمشکل گاڑی سیدھی ہی کی تھی کہ ہماری آنکھیں تیز سرچ لائٹ کی روشنی سے چندھیا گئیں۔ سڑک مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور سامنے سے اچانک سرچ لائٹ روشن ہوئی تھی۔

یہ پولیس کی پٹرول پارٹی کی جیپ تھی جسے شاید کسی پٹرولنگ جیپ نے کار کے مشتبہ ہونے یا تیز رفتاری کی خبر دی تھی اور اب وہ ناکہ لگا کر کھڑے تھے۔ مجھے اس کے ردعمل کا بخوبی اندازہ تھا اسی لیے میں نے اپنے پاؤں مضبوطی سے سامنے جما لیے تھے۔ اس نے تیزی سے بریک لگا کر گیئر بدلے۔

مجھے گاڑی کے انجن پر رشک آنے لگا کہ وہ سٹارٹ ہی رہا۔

اس وقت یہ کار کسی انگریزی فلم کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔۔۔۔ نجانے وہ کیا کر گزرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ مجھے بیک وقت ریکھا اور پولیس سے نجات حاصل کرنا تھی۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو گا؟

اس لمحے میرے ذہن میں رہ رہ کر یہی سوال سر اٹھا رہا تھا۔



"اف میرے خدایا۔" میں نے سوچا۔۔۔۔ "کیا میں یوں اچانک بے بسی سے بغیر ہاتھ پاؤں چلائے مر جاؤں گا؟"

"نہیں۔۔۔۔!" یہ میرے اندر بیٹھے کمانڈو کا فیصلہ تھا۔

کمانڈو اس طرح بے بسی سے نہیں مرا کرتے۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ میں کسی بھی لمحے کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار تھا۔

ریکھا کی ترجیحات اب بدل گئی تھیں۔ اسے سب سے پہلے پولیس سے، پھر مجھ سے نمٹنا تھا۔ وہ بیوقوف لڑکی یہ سمجھتی تھی کہ پولیس کو جل دے کر مجھے "اغوا" کر کے لے جائے گی، یہ کیسے ممکن تھا؟

میں نے اپنے ذہن میں فوراً ہی ایک منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ پولیس والے اس کار پر فائرنگ کرتے اور میں پولیس کی کسی اندھی گولی کا نشانہ بن جاتا۔۔۔۔ مجھے اس موت کی کھائی سے نجات حاصل کرنا تھی۔

کار تیزی سے ریورس ہو رہی تھی۔ ریکھا کی توجہ مجھ سے ہٹ کر مکمل کار پر مرکوز تھی اور میں اس کے بائیں ہاتھ دروازے سے لگا ہوا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ دروازہ کھولنے والے ہینڈل پر جما تھا۔ جیسے ہی ہم اس موڑ کے قریب پہنچے جہاں سے اس سڑک میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ اپنے جسم کو ایک لمحے کے لیے تولا۔ اپنی توانائیاں قدموں میں مجتمع کیں اور دوسرے ہی لمحے اندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔

ابھی میرا جسم زمین ہی پر تھا جب یکلخت کار کے بریک چرچرائے۔ اس کے ساتھ ہی دائیں کھڑکی سے ریکھا کا ہاتھ پستول سمیت برآمد ہوا۔ شاید آٹومیٹک پستول تھا، ورنہ اتنی تیز رفتاری سے وہ فائرنگ کبھی نہ کر پاتی۔

یکے بعد دیگرے چھ گولیاں میرے تعاقب میں لپکیں۔۔۔۔!!

میں نے زمین کو چھوڑا نہیں تھا۔۔۔۔ مجھے اس سے اسی سلوک کی امید تھی۔ میں ذہنی طور پر اس حملے کے لیے بالکل تیار تھا۔ میرے بدن میں بجلیاں بھری تھیں۔ سڑک پر لڑھکنیاں کھانے کی رفتار عام آدمی کے بھاگنے کے برابر ضرور رہی ہو گی۔

میں زمین پر رول کر رہا تھا لیکن ایک ہی سمت نہیں۔۔۔۔ کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی آگے، کبھی پیچھے۔۔۔۔ میرے لیے یہ کوئی نئی "ایکسرسائز" نہیں تھی۔ دوران تربیت ایسی ورزشیں ہمارے معمول کا حصہ رہتی ہیں۔۔۔۔ اپنی دانست میں ہم مشین گن کی گولیوں کی زد سے بھی بچ نکلنے پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ریکھا کے لیے البتہ یہ بالکل غیر متوقع تھا۔۔۔۔!

وہ کوئی زمین سے چپکی تو مجھ پر آگ نہیں برسا رہی تھی کہ میری حرکات کا اندازہ لگا کر فائر کرتی۔ وہ بھی اندازے سے ہی گولیاں چلا رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ طیش میں آ کر مجھے مار ڈالنا چاہتی تھی۔۔۔۔ میں نے اس کا بنا بنایا کھیل بگاڑا تھا۔۔۔۔ اسے "ڈاج" بھی کیا تھا۔

اپنی چرب زبانی سے کام لے کر اس کے ساتھی کو کار سے نیچے اتروا دیا تھا۔ اب اسے اپنے "مالکان" سے صرف اسی صورت میں معافی ملتی کہ وہ "فلمیں" مجھ سے حاصل کر لیتی، لیکن یہ "چانس" بھی پولیس نے اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں ہوا میں شائیں شائیں، ٹھائیں ٹھائیں کا غلغلہ مچا کر دم توڑ گئیں، تب تک میں فٹ پاتھ تک پہنچ چکا تھا۔

فٹ پاتھ سے زمین کچھ نیچی تھی۔ وہیں رک کر میں نے صرف ایک نظر اس طرف ڈالی تو ریکھا کا ہیولا بھی کار سے چھلانگ لگاتا دکھائی دیا، لیکن پولیس کی جیپ اس کے سر پر پہنچ چکی تھی اور انہوں نے ریکھا کو فائرنگ کرتے دیکھ کر معاملے کی سنگینی کا اندازہ بھی بخوبی کر لیا ہو گا۔



"ہالٹ" کی زوردار آواز جیپ میں لگے ا۔ہیلی فائر سے گونجی۔

ریکھا نے شاید اس کی پروا نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کا شور سنائی دیا، لیکن یہ مناظر دیکھنے کی تاب مجھ میں کہاں تھی۔ میں جانتا تھا وہ کسی بھی لمحے مجھ تک پہنچ جائیں گے۔ میں کمر کے بل جھکا پوری رفتار سے سامنے کی سمت منہ اٹھائے دوڑ رہا تھا۔ اس لمحے پورب پچھم کا کوئی اندازہ مجھے نہیں تھا بس ایک ہی خیال دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ جتنا تیز ہو سکے یہاں سے بھاگ کر نکل جاؤں۔

پولیس والے شاید ریکھا کے چکر میں الجھے ہوئے تھے یا پھر اپنی فائرنگ کا نتیجہ دیکھنے کے لیے رک گئے تھے اور یہی مہلت میری خوش بختی بن گئی تھی۔ جب تک جیپ سڑک کے کنارے پہنچتی، میں کافی دور نکل چکا تھا۔

ان لوگوں نے بھی وہاں رکنے کے بجائے میرے گرد گھیرا ڈالنے کی سوچی تھی۔ یوں اگر وہ جیپ فٹ پاتھ سے نیچے اتار لیتے تو بھی آگے انہیں صاف راستہ نہ ملتا۔ اب وہ شاید چکر



کاٹ کر مجھے گھیرنے کی فکر میں تھے کیونکہ اس علاقے سے میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کس طرف جا رہا ہوں۔

اس لمحے بجائے بیوقوفوں کی طرح ایک ہی سمت منہ اٹھا کر بھاگتے رہنے کے میں نے وہیں رک کر حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مسلسل بھاگنے سے اب میری سانس بھی پھولنے لگی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر مکانات کی قطار اور ان سے جھانکتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید یہ سڑک گھوم کر اس طرف آتی ہو گی اور پولیس نے اسی سمت سے آنا تھا۔

میں نے چند سیکنڈ تک صورت حال کا جائزہ لیا، پھر ایک انتہائی خطرناک، لیکن محفوظ فیصلہ کر کے دوبارہ سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔

میں نے دوبارہ اسی سڑک پر سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات کبھی پولیس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ میں اس طرف لوٹوں گا اور اگر انہوں نے اس امکان کو مدنظر رکھا بھی تو ظاہر ہے وہ وائرلیس کے ذریعے پولیس کی کسی دوسری گشتی جیپ کو اطلاع دے کر اس طرف روانہ کرتے اور ایسی جیپیں اپنے سائرن کی آواز سے دور ہی سے پہچانی جاتی تھیں۔ ابھی تک تو ان کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میرے لیے باعث اطمینان صرف یہ بات تھی کہ مسلسل لڑھکنیاں کھانے کے باوجود کپڑے ابھی پھٹے نہیں تھے۔ البتہ میری جیکٹ کی آستین پر مقتول کے خون کے نشانات ضرور تھے اور اس کی حالت بھی کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ خوامخواہ کسی کو مجھ پر شک ہو سکتا تھا۔ میں نے جیکٹ سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی جیبیں خالی کر کے اسے وہیں پھینک دیا۔

سڑک پر لگے ایک بجلی کے بلب کی روشنی میں، میں نے دوبارہ اپنے آپ پر تنقیدی نظر ڈالی اور کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے آج کی رات اکیلے ہی گزارنی تھی۔ صبح سے پہلے کسی سے "ملاپ" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

کلکتہ کی سی آئی ڈی کے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس ایریا کے اردگرد فائرنگ ہوئی تھی۔ پولیس نے یقیناً اب تک وہاں سے دو لاشیں بھی برآمد کر لی ہوں گی۔ ریکھا پر فائرنگ اور میرا وہاں سے فرار۔۔۔۔! یہ سب باتیں اس امر کی طرف بخوبی اشارہ کر رہی تھیں کہ یہ علاقہ جس میں، میں گھوم پھر رہا ہوں۔ پولیس کے گھیرے میں آ چکا تھا۔

یہاں کا کوئی ہوٹل، آشرم، مندر، گوردوارہ، سرائے کچھ بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ خفیہ پولیس کے جوان شکاری کتوں کی طرح مشتبہ لوگوں کے تعاقب میں تھے اور سب سے بڑھ کر

یہ کہ "مال" کے اس طرح ہاتھوں سے نکل جانے پر اس معاملے میں دلچسپی لینے والی دوسری پارٹیاں بھی ہوشیار ہو چکی ہوں گی اور وہ سرگرمی سے میری تلاش میں مصروف تھیں۔ اس وقت دل سے یہی دعا نکل رہی تھی کہ میرے ساتھی وہاں سے پیکٹ ضرور حاصل کر لیں۔ کہیں وہ کسی اور موذی کے ہاتھ نہ لگ جائے۔



کلکتہ ساری رات جاگتا ہے، لیکن اس طرح ایک مشتبہ علاقے میں مٹرگشت بھی تو ٹھیک نہیں تھا۔ پھر آخر جاؤں تو کدھر جاؤں؟ یہی کچھ میں سوچ رہا تھا۔ جب میری نظر اس سائن بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا "آنند باڈی ورکس" یہ لاریوں کی باڈیاں بنانے والی ایک درمیانے درجے کی ورکشاپ تھی۔ ورکشاپ کے باہر ایک بلب جلتا دکھائی دے رہا تھا جس کے نیچے اسٹول پر ایک گورکھا ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے اونگھ رہا تھا۔ اندر تاریکی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ میدان صاف ہے۔

میں نے ایک نظر اونگھتے ہوئے چوکیدار کا جائزہ لیا، لیکن اس طرف سے اندر داخل ہونا خطرناک جان کر ورکشاپ کی پشت پر آگیا جہاں سے دیوار پھاند کر میں اندر جا گھسا اور جلد ہی ایک زیرِ مرمت بس کی چھت پر اسی کی دو سیٹیں بچھا کر لیٹ گیا۔

میں یہاں سونے تو آیا نہیں تھا۔ میرا مقصد تو وقت گزارنا تھا۔ یوں بھی میں سونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ آنکھ لگ جاتی تو جانے کب کھلتی؟ سمندر کی ہوا نے جلد ہی میرے کس بل نکال دیئے اور فجر کے وقت تک میرا جسم دکھتا ہوا پھوڑا محسوس ہونے لگا، لیکن وہیں لیٹے لیٹے میں نے دوچار سخت قسم کی ورزشیں کر کے پسینہ بہایا اور کسی حد تک نارمل ہو کر اسی راستے سے واپس باہر نکل آیا، جس سے اندر داخل ہوا تھا۔

میرا رخ اب قریبی مندر کی طرف تھا کیونکہ یہی ایک محفوظ جگہ مجھے اب نظر آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہاں طلوع آفتاب تک کا وقت گزار کر میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ مندر سے بھجن کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں، لیکن مندر نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں آواز کی سمت سفر کرتا بالآخر اس مندر تک جا پہنچا جس کے باہر "جے کالی مائی کی" بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا اور جس کے اندر کالی ماتا اپنا بھیانک خونی جبڑا کھولے بڑے کروفر سے براجمان تھی۔

میں بھی دونوں ہاتھ باندھے، ننگے پاؤں اندر داخل ہوا اور زور زور سے گھنٹیاں بجانے



کے بعد سنگتوں میں شامل ہو کر وہیں ایک کونے میں بیٹھ رہا۔ بھجن کتھا اپنے عروج پر تھی--- اور وہاں موجود قریباً" سبھی لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر کتھا کرنے والوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ میری آمد پر کچھ متجسانہ نظریں میری طرف اٹھیں، لیکن میں نے خود کو بالکل نارمل رکھا۔ جلد ہی میں بھی اونچی اونچی آواز سے کہہ رہا تھا۔

پتیت پاون سیتا رام

رگھو پتی راگھو راجا رام



چور کی داڑھی میں تنکا---!

میری نظر اچانک ہی دروازے کی سمت اٹھی اور اس شخص پر جم کر رہ گئی جو میری آمد کے بمشکل چند منٹ بعد ہی مندر کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا--- صورت کچھ جانی پہچانی نظر آ رہی تھی۔

اچانک میں سناٹے میں آگیا۔

میرے خدایا! یہ تو وہی تھا جس نے اگلے ہی روز ہوٹل میں میرے ہاتھوں زک اٹھائی تھی۔ اس کی آمد شاید اچانک ہی یہاں ہوئی تھی ورنہ میں اسے مطلع کر کے تو یہاں آیا نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اگر اس کا تعلق بھارتی سیکورٹی سے ہے تو وہ اس مندر تک مجھے ہی کھوجتا چلا آیا ہو، کیونکہ جس جگہ میں نے ریکھا کی کار سے چھلانگ لگائی تھی وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اصولاً" انہیں دور نزدیک کے مندروں میں بھی مجھے تلاش کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ کسی دوسرے "گینگ" کا آدمی تھا تب بھی وہ لوگ میری تلاش میں اس طرف ضرور آتے، لیکن یہ بھی تو ممکن تھا وہ مقامی باشندہ ہو۔ کچھ بھی ہو مجھے بہرحال اس سے خود کو بچانا تھا۔

یہ کوئی بہت بڑا مندر نہیں تھا۔ کسی بھی لمحے میرے اور اس کے درمیان موجود ایک موٹے بنگالی کا پردہ ہٹ سکتا تھا۔ اس کے بعد میرا کیا حشر ہوتا---؟ اگر وہ صرف "جاسوس" ہی کا شور مچا دیتا تو یہ لوگ میری تکا بوٹی کر ڈالتے۔

صورت حال کی سنگینی کا ادراک ہوتے ہی میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میرے اعصاب تن گئے۔ رات کی ساری بھاگ دوڑ، بے آرامی، تھکن جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ میں گویا اپنے "جون" میں واپس آگیا۔

میرے بدن میں وہی بجلیاں کوندنے لگیں جو ہانکا کرنے والوں کے گھیرے میں آئے

ہوئے چیتے کے بدن میں کوندا کرتی ہیں۔ میں ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا--- اپنے دائیں ہاتھ سے میں نے پتلون کے نیچے پاؤں کے نزدیک چھپے خنجر کو تھپتھپایا۔

یہی میرا واحد ہتھیار تھا اور مجھے اس کے استعمال پر عبور بھی حاصل رہا تھا۔

میرے اور اس کے درمیان پچیس تیس مرد، عورتیں حائل ضرور تھے، لیکن یہ کوئی ایسی ناقابل عبور سد سکندری نہیں تھی جس کے پار اس کی نظریں جھانک نہ سکتیں۔ وہ اگر سرسری طور پر بھی وہاں موجود مجمعے پر نظر دوڑاتا تو ضرور مجھے پہچان لیتا۔ یہاں داخلے اور باہر نکلنے کے دو ہی دروازے تھے جن میں سے ایک کے پاس وہ خود موجود تھا اور دوسرا مجھ سے دور اور اس سے نزدیک تھا۔

میں نے سب سے پہلے تو اپنی جگہ چھوڑی اور کھسکتا ہوا اس موٹی سی بنگالن کے نزدیک ہو گیا جس کی خوفناک قربت سے بچنے کے لیے پہلے میں اس سے دور ہٹ کر بیٹھا تھا۔ یہ عمل میں نے بالکل غیر محسوس طریقے سے انجام دیا تھا۔ اب اس کا پوپلا اور بے تحاشا بڑھا ہوا جسم کسی حد میرے لیے ڈھال بن گیا تھا اور وہ غور سے دیکھنے پر اس کے پہلو میں میرا جھکا ہوا چہرہ نہ دیکھ پاتا۔

وقتی طور پر تو میں نے خود کو اس کی نظروں سے چھپا لیا تھا، لیکن کب تک؟ میں اب جلد از جلد وہاں سے نکلنے کے چکر میں تھا اور اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے چھپنے کے لیے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بھجن کتھا اپنے عروج پر تھی۔ ڈھولک، تاشے، چمٹے، ہارمونیم اور کتھا کرنے والوں کی ملی جلی آوازوں نے فضا کو خاصا گرما رکھا تھا۔ لوگ بڑے جوش و خروش اور خضوع و خشوع سے اپنے اپنے کام میں جتے تھے۔ میں ان کے بیچوں بیچ راستہ بناتا اس دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جس طرف اس کی پشت تھی۔ میری نظریں اس پر جمی تھیں اور ہاتھ ایک لمحے کے نوٹس پر خنجر نکالنے کے لیے تیار تھا۔ اپنی دانست میں، میں نے اسے ڈاج دے ہی دیا تھا اور اس کی پشت پر دروازے کے نزدیک اپنے جوتوں کے تسمے کس رہا تھا۔ ابھی بمشکل اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ وہ بالکل کسی غیر اختیاری فعل کے تابع میری طرف پلٹا۔

عین اسی لمحے میں بھی اس طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ایک ہی وقت میں ٹکرائی تھیں۔ نظروں کے اس ٹکراؤ سے جہاں میرے اندر دوڑتی برقی لہروں نے انتہائی شدت اختیار کر لی وہاں ایک لمحے کو اس کے چہرے پر بھی حیرت کا تاثر



ابھرا۔ میں بڑی پھرتی سے واپس پلٹا۔ باہر اتفاق سے دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تمام لوگ اندر مصروف تھے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر بھاگنا چاہا۔ ابھی بمشکل چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ میری پشت سے اس کی آواز سنائی دی۔

"ہالٹ" اس کے پکارنے کا انداز بالکل فوجیوں والا تھا۔

میں اس قریب المرگ شخص کی طرح اس کی طرف گھوما جس کی روح قبض کرنے کے لیے موت کا فرشتہ اس کے سرہانے موجود ہو اور جس کے اوسان کسی بھی لمحے خطا ہونے والے ہوں، لیکن دوسرے ہی لمحے میں نہ صرف حیرت زدہ ہوا بلکہ خوشی سے میرا رواں رواں ناچ اٹھا۔

وہ خالی ہاتھ تھا--- بالکل خالی ہاتھ!

میری توقعات کے برعکس وہ ارادتاً" ادھر نہیں آیا تھا۔ شاید کوئی مذہبی قسم کا بدمعاش رہا ہو گا۔ اچانک مجھے دیکھ کر اس نے مجھے "کھونا" مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"اپنی قوت فیصلہ تیز کرو--- بہت تیز--- تمہارے پاس صرف چند لمحات ہوتے ہیں۔ ان ہی چند لمحوں میں بہت کچھ کر گزرنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرو۔ فیصلہ کن لمحات کو ضائع نہ کرنا، دشمن بھی اسی لمحے یکساں مواقع رکھتا ہے۔ کہیں وہ تم سے پہلے کچھ نہ کر گزرے۔ اور تم بے بسی سے اپنے مرنے کا تماشہ دیکھتے رہ جاؤ---!" مجھے اپنے محترم استاد کا دیا ہوا سبق ازبر تھا۔

وہ نہتا ضرور تھا--- لیکن---!!

جہاں ہم کھڑے تھے یہ اس کی زمین تھی، اس کا وطن تھا۔ اس کے لوگ تھے۔ اس کے منہ سے بوکھلاہٹ میں نکلنے والا کوئی بھی لفظ میری زندگی کا چند منٹوں میں فیصلہ کر دیتا۔ یہ لوگ مجھے گھیر کر مار ڈالتے۔

"اسے بولنے کا موقعہ نہ دو۔" میرے شعور نے انگڑائی لی۔

"بے وقوف مت بنو۔" میں نے اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی کچھ کہنا چاہا۔ اس لمحے مجھے کہنے کے لیے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ مجھے تو بس اتنی مہلت درکار تھی کہ جھک کر خنجر کو نکال سکوں، لیکن وہ بھی بڑا منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ بولتے وقت اس نے مجھے دائیں سمت جھکتے دیکھ لیا تھا۔



"باسٹرڈ" اس نے دانت پیستے ہوئے ماہر کمانڈو کی طرح مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

اس وقت تک خنجر میری داہنی مٹھی میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے قریباً" زمین سے چپکتے ہوئے اس کا وار خالی کر دیا اور وہ میرے اوپر سے پرواز کرتا گزر گیا۔ جس لمحے وہ سنبھل کر پلٹا' خنجر حملے کی پوزیشن میں آ چکا تھا اور وہ اس نفسیاتی دباؤ کی مکمل گرفت میں تھا جو اس پر پڑ چکا تھا۔ اس نے وہی کیا جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا اور بجائے آواز دے کر اندر موجود لوگوں کو متوجہ کرنے کے مجھ سے نمٹنے کے لیے پر تولنے لگا۔ اس نے تربیت کے مطابق خنجر چھیننے کا مخصوص داؤ مجھ پر لگایا اور دائیں ٹانگ زوردار طریقے سے گھما کر قریباً" نصف دائرے میں گھومتے ہوئے میرے بازو کو نشانہ بنانا چاہا' لیکن میں چوکنا تھا۔ اس کی ٹانگ ہوا میں گھوم کر رہ گئی۔

اب اسے مزید موقع دینے سے بڑی بے وقوفی اور کوئی نہ ہوتی۔ اس دفعہ پہل میں نے کی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ گھوم کر حملہ آور ہو' میں اپنی جگہ سے اچھلا' اس کی پشت پر آیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جما اور خنجر میں نے اس کے عین دل میں گھونپ دیا۔

یہ سب کچھ محض چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ بقائے ذات کے احساس نے مجھ میں ایک عالم کی توانائیاں بھر دی تھیں۔ میں خود کو عام حالات سے چار گنا زیادہ پھرتیلا اور طاقت ور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس احساس نے کہ کسی بھی لمحے کوئی اس کی مدد کو پہنچ جائے گا' میرے بازوؤں میں بجلیاں بھر دی تھیں اور میں بالکل مشینی اندازا میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

اسی ایک وار پر ہی میں نے اکتفا نہیں کیا تھا۔ یکے بعد دیگرے دل کے نزدیک میں نے تین گہرے وار کیے اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب اس کا کام تمام ہو چکا تو میں نے خنجر باہر کھینچا اور بھاگنے کے لیے واپس پلٹا مگر ٹھٹک کر رہ گیا۔



پوجا کے لیے آنے والی ایک نوجوان لڑکی مندر سے محض پانچ چھ گز کی دوری سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ شاید خوف نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔ میری زندگی کے کمزور ترین لمحات میں سے ایک لمحہ وہ بھی تھا جب میری نظریں اس سے دوچار ہوئیں۔ وہ لڑکی کسی بھی لمحے زبان کھول کر مجھے مروا سکتی تھی۔ یرغمالی بنا کر اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ بہرحال میں مسلمان تھا اور ایک مسلمان فوجی کے شایان شان ہرگز یہ نہیں کہ وہ کسی کمزور لڑکی کی آڑ میں زندگی کی پناہ تلاش کرے۔



جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے' اگر ان کا واسطہ پاکستانی فوج سے پڑا ہو تو یقیناً وہ اپنا یہ نظریہ بدلنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ بغیر کچھ کہے سنے میں نے ایک سمت دوڑ لگا دی۔ میرے ایک ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا اور کپڑوں پر بھی جابجا خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ میری حالت ان غنڈوں جیسی تھی جو بھرے بازار میں قتل کر کے خنجر لہراتے ہوئے بھاگ جایا کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں غنڈہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ میرا ملک تھا----!

----یہ سب کچھ مجھے بادل نخواستہ اپنی جان اور ملکی راز بچانے کے لیے کرنا پڑ رہا تھا اور یہ اس کھیل کا حصہ تھا جو ہم کھیل رہے تھے۔ دنیا کے ہر کھیل کے اپنے اصول ہوتے ہیں' لیکن اس کھیل کے قواعد کبھی طے نہیں ہوئے نہ کبھی طے ہو پائیں گے۔ یہاں حریف اپنے مقابل کو دھوکہ دیتا ہے۔ قدم قدم پر فریب دیتا ہے یا پھر فریب کھاتا ہے۔

فریب اس کی نگری میں طے شدہ اصولوں پر دھندا نہیں ہوا کرتا۔

یہاں قدم قدم پر محتاط رہ کر نہ صرف اپنا کام کرنا ہوتا ہے بلکہ خود کو بچانا بھی ہوتا ہے کہ اس کھیل میں ایک زندگی سے نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سی زندگیاں وابستہ ہو جاتی ہیں۔

میں نے بھارت کے بھرے پرے شہر کلکتہ میں ایک شخص کو جو نجانے بھارتی خفیہ مشینری ہی کا کوئی کل پرزہ رہا ہو' موت کے گھاٹ اتار دیا تھا---- اب میرے لیے یہاں ہر سمت موت تھی---- موت----!!

موت میرے تعاقب میں تھی----!

اور میں دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ زندگی کی طرف۔ زندگی کی اس سرحد کی طرف جو مجھ سے فی الوقت دور ہی دور ہٹتی چلی جا رہی تھی۔ میرے لاشعور میں بس اگر خوف کا کوئی ہلکا سا پرتو بھی تھا تو اس پر زندگی کو بچانے کی جدوجہد غالب آ رہی تھی۔ میں اس طرح بے بس کیچوؤں کی طرح مرنے تو یہاں نہیں آیا تھا۔ یوں بھی جیتے جی شکست مان لینا میری سرشت ہی میں شامل نہیں تھا۔

خنجر میں نے بھاگتے بھاگتے اپنی مخصوص جگہ پر اڑس لیا تھا۔ سمت' فاصلہ' وقت---- یہ سارے احساسات میرے نزدیک دم توڑ چکے تھے۔ زندگی بچانے کا جذبہ تمام جذبوں پر غالب تھا۔ راستے میں لوگوں سے ٹکراؤ بھی ہوا لیکن اس شہر کی روایت کے مطابق کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی نے کوئی استفسار نہیں کیا۔

لوگوں نے مجھے کوئی "دادا" یا اس کا "چمچہ" یا پھر کوئی "جوگنگ" کا شوقین سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو گا۔ لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپا کر دوڑتے ہوئے مجھے اور تو کچھ نہیں، اپنی سلامتی کی دعاؤں کو اٹھے اپنی ماں اور بہن کے ہاتھ ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ تب میرے دل سے ایک ہی دعا نکلی کہ خدایا! اس طرح بے بسی کی موت سے بچانا--- اگر مرنا ہی نصیب میں ہے تو میدان جہاد میں شہادت سے سرفراز کرنا۔



وہ قبولیت کا لمحہ تھا---!

قدرت کو میری حالت پر رحم آ گیا۔ میری آنکھوں کی چمک اس ڈرائیور کو دیکھ کر دوچند ہو گئی جو ایک جگہ کنارے کھڑی اپنی ٹیکسی کا بونٹ بند کر کے اب ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رہا تھا۔

یہ کوئی مقامی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو اپنے دھندے پر جانے کی تیاری میں تھا۔ مجھے اس کا آج کا پہلا گاہک بننا تھا۔ یہی میرا آخری فیصلہ تھا۔

زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

اپنی جگہ رک کر میں نے اپنی منتشر سانسوں پر کنٹرول حاصل کرتے ہوئے اس مبارک ساعت کا انتظار شروع کر دیا، جب اس نے انجن سٹارٹ کرنا تھا۔ جیسے ہی اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی مجھے اپنے تعاقب میں اچانک یہ شور سنائی دیا۔

"خونی--- قاتل--- پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔"

مزید لمحات ضائع کرنے کی بجائے میں برق رفتاری سے آگے بڑھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔

میری صورت اور ہاتھ میں خنجر دیکھتے ہی خوف سے اس کی گھگی بندھ گئی۔ میں نے خنجر اس کے پہلو میں چبھوتے ہوئے اسے خبردار کیا۔

"میں قتل کر کے بھاگا ہوں اور تمہاری جان لینے میں بھی ایک لمحہ دریغ نہ کروں گا اگر تم نے میرا کہنا نہ مانا---!"

خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں وہ ڈرائیونگ کے قابل ہی نہ رہا تو اور کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ اپنے تعاقب میں اٹھتے شور کو اب میں ہی نہیں، وہ بھی سن رہا تھا۔ پکی عمر اور سیاہ رنگ کے مریل سے جسم کے مالک ڈرائیور



کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگی تھیں۔

"چلو!" میں نے دھاڑتے ہوئے اس کے پہلو پر دباؤ بڑھایا۔

"بابا بابو--- چ چلے گا۔" اس کے منہ سے بے ربط الفاظ کی گردان جاری تھی جب اس نے گیئر لگایا۔

گاڑی سٹارٹ تو تھی ہی۔ میں نے ایکسیلیٹر کے پیڈل پر پاؤں رکھ کر اسے خاصا دبا دیا۔ گاڑی نے زوردار جھٹکا کھایا تو اسے ہوش آیا۔ بمشکل اس نے گاڑی کو سنبھالا اور چل پڑا۔

"تیز چلو--- تیز!" میں نے اگلی وارننگ دی۔

گاڑی کی رفتار بڑھنے لگی لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ اسے کس طرف لے جاؤں۔ یہ علاقہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ خوف سے اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ سڑک پر ابھی ٹریفک چلنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک کم از کم مجھے راستے میں کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی، پھر بھی مجھے ڈر تھا کہیں وہ خوف کے عالم میں اپنے ساتھ مجھے بھی نہ لے ڈوبے۔

"دیکھو بابا۔ اپن کوئی غنڈہ نہیں ہے شریف آدمی ہے تمہاری طرح۔" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی پتلون کی پچھلی جیب سے اپنا پرس نکال لیا۔ "اس سالے نے بہت تنگ کر رکھا تھا ہمیں۔ دادا گیری کرتا تھا سالا۔ ادھر کسی چھوکری لوگ کا عزت اس کے ہاتھوں محفوظ نہیں تھا۔ ہماری جورو کو بھی بے عزت کیا تھا اس نے۔ اپن بمبئے سے اس سے بدلہ لینے آیا تھا۔ میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ تمہارے کام کا انعام ملے گا۔"

اتنا کہہ کر میں نے دو بڑے نوٹ اس کی گودی میں پھینک دیئے جو اس کی اوقات سے بہت زیادہ تھے۔ اس کے چہرے کی زردی میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہونے لگی تھی۔

"کوئی گھپلا نہ کرنا۔ اپن تمہاری گاڑی نہیں چھینے گا، بس راستے ہی میں اتر جائے گا۔"

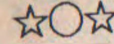
میں نے اپنی باتوں کا ردعمل اس کے چہرے پر تلاش کرنا چاہا جو اب آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔

"بابو تم بے فکر رہو۔ ہم بھی جاٹ کی اولاد ہے۔ غیرت والے کا ساتھ دیتا ہے۔ ہم آپ کی مدد کرے گا۔" اس کا حوصلہ واقعی بڑھنے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم بھی جاٹ ہے۔ تمہارے احسان کا بدلہ ضرور چکائیں گے۔ مجھے فوراً کسی ویران جگہ کے نزدیک اتار دو۔"

میں نے یہ کہہ کر خنجر بھی اس کے پہلو سے ہٹا لیا۔

"ضرور" کہہ کر اس نے ایک موڑ پر گاڑی گھما دی۔



وہ واقعی کسی "جاٹ کی اولاد" تھا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ہم قدرے ویران سڑک کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں شاید کوئی حکومتی کالونی زیر تعمیر تھی جس کی ابھی سڑکیں ہی بنی تھیں۔ ایک قدرے محفوظ مقام دیکھ کر میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی روک کر اس نے انجن بند کر دیا اور جیسے ہی گردن گھما کر میری جانب متوجہ ہونا چاہا۔ میں نے بادل نخواستہ ایک ہاتھ اس کی گدی پر جما دیا۔ بے چارہ دھان پان سا آدمی بغیر منہ سے کوئی آواز نکالے بے ہوش ہو گیا۔

میں نے اسے سیٹ سے کھینچ کر زمین پر لٹا دیا اور قمیص سے بے نیاز کر دیا۔ دوسرے ہی منٹ میں، میں اس کی قمیص پہنے وہاں موجود تھا۔ دونوں نوٹ میں نے اس کی پتلون کی جیبوں میں ٹھونسے۔ دل ہی دل میں اس سے اپنے اس بہیمانہ سلوک پر معذرت کرتے ہوئے اسے اپنے کندھے پر لادا اور قریبی سرکنڈوں کے پیچھے آرام سے لٹا کر اس پر اپنی قمیص بھی ڈال دی تاکہ نیند میں خلل نہ آئے۔



واپسی پر میں نے اس کی ٹیکسی کو چلایا نہیں اڑایا تھا۔

میری نظریں بار بار فیول گیج کی طرف اٹھتی تھیں۔ ٹیکی شاید اس نے رات کو بھروا کر ہی گاڑی بند کی تھی، لیکن اب میں جلد از جلد اس "مصیبت" سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا---- بہت سے لوگوں نے مجھے ڈرائیور سمیت اس ٹیکسی کو اغوا کرتے دیکھا تھا اور ابھی تک تو اس کی نمبر پلیٹ بھی وہی تھی۔

کسی بھی لمحے کچھ بھی ممکن تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کمال مہربانی سے ایسا راستہ اپنایا تھا جس پر پولیس کی گشتی کار نے ہمیں نہیں دیکھا ورنہ اب میں کسی اور معرکے میں الجھا ہوا ہوتا۔

ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے ٹیکسی وہاں پارک کر دی۔ چابیاں اگنیشن سے نکال کر سیٹ پر رکھ دی تھیں تاکہ پولیس جب اس ٹیکسی کو بازیاب کرے تو اس بے چارے ڈرائیور کو نئی چابیاں کم از کم نہ بنوانی پڑیں۔

ٹیکسی سے نکل کر میں نے تین چار سڑکیں یکے بعد دیگرے عبور کیں۔ دفتروں کا وقت



ہو رہا تھا۔ لوگوں کا اژدہام آ اور جا رہا تھا۔ ٹریفک کی ریل پیل شروع ہو چکی تھی، دکانیں کھل رہی تھیں، لیکن میں جانتا تھا ابھی کوئی ایسا سٹور نہیں کھلا ہو گا جہاں سے میں قمیص خرید کر پہن لوں۔

قدرت نے پھر اس مشکل کا حل بھی نکال دیا۔

اس مرتبہ میں جس گنجان آباد بازار میں گھسا وہ ہمارے ہاں کے "جمعہ بازار" قسم کی کوئی مارکیٹ ہو گی۔ مختلف ریڑھیوں پر آوازیں لگا لگا کر سامان فروخت کیا جا رہا تھا---- ایک کونے میں سستے قسم کے ملبوسات لٹکائے بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے۔

میں نے وہیں سے ایک درمیانے درجے کی قمیص خریدی۔ وہیں کھڑی ہو کر سائز چیک کرنے کے بہانے قمیص تبدیل کی، پھر پرانی قمیص کو بنڈل بنا کر بغل میں دبایا اور منہ اٹھائے ایک طرف چل دیا۔ اس مرتبہ دو تین گلیاں عبور کرنے پر ایک بس نظر آئی جس پر قطار بنا کر لوگ سوار ہو رہے تھے۔ میں نے بھی موقعہ غنیمت جانا اور اس قطار میں شامل ہو گیا۔

مجھے کچھ علم نہیں تھا یہ بس کہاں سے آئی اور کہاں جا رہی ہے؟

بس ایک ہی دھن سوار تھی جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانے کی دھن۔ مجھ سے آگے والی سواری نے جہاں کا ٹکٹ لیا تھا، وہیں کا ٹکٹ میں نے بھی خرید لیا۔ قریباً پندرہ منٹ کے سفر کے بعد جب وہ سواری اترنے لگی تو میں بھی نیچے اتر آیا۔

یہ کوئی بڑی مارکیٹ تھی----!

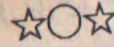
مارکیٹ کے ایک کونے میں کھانے پینے کی کئی دکانیں سجی تھیں۔ ایک درمیانے سے ریستوران میں بیٹھ کر میں نے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا۔ چائے پی کر اب میں خود کو قدرے تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو ہمارے "ملاپ" (پی ایم) کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ اب مجھے کسی نزدیکی ٹیلی فون بوتھ سے ایک نمبر ڈائل کرنا تھا۔

اس پیشے میں کسی بھی ایجنٹ پر سب سے نازک گھڑی یہی ہوتی ہے جب اسے اپنے کسی دوسرے ساتھی سے ملاپ کرنا ہوتا ہے---- ان خطرناک لمحات میں کسی ایک کی غلطی کا خمیازہ لاکھ محتاط ہونے پر دوسرے کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

اس سے پہلے میں "مقامی دوستوں" کے دھوکے میں ریکھا کے ساتھ سفر کے خطرناک مرحلے سے گزر چکا تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ زندگی کسی کو بار بار سنبھلنے کا موقع نہیں دیا کرتی۔ اگر اس مرتبہ معمولی چوک بھی ہو گئی تو عین ممکن ہے، پھر سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔

یہی کچھ سوچتا میں اس میڈیکل سٹور کی طرف جا رہا تھا جس کے ایک کونے میں "ٹیلی

فون دستیاب ہے" کی تختی لگی ہوئی تھی۔



پہلی ہی کوشش پر نمبر مل گیا۔۔۔۔!

"وجے بیکرز" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"دیکھئے میں دت بول رہا ہوں۔ انڈے پہنچ گئے ہیں۔" میں نے کوڈ دہرایا۔

"ہولڈ آن پلیز۔" دوسری طرف سے انتظار کرنے کو کہا گیا۔

بمشکل تین چار سیکنڈ بعد ہی دوسری طرف سے جواب آیا۔

"مسٹر دت انڈے تو پہنچ گئے ہیں۔ آپ کہاں ہیں؟"

میں نے اب تک اس بازار اور میڈیکل سٹور کا نام حفظ کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ذرا انتظار کرو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میڈیکل سٹور کے آگے فٹ پاتھ پر تخت پوش بچھائے ایک اخبار فروش اپنی دکانداری چمکا رہا تھا۔ تخت پوش پر اس نے کلکتہ کے درجنوں اخبار سجا رکھے تھے اور اس کے گرداگرد مفت خبریں پڑھنے اور ان پر تبصرہ کرنے والوں کی فوج ظفر موج نے حملہ کر رکھا تھا۔

ہندی کا ایک اخبار خرید کر جس کا نام ہی میں بمشکل پڑھ سکا' وہیں ایک کونے میں کھڑے ہو کر میں "غرق مطالعہ" نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے کھڑے ہونے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ سڑک پر کسی بھی طرف سے آنے والے کو بخوبی دکھائی دے سکوں۔ بمشکل دس منٹ ہی گزرے تھے جب نزدیک ہی ایک کار پارک ہوئی جس سے میں نے مسٹر ناگرک کو برآمد ہوتے دیکھا۔

میرے نزدیک وہ اس طرح چلتے ہوئے آئے تھے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں' پھر اچانک "ہیلو" کا نعرہ لگا کر مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔

میں نے بھی کچھ کم گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"کہیے کیسی رہی؟" میں نے کار میں بیٹھتے ہی بے چینی سے پوچھا۔

"ونڈر فل۔ ویل ڈن۔ ایکسیلنٹ۔ کمانڈو یو آر گریٹ۔۔۔۔!" وہ جوش جذبات اور محبت میں میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے اور میں شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔



"بھئی سچی بات ہے یہ مار دھاڑ ہم سے تو ہونے سے رہی۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں جواب سن کر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ تم ریکھا کے ہتھے چڑھ گئے۔ بس اندازے کی غلطی ہو گئی۔ بہت فکر تھی مجھے۔ خدا کا شکر ہے ورنہ بہت شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ چلو اس سے بھی نجات ملی۔ یہ کمبخت ہمارے لیے خوامخواہ کی مصیبت بنی ہوئی تھی۔"

"مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ماری گئی۔ پولیس نے مار دیا۔ وہ وحشیانہ انداز میں ان پر فائرنگ کر رہی تھی۔ شاید احساس ناکامی نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ دو گولیاں لگی ہیں انسپکٹر کو۔ مجبوراً" انہیں جوابی گولی چلانا پڑی اور وہ ماری گئی۔" انہوں نے مجھے ساری کہانی سنا دی۔

مجھے حیرت تھی ان لوگوں کو آج رات کے واقعات کا علم بھی ہو گیا۔ کتنے باخبر لوگ تھے یہ۔۔۔۔ اپنے کام میں ماہر۔۔۔۔!

"افسوس ہمارے ایک ساتھی کی نالائقی کی وجہ سے تمہیں یہ سب کچھ بھگتنا پڑا۔"

بہرحال میں نے جواب میں گہری سانس لی۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک ماڈرن آبادی میں ہوا۔ ایک بنگلے کے سامنے گاڑی پارک کر کے انہوں نے گھنٹی بجائی۔ گورکھے چوکیدار نے جو شاید اندر اکیلا ہی موجود تھا دروازہ کھول کر ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی انہیں پرنام کیا۔ گردن کو معمولی سا خم دے کر جواب دیتے ہوئے مسٹر ناگرک دوبارہ کار میں آ گئے۔

کار انہوں نے اندر گیراج میں پارک کی اور ہم دونوں ایک شاندار ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔

"میرے خیال سے دوپہر تک تم آرام کرو کیونکہ رات کو پھر "شب بیداری" کرنی پڑے گی اور سفر بھی شاید آرام دہ نہ ہو۔۔۔۔" انہوں نے ملحقہ بیڈروم کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے مجھے کہا۔

"او۔کے" کہہ کر وہ بغیر کچھ کہے سنے باہر چلے گئے۔

عجیب پراسرار لوگ تھے۔ ان کا ہر عمل میری توقع کے خلاف تھا۔ مجھے تو امید تھی کہ وہ میری ساری کہانی سنیں گے۔ میں ان سے بعد کے واقعات سنوں گا' لیکن انہوں نے اس موضوع پر ایک فقرہ بھی نہیں کہا تھا اور مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلے گئے تھے۔

بڑے محتاط لوگ تھے۔۔۔۔!

ان کے "بزنس" کے تقاضے کتنے عجیب تھے۔ انہیں بسااوقات خود پر کتنا جبر کرنا پڑتا تھا۔ اپنی فطرت کے برعکس مصنوعی صورت حال پیدا کرنا اور اسے پھر مستقل برقرار رکھنا واقعی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

میں بیڈروم میں آیا تو آرام دہ بستر پر سلیپنگ سوٹ دھرا تھا۔ اٹیچڈ باتھ روم میں غسل کرنے کے بعد میں خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

اس رات میں واقعی گھوڑے بیچ کر سویا۔ صبح بیدار ہوا تو روشندان سے دھوپ سامنے والی دیوار پر رینگ رہی تھی۔ مجھے کسی نے جگایا نہیں تھا شاید ان لوگوں کو یہی ہدایت ہو گی کہ فی الوقت مجھے آرام کرنے دیا جائے۔ عمارت میں صرف ایک ملازم موجود تھا۔ اس نے مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر اپنا کام شروع کر دیا تھا اور جب میں نہا دھو کر فارغ ہوا تو مؤدب ملازم نے ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم کی طرف میری راہنمائی کی۔

کمرے کے ایک کونے میں ٹیلی فون دھرا تھا۔ ابھی میں ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا جب ٹیلی فون نے اچانک ٹرانا شروع کر دیا۔ دوسرے کمرے سے اسی ملازم نے آکر فون اٹینڈ کیا اور پھر مجھے اشارتاً" بتایا کہ یہ کال میرے لیے ہے۔

فون مجھے تھما کر وہ دوبارہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ دوسری طرف مسٹر ناگرک مجھ سے مخاطب تھے۔ انہوں نے مجھے دوپہر تک کا وقت یہیں گزارنے کی تاکید کی اور یہ بھی بتایا کہ میرے نئے سفر کا آغاز دوپہر کے کھانے کے فوراً" ہی بعد ہو جائے گا۔

دوپہر تک میں ڈرائنگ روم میں رکھے اخبارات اور رسالوں کے ڈھیر سے دل بہلاتا رہا۔ یہاں ہندی اور بنگلہ زبان کے اخبارات بھی موجود تھے لیکن مجھے دونوں زبانیں نہیں آتی تھیں۔ انگریزی کا کوئی ایسا اخبار یا رسالہ نہیں تھا جس میں پاکستان کے خلاف جی بھر کر زہر نہ اگلا گیا ہو----! ہر اخبار اور رسالے میں بڑی بڑی تصاویر تباہ حال بنگالیوں کی سجائی گئی تھیں۔ بعض تصاویر دیکھ کر تو یہ گمان گزرتا تھا جیسے یہ "ماڈل" ہوں یا پھر اداکار جنہیں ایسی تصاویر بنوانے کے لیے اچھا خاصا معاوضہ ادا کیا گیا ہو۔

مجھے علم تھا کہ یہاں جو کچھ لکھا ہے' جو کچھ چھپا ہے' وہ جھوٹ ہے۔

یہ جھوٹ ایک پلان کے تحت---- ایک تنظیم کے تحت بولا جا رہا تھا---- جو بولنے والے تھے ان کی اپنی جھوٹ بولنے کی ایک تاریخ تھی۔ انہوں نے سیکھا ہی یہ تھا کہ جھوٹ بولتے چلے جاؤ' وہ خود ہی سچ بن جائے گا----! ممکن ہے یہ بات غلط رہی ہو---- لیکن تاریخ کبھی کبھی غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط کر دیتی ہے---- یہ تاریخ کا المیہ ہے۔



اور ایسا ہی ہوا----!

یہ الگ بات کہ جھوٹ میں جو کراہت ہوتی ہے۔ وہ جلد یا بدیر جھوٹ اور سچ کا "نتارا" کر دیتی ہے۔

تاریخ نے ہر قدم پر اپنا عمل دہرایا۔ اگر بھارتی حکمرانوں نے جھوٹ کے بل بوتے پر ہمیں دولخت کیا تو انہیں بھی اس کھیل میں مات ہوئی۔ ہم تو ہار کر ہارے----!

لیکن ہندو جیت کر ہار گیا----!!

کبھی تاریخ نے اپنا تجزیہ خود کیا تو اس حساب کتاب میں منوجی کے پیروکاروں کو صفر نمبر بھی نہیں ملے گا۔ بے گناہ بنگالیوں کے خون سے چانکیہ کے چیلوں نے جو تاریخ لکھی تھی' وقت نے اسی تاریخ کو جلا کر راکھ کر دیا اور یہ خاک بن کر اب ہندو کے منہ پر مل جا چکی ہے---- ڈھٹائی کی بات الگ ہے ورنہ ہونی سب کے سامنے ہو گئی۔

ابھی اس گھناؤنے کھیل کو رچانے والی دیوی کے وہ الفاظ کہ آج میں نے نظریہ پاکستان کو بحرہند میں ڈبو دیا' فضا میں ہی تھے جب تیتو میر شہید کے پیروکاروں کو ہوش آ گیا----

اس کے بعد انہوں نے وہ کر دکھایا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

نہ تو کھیل کھیلنے والوں نے ایسا سوچا تھا---- نہ ہی شطرنج کے مہروں کو یہ گمان گزرا تھا----!



میں نے ان بظاہر مظلومیت کی جعلی تصویروں کے پس پردہ دکھائی دیتی منافقت کا گیان ہوتے ہی اخبارات ایک طرف پھینک دیئے اور ریڈیو آن کر لیا----!

پھر مجھے ریڈیو بھی بند کرنا پڑا۔ یہاں بھی وہی کچھ کہا جا رہا تھا جو ان اخبارات میں لکھا یا لکھوایا گیا تھا۔

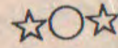
میں نے ریڈیو کا سوئچ بھی آف کر دیا۔

کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ منظر بدل جائے۔ کم از کم میں جھوٹ کی اس نگری سے باہر آ جاؤں۔ تازہ ہوا میں کچھ سانس لے سکوں۔

اس بنگلے کے لان سے باہر کا منظر دکھائی پڑتا تھا۔ میں نے محسوس کیا اس بنگلے کے باہر لاکھوں کی تعداد میں موجود لوگ بھی اس کریہہ منظر کے بدلنے کے منتظر تھے جو مکمل ہی نہیں ہو رہا تھا۔

جسے براہمنی ذہنیت مکمل ہی نہیں ہونے دیتی تھی۔

میری طرح یہ لاکھوں لوگ بھی نامکمل منظر بدلنے کا عذاب بھوگ رہے تھے۔ بے چارے لوگ----!



دوپہر کا کھانا بھی مجھے اکیلے ہی کھانا پڑا----!

ابھی تک ہم دو آدمی ہی یہاں موجود تھے یا پھر تیسرا وہ گورکھا چوکیدار جو باہر دروازے پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مسٹر ناگرک ایک بنگالی کے ساتھ وہاں آ گئے۔ بنگالی نے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا، اپنا نام نہیں بتایا تھا---- اس دھندے میں شاید آدمی کا کوئی نام رہ ہی نہیں جاتا۔ یہ بے نام لوگ ہوتے ہیں جو بسااوقات وہ کر گزرتے ہیں جو صرف سوچا جا سکتا ہے۔

"مجھے اب جانا ہو گا۔ تمہارا سفر شروع ہونے والا ہے۔ اب یہی تمہارا راہبر ہے۔ ایسا کہنا بہت عجیب لگتا ہے، لیکن ہم روایتی لوگ ہیں ناں---- اس لیے کہہ رہا ہوں اگر ہماری میزبانی میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو برا مت ماننا۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں عجیب بات کہہ دی تھی۔

بسااوقات ہم بہت کچھ ایسا کہہ دیتے ہیں یا سن لیتے ہیں جو کہنے سننے کی امید نہیں رکھتے۔ میں اس انسان کو دل ہی دل میں خراج عقیدت پیش کیے بغیر نہ رہ سکا جو اس قیامت کی گھڑی میں بھی مجھے مہمان اور خود کو میزبان سمجھ رہا تھا۔

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا---- خاموش ہو رہا۔ خاموشی کی زبان پراسرار سہی لیکن ہوتی بہت سیدھی ہے۔ عین دل پر لگنے والی۔ دل میں گھر کرنے والی۔ شاید انہوں نے میرے چہرے پر اپنے لیے بچھی عقیدت میں، میری آنکھوں میں اپنے لیے ہلکورے لیتے احترام میں---- اپنے سوال کا جواب پا لیا تھا۔

"او۔کے کیپٹن۔ خدا حافظ----!" کہہ کر انہوں نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور چل دیئے۔

اس لمحے مسٹر ناگرک نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا ان لمحات میں انسان کتنا کمزور ہو جاتا ہے۔

میں اس زمین کا مسافر تھا جو ان کی زمین تھی۔ جو ان کی پہچان تھی۔ جس کے لیے وہ



دیارِ غیر میں بھیس بدل کر، بہروپ بھر کر عجیب عجیب سوانگ رچا کر اپنی زمین کی حفاظت کر رہے تھے۔ اپنی پہچان کو زندہ رکھنے کی جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔



میرے بنگالی ہم سفر نے چند منٹ بعد روانگی کا سگنل دے دیا۔

ہم دونوں گھر سے باہر نکلے تو میرا حلیہ خاصا بدلا ہوا تھا۔ اگر میں زبان نہ کھولتا تو مجھ میں اور مقامی باشندوں میں کوئی تمیز باقی نہ رہتی۔ بس ایک میرا قد ذرا زیادہ لمبا تھا۔ ہم دونوں نزدیکی ریلوے اسٹیشن پر آئے تھے۔ یہاں سے ایک گاڑی سیالدہ کی طرف جا رہی تھی جس کے ذریعے ہم نے سفر کرنا تھا۔ اس درمیان ہمارے درمیان بمشکل دو باتیں ہی ہوئی تھیں۔

شام ڈھلے ہم دونوں سیالدہ اتر گئے۔ یہاں سے ہمیں واپس سرحد عبور کرنی تھی۔ میں اس کے تعاقب میں قدرے ویران علاقے کی طرف جا رہا تھا۔ قریباً" آٹھ دس میل کا سفر ہم نے پیدل طے کیا۔ یہ سرحد محفوظ بھی تھی اور غیر محفوظ بھی۔

محفوظ یوں کہ دونوں اطراف سے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور بھارتی سرحدی محافظ عموماً" پاکستان کی طرف سے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ انہیں ہر ممکن سہولت اور کور بھی دیتے تھے۔ غیر محفوظ یوں کہ اس طرف سے واپس پاکستان جانے والوں کو گرفتار کرنے کا تکلف نہیں کیا جاتا تھا اور فوراً" گولی مار دی جاتی تھی----!

میرا گائیڈ بہت منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔

اس کے لیے اس علاقے میں کچھ اجنبی نہیں تھا۔ میں ایک کمانڈو تھا اور اس کھیل کی اونچ نیچ جان سکتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے بہت محفوظ راستہ اپنایا ہے۔

رات اپنی تمام تر وحشتوں کے ساتھ آسمان سے زمین پر اتر آئی تھی۔ ہمارے چاروں اور سناٹا طاری تھا---- ایک پراسرار سی خاموشی بالکل ویسی ہی خاموشی جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے، کوئی بھی صاحبِ نظر دیکھ سکتا تھا کہ اس خاموشی کے پہلو میں کیا کیا عذاب زمین پر اترنے والے ہیں۔

اس اندھیرے میں چھپی بشارت کا اندازہ مجھے اس لیے بھی ہو رہا تھا کہ ہمیں مملکت خداداد کے اس خطے پر رچائے گئے اس کھیل میں چلی گئی شاطرانہ چالوں کا قدرے ادراک رکھنا تھا۔

لیکن----!

صرف میرا جان لینا کافی نہیں تھا۔ اس عذاب سے جن کو آگاہی ضروری تھی، ان کے تو کبھی کان پر جوں ہی نہیں رینگی۔ ان کے لیے تو جیسے یہ سب معمول کی کارروائی تھی۔ تاریخ کا بڑا اہم سبق یہی ہے کہ وہ قوموں کو سمجھنے کا موقعہ تو دیتی ہے، سنبھلنے کا موقعہ کم ہی نصیب ہوا کرتا ہے۔

جب اہل دل چلا چلا کر آنے والے عذابوں کی بشارت دے رہے تھے تو ان کا تمسخر اڑایا گیا---- اور یہی کہا گیا کہ بھارت کبھی ایسی جرات نہیں کر سکتا۔ بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ خون اور زمین کا اتنا مضبوط رشتہ اتنی جلدی ٹوٹ جائے گا؟

لیکن ہونی شدنی----!

ایسا ہو کر رہا اور یہ مضبوط رشتے روئی کے گالوں کی طرح دھنک کر رکھ دیئے گئے۔

رات کے اسرار کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ تب شاید میں بھی اسی حسن کا اسیر ہو رہا تھا۔ اس پراسرار سناٹے کی زبان مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی اور میں بڑے خشوع و خضوع سے سن رہا تھا۔ میرا ہم سفر اپنے فن میں طاق تھا۔ وہ مجھے بڑے محفوظ راستوں پر چلاتا بالآخر اپنی منزل پر لے آیا جہاں پاکستان آرمی کے جوان ہمارے منتظر تھے۔

اپنوں میں لوٹ کر دلی جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے؟ یہ بات صرف مشاہدے میں آ سکتی ہے، بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس لمحے جب میں اور میرا ساتھی سرحدی علاقے کی اس پوسٹ پر ایک طرف چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور وہاں موجود جوان ہماری خاطر داری کرنے میں لگے تھے تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"پاکستان----!" اس نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر بنگالی لہجے میں جواب دیا۔ میں حیرانی سے ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

"ہاں صاحب ہمارا نام بھی، کام بھی، دین بھی، دھرم بھی، گھر بار سب کچھ پاکستان سے ہے۔ تو یہی نام ٹھہرا ناں ہمارا----!" اس نے میری حیرانی کو محسوس کر لیا تھا۔

بنگالی مسلمان کے منہ سے نکلی اس بات نے مجھے سن کر کے رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں وہ سب جھوٹ ہے اور جو اس معصوم بنگالی نے کہا، وہ سچ ہے۔

وہی سچ ہے----!

لیکن کیا ہم اس سچ کا بھرم قائم رکھ پائیں گے؟



تب یہی ایک سوال مجھے کچوکے دیتا رہا---- میں نے اس کے بعد اس سے کوئی اور سوال نہیں کیا۔

# گھر کا بھیدی

صبح پو پھٹنے سے پہلے میرا ساتھی رخصت ہو گیا۔

ان لوگوں کو پاکستان کی خدمت اپنوں سے چھپ کر کرنا ہوتی تھی۔ اگر کسی مقامی غدار کو یہ علم ہو جاتا کہ کوئی بنگالی پاکستانی فوج سے تعاون کر رہا ہے تو تخریب کار ایسے جان سے مار دیتے تھے، نہ صرف اسے بلکہ اس کے ساتھ کئی اور بے گناہوں کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ اس کا گھر اس سرحدی علاقے میں تھا۔

صبح کاذب کی روشنیاں جب سہمی ہوئی فضا کو طفل تسلیاں دے رہی تھیں، عین ان لمحات میں ایک ہیلی کاپٹر نزدیک ہی موجود ایک قدرے میدانی علاقے میں اترا۔ مجھے جیپ میں بٹھا کر وہاں تک پہنچایا گیا، پھر وہی ہیلی کاپٹر مجھے لے کر ڈھاکہ کی طرف پرواز کر گیا۔

ڈھاکہ کی طرف جاتے ہوئے بالکل نامحسوس سے انداز سے میرے لاشعور میں کہیں محفوظ عظمیٰ کی شبیہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ ہیلی کاپٹر کے پرشور انجنوں کی آواز کہیں پیچھے رہ گئی اور ناریل کے جھنڈ سے بارش میں بھیگی بنگالی ساحرہ میرے سامنے آہنی پردے کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس پردے کے پار کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا، کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔

عظمیٰ میں کوئی ایسی بات تھی۔ کوئی ایسا افشا ہونے والا راز تھا جس نے جادو کی طرح مجھے مسخر کر لیا۔ اس کی گفتگو میں ایک بے نام سی خوشبو چاندنی کی طرح موجود تھی۔

وہ بہت شرمیلی، بہت گہری لڑکی تھی۔ کم آمیز اور کم آباد---- یہ لڑکی کسی نہ سمجھ آنے والے سوال کی طرح میرے ذہن میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ میں اسے سوچنا نہیں چاہتا تھا، لیکن ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ ہم بسا اوقات کتنے مجبور ہو جاتے ہیں---- شاید مقہور بھی----!

ہیلی کاپٹر ڈھاکہ چھاؤنی میں لینڈ ہوا تھا۔

میرے استقبال کے لیے میرے "سر" اور کرنل صاحب یہاں موجود تھے۔ میرے لیے

خوش آئند بات یہ تھی کہ میری محنت راس آئی اور جن کاغذات کے حصول کے لیے میں نے جہنم کی اس آگ میں چھلانگ لگائی تھی، وہ میری آمد سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔

’’ویل ڈن بوائے۔‘‘ بوڑھے کرنل نے جس کے چہرے پر چڑھی مونچھیں اس کے جوان ارادوں کی غماز تھیں، میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ دل کی زبان رابطے کی مضبوط ترین زبان ہے۔ مجھے علم تھا کہ میرے جذبات بڑی احسن شکل میں ان تک منتقل ہو چکے ہوں گے۔

شام تک کا وقت میں نے آفیسرز میس میں سو کر گزارا۔ پھر ایک جیپ مجھے میرے آفس تک چھوڑ آئی۔ میں نے سب سے پہلے اپنی ڈاک کی فکر کی۔ اگلے ہی روز والدہ کی طرف سے خط آیا تھا۔ میں نے تحریر پہچانتے ہی بے چینی سے لفافہ چاک کیا۔ لفافے کے اندر موجود سفید کاغذ پر مہربان سطریں مجھے ممتا کی آغوش میں لے جا رہی تھیں۔ وہ دن شاید زندگی کے خوش قسمت ترین دنوں میں سے ایک تھا----!

والدہ نے لکھا تھا تمہاری بہن حسن آراء کی رخصتی طے پا گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنے بڑے انعام سے نوازا تھا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس روز مجھے ادراک ہوا کہ ’’اس ہاتھ دو اور اس ہاتھ لو‘‘ کے اصول پر قدرت کتنی سختی سے عمل پیرا ہے۔

بہن کی رخصتی ایک ماہ بعد طے پائی تھی۔

مجھے علم تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اسے ڈولی میں رخصت نہیں کر سکوں گا۔ میں یہاں اس جیسی لاکھوں بہنوں کے سہاگوں کی سلامتی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ یہ محاذ خالی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

شہادت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی----!

بڑے بڑے کڑیل جوان گھات میں لگے تخریب کاروں کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ قدم قدم پر احساس ذمہ داری بڑھ رہا تھا۔ میں تو یوں بھی فوج کے خصوصی گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہنگامی نوعیت کی حالات سے نمٹنے کے لیے تو مجھے تیار کیا گیا تھا، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ان حالات میں محاذ خالی چھوڑ جاؤں۔

میں نے اسی وقت ماں کو لکھ دیا کہ وہ میرا انتظار نہ کریں۔ حسن آراء سے زیادہ میری یہاں کی بہنوں کو ضرورت ہے۔ وہاں میں نہ بھی ہوا تو اسے ڈولی میں سوار کرنے والے اور بھی ہوں گے، یہاں ایک لمحے کی غفلت جانے کتنی سہاگنوں کو بیوہ کر دے گی۔ کتنے بچوں کو یتیم بنا دے گی۔



میں جانتا تھا میری ماں ایک فوجی کی بیوہ اور دوسرے فوجی کی ماں ہے۔ وہ ذہنی طور پر ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ وہ میرے جواب پر کف افسوس نہیں ملے گی بلکہ خدا کا شکر ادا کرے گی کہ اس کے بیٹے نے اپنے فرض پر کسی شے کو اہمیت نہیں دی، اپنی بہن کو بھی نہیں----!



ہماری لاکھ نیک خواہشات کے باوجود حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے---- ہمیں ہر روز کوئی نہ کوئی تشویشناک خبر ’’اپنے ذرائع‘‘ سے اور کوئی نہ کوئی ہولناک خبر کسی ’’غیر ملکی ذرائع‘‘ سے سننے کو ملتی رہتی تھی۔

ڈھاکہ شہر میں موجود میرے آدمی جنہیں ہم اب ’’مقامی ہمدرد‘‘ سمجھنے لگے تھے، بظاہر اندرونی حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور پل پل کی خبریں ہمیں مل رہی تھیں۔ بھارتی تخریب کار اتنی زیادہ تعداد میں ڈھاکہ شہر میں داخل ہو چکے تھے کہ انہیں باہر نکالنا ایک پریشان کن مسئلہ بن کر رہ گیا تھا---- ہماری پوزیشن ایسی تھی کہ ہم براہ راست کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ ہمیں بس حالات پر نظر رکھنے اور اعلیٰ حکام کو باخبر رکھنے کے فرائض تفویض کیے گئے تھے یا پھر مقامی انتظامیہ کے تعاون سے کوئی اہم قدم اٹھا سکتے تھے۔ ان حالات میں اتنی نرمی یا پھر ہماری بے بسی نے ہمیں کسی قابل نہیں رکھا تھا۔

اس روز بھی میں اپنے ’’مقامی ذرائع‘‘ کی طرف سے حاصل کردہ اطلاعات کی فائل دیکھ رہا تھا جب ایک نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔

پروفیسر شمس الدین رہائشی فیل خانہ مشتبہ افراد کی فہرست میں داخل ہو چکا تھا۔ ہمارے ایک ایجنٹ نے اطلاع دی تھی کہ اس نے کل ڈھاکہ یونیورسٹی میں دو مقامی غداروں سے ملاقات کی ہے۔ ان دونوں مقامی غداروں کو ہم دراصل بطور ’’چارہ‘‘ استعمال کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھارتی اور مقامی تخریب کاروں کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دیتے تھے اور ان پر نظر رکھنے سے ہمیں ڈھاکہ میں موجود بھارت کے پروردہ غداروں کا علم ہوتا رہتا تھا۔ ان دونوں کی گرفتاری سے یہ کھیل جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔

میں سوچنے لگا پہلی ہی ملاقات پر آخر یہ شخص کیوں بار بار میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

کیا عظمیٰ سے میری ملاقات بھی ’’طے شدہ پروگرام‘‘ کا حصہ تو نہیں؟

عین ممکن تھا کہ شمس الدین کو اسی نوعیت کے فرائض سونپے گئے ہوں اور اس نے اپنی بیٹی کو "چارہ" بنا کر میرے آگے پھینک دیا ہو---- میں جانتا تھا جس طرح انسانی عظمت کی کوئی انتہا نہیں، اسی طرح انسانی پستی کی بھی کوئی حد نہیں۔

خصوصاً" وہ شخص جس نے اپنا ضمیر ہی دشمن کے پاس گروی رکھ دیا ہو اور مادر وطن کے خلاف ہی غداری پر تل جائے، اس میں غیرت اور ایمان نام کی کوئی شے باقی نہیں رہ جاتی----!

یہ مفروضہ غلط بھی ہو سکتا تھا اور صحیح بھی۔ جاسوسی کے کھیل میں کوئی بھی رائے حتمی نہیں ہوتی۔ میں نے شمس الدین کو خود چیک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا----!

ڈھاکہ یونیورسٹی میں جو گل کھلائے جا رہے تھے، مجھے ان کا بخوبی علم تھا۔ ظالموں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے تعلیمی درسگاہوں کے مقدس ماحول کو بھی زہرآلود کر رکھا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی تو ان کا گڑھ تھی---- افسوس تو اس بات کا تھا کہ جانتے بوجھتے ہوئے ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

ہمارے تو جیسے ہاتھ باندھ کر رکھ دیئے گئے تھے----!

☆○☆

اگلے ہی روز میں فیل خانے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے دانستہ سرکاری جیپ سے اجتناب برتا تھا اور ایک رکشہ کے ذریعے یہاں آیا تھا۔ عظمیٰ کے مکان سے کچھ فاصلے پر ہی میں نے رکشہ چھوڑا اور اب پیدل اس طرف جا رہا تھا۔

مکان کا باہری دروازہ کھلا تھا۔ میں برآمدے میں چلا آیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ میرے دستک دینے کے بمشکل ایک منٹ بعد ہی مجھے کھڑکی کا پردہ سرکنے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے مجھے دیکھا تھا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اندر موجود لوگ اس بات کا فیصلہ کر رہے تھے کہ مجھے اندر بلایا جائے یا نہیں۔

جلد ہی وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئے اور دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی عظمیٰ کا چہرہ نمودار ہوا۔

"اسلام علیکم----!"

"آپ----؟" اس نے میرے سلام کا جواب بظاہر بڑے حیران کن لہجے میں دیا تھا۔

"کیوں مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے ذومعنی بات کہہ دی۔



اس کا چہرہ شانت رہا۔

"نہیں نہیں! آپ نے یہ کیوں سوچا؟ مجھے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ آپ........" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس لمحے عظمیٰ کا سارا سراپا اس کی آنکھوں میں بکھر بکھر گیا۔ اس نے اپنی سیاہ اور چمکیلی آنکھوں کو لاکھوں لفظوں میں بکھیر دیا تھا۔ جس لمحے عظمیٰ نے میری طرف دیکھا اس کے بدن کی ساری حرارتیں اس کی نظروں میں سمٹ آئی تھیں---- وہ ایسی ہی لڑکی تھی جو اپنے مقابل کے لہو میں ہزار زاویوں کے ساتھ گھستی چلی جاتی تھی۔

بڑے نامحسوس انداز میں----!

بڑی خاموشی کے ساتھ----!

چپکے چپکے، ہولے ہولے----!

شاید ایسی ہی نگاہیں پلک جھپکتے دلوں کے فیصلے کر دیا کرتی ہیں۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری بات سے گھبرائی نہیں، شرمائی ضرور تھی۔ عورت جب شرمائے تو وہ بچپن کے بہت قریب ہو جاتی ہے۔ اس لمحے وہ اتنی معصوم بن گئی تھی کہ اگر کوئی اسرار اس میں پنہاں بھی تھا تو وہ ضرور منکشف ہو جاتا---- لیکن میرے اندازوں کے برعکس وہ اپنے باپ کی سازش کا کوئی حصہ نہیں تھی۔ صرف پروفیسر شمس الدین کی بیٹی تھی---- اگر اسے میرے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا تو لاعلم رکھ کر، بے خبری میں----!

جی ہاں! میں نے یہ فیصلہ اس ایک لمحے میں کر لیا تھا جو لمحہ زندگی سے بہت قریب کر دیتا ہے۔ اس لمحے سچائی ایک کوندے کی طرح انسانی وجدان پر لپکتی ہے اور اس سے اپنا آپ منوا لیتی ہے۔

میں بھی ایسے ہی کسی لمحے کی گرفت میں تھا۔ میں نے بہت دنیا نہیں دیکھی تھی، لیکن بہت زندگی اور بہت موت کا نظارہ ضرور کر لیا تھا۔ موت اور زندگی کو نزدیک سے دیکھنے والا حالات کی سمجھ پر قادر ہو جاتا ہے۔ یہ کہنے کی نہیں، تجربے کی بات ہے۔ زندگی میں بہت کچھ گیان اور دھیان کا مرہون منت ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ سب ہی کچھ لمبے تجربے کی دین ہو۔

بسااوقات وقت کے کسی حصے کے غم، خوشیاں اور تجربات کسی اور کی جھولی میں بھی ڈال دیا کرتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے کبھی کبھی صحیح ایڈریس والا لفافہ غلط ہاتھوں میں یا پھر غلط ایڈریس والا لفافہ صحیح ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے۔

تب مجھے علم نہیں تھا کہ عظمیٰ غلط یا صحیح میں سے کون سالفافہ ہے، لیکن میں یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے اندر بہت خوبصورت تحریر ضرور رقم ہے۔ ایسی تحریر جو کسی نے اپنے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہو۔

"بیٹھیے۔" اس نے اپنے مکمل پن کے ساتھ مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔

"شکریہ" کہہ کر میں ایک کونے میں دھرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میرے اندر کوئی پراسرار اور نادیدہ قوت مجھے یہ ضرور احساس دلا رہی تھی کہ کمرے کی دیواروں میں لگی کچھ آنکھیں میرا جائزہ لے رہی ہیں۔ یہ میرا وہمہ بھی ہو سکتا تھا---- لیکن تب میں ادراک کی جس حد پر کھڑا تھا وہاں سے واہمے کا گزر نہیں ہوا کرتا۔

بھاری قدموں کی چاپ میری سماعت سے ٹکرائی اور ساتھ والے کمرے سے کوئی دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا---- دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ شاید یہ کوئی ایسا شخص تھا جو میرے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔

کون ہو سکتا تھا یہ؟

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر اپنے ذہن سے اسے جھٹک دیا۔ کوئی بھی ہو، میں نے سوچا بہرحال وہ مشتبہ رہا ہو گا۔

"کیسے ہیں آپ؟" عظمیٰ نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

"آپ کیسی ہیں؟ میں نے سوچا آج آنٹی سے مل لیا جائے۔ کہاں ہیں پروفیسر صاحب؟" میں نے ایک سانس میں تین باتیں بڑی ہمت کر کے کہہ دیں۔

"پاپا تو ابھی آتے ہوں گے۔ میں ممی کو بلاتی ہوں۔" اس نے کھڑے کھڑے کہا۔

مجھے اب افسوس ہونے لگا تھا کہ میں نے اس سے یہ سوال کیوں کیا۔ جو کوئی بھی تھا خود ہی آ جاتا۔ اب وہ چلی جائے گی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائے۔ وہ بنگالی لڑکی جو زمین کی طرح سانولی، گہری اور زندگی بخش جذبوں کی مالک تھی۔ میں اس کے قرب سے گیان حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس سے علیحدگی میں باتیں کر کے مجھے خوشی ہوتی تھی۔ نجانے اس لمحے میں ایسے جذبات کو کوئی نام دینے کے لیے کیوں تیار نہیں تھا----!

شاید بعض جذبے بے نام ہی رہیں تو ان کا بھرم قائم رہتا ہے۔ رشتہ چاہے کسی بھی طرح کا ہو، تعلق قائم کرتا ہے۔ اس کا نام رکھنا کیا ضروری ہے؟ کاش میں کسی بے نام سے تعلق ہی سے عظمیٰ سے وابستہ رہتا----!

جب اس تعلق نے نام اختیار کیا تو مجھے کتنا خراج ادا کرنا پڑا۔





عظمیٰ کی واپسی اپنی ماں کے ساتھ ہوئی۔ میں نے محسوس کیا پروفیسر کی بیوی نے یہاں اس کمرے میں آنے سے پہلے اپنے چہرے پر کچھ ہلکی پھلکی لیپا پوتی بھی کی ہے، خاصی وضع دار خاتون دکھائی پڑتی تھی۔

"اوہ بیٹے تم نے بہت اچھا کیا جو آ گئے۔ میں آج ہی تمہیں یاد کر رہی تھی۔" اس نے بڑی اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"میں نے سوچا اب آپ سے کوئی تعلق تو ہو ہی گیا ہے۔ پھر کیوں نہ آپ کی میزبانی سے لطف اندوز ہوا جائے۔" جانے کیوں میرے منہ سے بار بار ذومعنی سی باتیں نکل رہی تھیں۔ شاید مجھے خود پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔

"ارے نہیں ایسی بھی کیا بات۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ ہمیں تو بیٹا فخر ہے تم جیسے نوجوانوں پر---- ایک اس کا بھائی ہے---- خیر چھوڑو---- ہاں سناؤ ادھر گھر میں تو سب خیریت ہے ناں----؟"

"جی بہت اللہ کا شکر ہے۔"

ہم روایتی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ عظمیٰ کو وہیں بیٹھنے کا کہہ کر خود اٹھ کر چلی گئی۔ چائے بنانے کے بہانے----!

مجھے اس بات پر قطعی حیرانی نہ ہوئی کہ اس نے عظمیٰ کو میرے پاس اکیلی کیوں چھوڑ دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ عورت اپنے خاوند کی رازدار ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر اس نے اپنی دانست میں اچھا ہی کیا تھا۔

"آپ نے کبھی اپنے بھائی سے تعارف نہیں کروایا؟" میں نے عظمیٰ کو مخاطب کیا جس نے دوپٹہ بڑے سلیقے سے اپنے سر پر اوڑھ کر اپنی نظریں سامنے جما رکھی تھیں۔

"کمال ہے اس کا موقعہ ہی کب ملا؟ ہماری ملاقاتیں ہوئی ہی کتنی ہیں؟" اس نے اپنے موتیوں سے دانت چمکائے۔

"ہاں بھئی! یہ بات تو ہے۔ ہمیں ملتے تو رہنا چاہیے تھا۔" میں نے اپنی بات کا ردعمل اس کے سانولے چہرے پر تلاش کیا جہاں سرخی کی ایک لکیر پلک جھپکنے میں نمودار ہوئی اور پھر غائب ہو گئی۔

میں عظمیٰ سے اس کے کالج کی باتیں کرتا رہا اور کوئی موضوع ہی ایسا نہیں تھا جس پر ہم

بات کر سکتے۔ حالانکہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے کچھ اور قسم کی باتیں کرنا چاہتے تھے۔ میں جانتا تھا وہ مجھ سے وہی کچھ سننا چاہتی ہے جو خود کہنے کی آرزو رکھتی ہے۔

عظمیٰ کی ماں ٹرالی گھسیٹتی اندر لے آئی۔

چائے خاصی پر تکلف تھی۔ اس نے موسم کی باتیں کرتے ہوئے ہمارے لیے چائے کی پیالیاں بنا کر رکھیں۔ پھر گھر کی تیار کردہ مٹھائی کی پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔ ابھی میں نے مٹھائی بمشکل منہ میں رکھی تھی، جب دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔

"پاپا آ گئے----!" کہتے ہوئے عظمیٰ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"آہا----!" میری شکل پر نظر پڑتے ہی پروفیسر کی باچھیں کھل گئیں۔

"ہیلو ینگ مین----!" اس نے نعرہ لگایا اور بے تکلفی سے مجھے بغلگیر کر لیا۔ میں اس سے بغلگیر نہیں ہونا چاہتا تھا، بادلِ نخواستہ اس کی خواہش کا احترام کر رہا تھا۔

پروفیسر نے جس بے تکلفی کا مظاہرہ اپنی آمد پر کیا تھا، اسی کے ساتھ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی گفتگو ابھی تک غیر سنجیدہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس میں سنجیدگی آنے لگی۔ ہم اب حالات حاضرہ پر باتیں کرنے لگے تھے۔ اس کی بیوی اور بیٹی زیادہ تر "ہوں، ہاں" ہی کر رہی تھیں۔ اس گفتگو میں ایک دو مرتبہ ہی اس کی بیوی نے باقاعدہ حصہ لینے کی کوشش کی تھی----!

پروفیسر کلکتے کا مہاجر تھا۔ اس نے بڑی مکاری سے ابھی تک اپنے اندر کے کھوٹ کو چھپایا ہوا تھا اور موجودہ حالات کا بڑا گول مول سا تجزیہ کر رہا تھا، لیکن زیادہ دیر تک وہ اپنے دل کا کھوٹ نہ چھپا سکا۔

"صاحبزادے مجھے سیاست تو آتی نہیں، لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ یہاں مشرقی پاکستان کے لوگ ہندو سے کم اور مغربی پاکستان سے زیادہ ناراض ہیں حالانکہ ہم نے پاکستان اسی ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے حاصل کیا تھا، لیکن اب نجانے کیوں اس کی غلامی کو اپنے مغربی پاکستانی بھائیوں کی غلامی پر ترجیح دینے لگے ہیں۔" اس نے بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے میرا ردعمل جاننا چاہا۔

جب وہ یہ بات کر رہا تھا تو میں نے عظمیٰ کے چہرے پر ناگواری اور اس کی ماں کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھے تھے۔ دونوں کے متضاد رویے کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔

"یہ کوئی نئی سوچ نہیں ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ماضی میں اس کی بہت سی



یہاں موجود ہیں۔ آج سے صرف ۲۵ سال پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے قائداعظم کی مخالفت کی تھی۔ قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر وہ لوگ ہندو کی غلامی ہی کو نجات کا راستہ سمجھ رہے تھے، لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ وہ دھوکے کا شکار ہوئے تھا---- انہیں ورغلایا گیا تھا۔" میں نے سنجیدگی اختیار کی۔

"وہ اور بات تھی یار! میں تاریخ کا استاد ہوں۔ تم تاریخ کو تو گڈمڈ نہ کرو۔ تم پنجابی لوگ ہو بڑے سیانے۔ اپنے مطلب کی بات تو فوراً نکال لیتے ہو۔" اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ کھوکھلی ہنسی ہنس رہا ہے۔

"پروفیسر صاحب! میں تاریخ کا طالب علم ہوں۔ شاید آپ جیسی "استادی" سے بات نہ کر سکوں، لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ جو لوگ اپنے گھر کی لڑائی کا فیصلہ باہر کے چوہدریوں سے کروائیں، وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ پنجابی نے بنگالی پر ظلم کیا یا بنگالی نے پنجابی پر۔ اس کا فیصلہ ہمیں آپس ہی میں کرنا ہے۔ اگر ہم یہ لڑائی باہر لے گئے تو نقصان دونوں کا ہو گا۔"

"بھئی جب آپس میں فیصلہ نہ ہو تو کیس پنچایت میں تو لے جانا ہی پڑتا ہے۔" پروفیسر کی بیوی نے لقمہ دیا۔

"چوروں کی پنچایت میں نہیں۔ اپنے گاؤں کی پنچایت میں جہاں سب ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یار ایک بات تو مانو گے استاد کہ بھارت کا مسلمان ہندو سے شاکی نہیں ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"تاریخ میں اس سے بڑے جھوٹ کا ثبوت ہی نہیں ملتا۔" میری بات نے پروفیسر کے چہرے کا رنگ بدل دیا---- "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں مسلمان اپنی حیثیت کے ساتھ زندہ ہیں تو مجھے آپ کی تاریخ شناسی پر شبہ ہے---- پروفیسر صاحب! یاد رکھئے ہندو کبھی سیکولر مزاج نہیں ہو سکتا۔ تعصب اس کی رگ رگ میں سمایا ہے۔ آپ جانتے ہیں بابو راؤ پٹیل نے کہا تھا کہ ابوالکلام اور رفیع احمد قدوائی میں صرف ایک کمی ہے کہ وہ "مسلمان" ہیں ورنہ کیا کانگریس کا سربراہ بھارت کا سربراہ نہیں بن سکتا۔"

"چھوڑیئے جی! آپ نے کیا کلاس روم لگا لیا۔ کبھی تو کسی اور موضوع پر بات کر لیا کیجئے۔ ہر وقت سیاست---- کیا رکھا ہے اس میں؟" گھاگ بنگالن ہیڈ مسٹریس نے میرا رخ پہچان کر بہترین ڈپلومیسی اختیار کی۔

"واقعی یار ہم تو خاصے سنجیدہ ہو رہے ہیں۔" پروفیسر نے کہا اور پھر خود ہی مکاری سے قہقہہ لگایا۔

بات کا رخ بدلنے کے لیے اس نے مجھے یکے بعد دیگرے تین چار لطیفے سنا دیئے۔ میں بے دلی سے مسکراتا رہا۔ ایسا ضروری بھی تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ احساس دلاؤں کہ اس کے کالے کرتوت ہمارے علم میں آ چکے ہیں۔

"میرے خیال سے مجھے چلنا چاہیے۔ خاصا وقت ہو گیا ہے۔" میں نے گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے ابھی تھوڑی دیر تو بیٹھو بیٹا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔" عظمیٰ کی ماں نے کہا۔

"آنٹی! میرے آئندہ آنے کی گنجائش تو باقی رکھئے۔" میں نے کہا۔

مجھے خود بھی اپنی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی، لیکن وہ تینوں بھی میرے ساتھ ہی مسکرا دیئے۔ عظمیٰ کے کھنچے ہوئے اعصاب اب نرم پڑنے لگے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہماری باتیں اس پر گراں گزر رہی ہیں، لیکن وہ ہم میں سے کسی کو بھی منع نہیں کر سکتی تھی۔

عظمیٰ مجھے گھر کے باہر تک رخصت کرنے آئی۔ اس نے اپنی ماں سے کسی سہیلی کے گھر جانے کا کہہ دیا تھا۔

"آپ نے کسی بات کا برا تو نہیں منایا؟" اس نے گھر سے نکلتے ہی اپنے دل کا غبار نکالا۔

"کیوں بھئی میں برا کیوں مناؤں گا؟ ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔"

"دراصل........" اس نے بات اُدھوری چھوڑ دی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ "دراصل........ میں آپ سے........"

"عظمیٰ تم جو مجھ سے کہنا چاہو اطمینان سے کہہ دو۔" میں نے اسے تحریک دلائی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ واقعی کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن ڈھنگ سے الفاظ نہیں مل رہے۔

"دراصل مجھے یہ کہنا تھا کہ........ میں چاہتی ہوں آپ سے روزانہ ملا کروں........ لیکن آپ کو ہمارے ہاں........ شاید آپ کے لیے وہ جگہ موزوں نہیں........ شاید۔" وہ بے ربط سی باتیں کر رہی تھی اور میں اس کا منشا پا گیا تھا۔

"پہلے تم نارمل ہو جاؤ، پھر کچھ کہنا۔" میں نے سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ اچانک ہی سامنے والے گھر سے ایک لڑکی باہر نکلی تھی، جسے دیکھ کر عظمیٰ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی۔



"میں آپ سے پھر کبھی بات کروں گی۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔" میں چونکا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، وہ لڑکی جس نے غالباً عظمیٰ کو پہچان لیا تھا، تیر کی طرح سیدھی ہماری طرف آئی۔

"ہائے عظمیٰ ہاؤ آر یو؟" اس نے بڑی بے باکی سے عظمیٰ کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"او۔کے! فائن۔" عظمیٰ گھبرا گئی۔ "آپ ہیں مسٹر شیر افگن۔ یہ ہے نیلما۔" اس نے ہمارا تعارف کرایا۔

"ہیلو___!" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہیلو___!" مجھے بادل نخواستہ ہاتھ ملانا پڑا۔

"میں تمہاری طرف ہی آ رہی تھی۔" عظمیٰ شاید اس سے زیادہ ہماری آپس کی گفتگو پسند نہیں کرتی تھی۔

میں نے بھی اسے فی الوقت اس کے حال پر چھوڑنا ہی مناسب سمجھا تھا، حالانکہ اس نے آخری بات کہہ کر میرا تجسس بہت بڑھا دیا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔"

"او۔کے۔ جلدی ملیں گے۔" عظمیٰ نے فوراً ہی کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔" مجھے ڈر تھا کہیں اس کی سہیلی پھر میری طرف ہاتھ نہ بڑھا دے۔

☆○☆

آفس میں بڑی متضاد سوچیں لیے پہنچا تھا۔

مجھے پروفیسر اور اس کی بیوی کی بدباطنی پر تو شک نہیں رہا تھا___ لیکن ابھی تک عظمیٰ کو میں ان کی ساتھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

پھر اس کا بھائی___! شاید کمال الدین نام بتایا تھا اس نے بھائی کا۔ مجھے یقین تھا کہ جب میں ان کے گھر میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر باہر چلا گیا تھا۔ شاید میرے سامنے آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

معاملات الجھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

ابھی تک اس گنجلک کہانی کا کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا___ مجھے تو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ عظمیٰ نے ایک طرف تو بین السطور میں مجھے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا تھا، دوسری طرف وہ مجھے ملنا بھی چاہتی ہے۔

آخر ہماری ملاقات کیسے ہو گی؟

کیا اسے میرے ٹھکانے کا علم ہے؟

کیا وہ خود مجھے ملنے آئے گی؟

ایسے ہی سوالات تھے جو میرے دماغ میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔ شام گئے تک میں انہی سوچوں میں الجھا رہا، پھر ایک اہم میٹنگ پر روانہ ہو گیا۔ ایسی "اہم میٹنگیں" اب ہمارا روزانہ کا معمول بن کر رہ گئی تھیں۔

رات دیر گئے میں لوٹا اور دفتر سے ملحق اپنے چھوٹے سے گھر میں پہنچ گیا۔ یہ علاقہ راجہ باغ پولیس لائن کے ایریا میں ہونے کی وجہ سے قدرے محفوظ تھا۔ یوں تو ہماری کوئی بھی ایسی خفیہ کمین گاہ نہیں تھی جو دشمن کے علم میں نہ آ چکی ہو، یہاں قدم قدم پر آستین کے سانپ اپنے پھن پھیلائے بیٹھے تھے جو دشمن کو ہر اطلاع پہنچا دیتے تھے، پھر بھی ابھی تخریب کاروں کے حوصلے اس حد تک نہیں بڑھے تھے کہ وہ پولیس تھانوں یا آرمی کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہوتے۔ گو کہ انہوں نے اہم تنصیبات پر حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

رات گئے تک میں کروٹیں بدلتا رہا۔۔۔!

مجھے کوئی بھی لائحہ عمل طے کرنے سے پہلے عظمیٰ سے ملاقات کا انتظار تھا۔ وہ آخر مجھے کیا کہنا چاہتی تھی؟ ممکن ہے کوئی اہم بات، کوئی ضروری اطلاع یا پھر کوئی ایسی بات جو میں بھی اس سے کہنا چاہتا تھا، لیکن میری زبان پر تالے پڑے ہوئے تھے۔

صبح اٹھ کر میں معمول کے گشت پر چلا گیا۔ مجھے شہر میں موجود مختلف خفیہ ٹھکانوں پر اپنے "مقامی ذرائع" سے اطلاعات موصول کرنا ہوتی تھیں۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہمارے دو انٹیلی جنس آفیسر ایسی ہی ملاقاتوں کے دوران تخریب کاروں کی درندگی کے بھینٹ چڑھ چکے تھے، لیکن مجھے ہر روز جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کام کرنا ہوتا تھا۔

یہ میرے فرائض میں شامل تھا۔

میں اگر چاہتا تو یہ کام اپنے ماتحتوں سے بھی لے سکتا تھا۔۔۔ قانونی طور پر بھی اس میں کوئی قباحت نہیں تھی، بلکہ مجھے تو یوں بھی بہت خصوصی حالات میں خود میدان میں اترنے کی اجازت تھی۔ عام حالات میں ایسا کرنے سے منع کیا گیا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی رگوں میں بھی میرے جیسا خون دوڑ رہا ہے۔ وہ بے چارے بھی ہزار میل دور سے اپنی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بچوں کو چھوڑ کر میری طرح مادر وطن کی حفاظت کے لیے اس جہنم زار میں موجود تھے۔ ان کی زندگی میری زندگی سے کچھ کم قیمتی نہیں تھی۔



اپنی جگہ ہر پتھر نگینہ تھا۔۔۔!

دفتر کے دروازے پر میرا استقبال صوبیدار گل حسن نے کیا۔

"سر! ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہے۔" اس نے ایڑیاں جوڑ کر مجھے آداب بجا لاتے ہوئے مطلع کیا۔

"کہاں ہے؟" میں جان گیا کہ وہ عظمیٰ تھی، لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ اسے میرے دفتر کی اطلاع کس نے دی۔ پھر میں خود ہی مطمئن ہو گیا۔

یہ بھی بھلا کوئی پریشانی کی بات ہے۔۔۔؟

"ہیلو۔" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے مخاطب کیا۔

"ہیلو!" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

میری آمد شاید اس کی توقعات کے مطابق نہیں ہوئی تھی یا پھر وہ یوں ہی گھبرائی ہوئی تھی۔

"آپ مجھے یہاں دیکھ کر حیران تو ضرور ہوئے ہوں گے؟"

اس نے چھٹتے ہی کہا۔

"نہیں۔۔۔!" میں نے اطمینان سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔۔۔ پھر یوں بھی میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا ہے۔ جب یہاں وہ کچھ دیکھنے اور سننے کو مل رہا ہے جو کبھی ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اپنے ہی اپنوں کو مارنے پر، ڈسنے پر تل جائیں تو پھر حیران ہونے کی مہلت ہی کب رہتی ہے کسی کے پاس۔۔۔!"

"اگر آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں تو شاید تھوڑی دیر بعد آپ کو افسوس ہو گا۔ میں آپ کو اس اسرار سے آگاہ کرنے آئی ہوں۔"

میں سمجھ گیا وہ میری توقعات کے عین مطابق اس گھناؤنے کھیل میں زبردستی کی شریک دکھائی دیتی تھی۔

"ڈبل کراس۔۔۔!" میری تربیت آڑے آ گئی۔

فوراً ہی میرے ذہن میں آیا کہیں یہ بھی کوئی نیا کھیل نہ ہو؟ حفظ ماتقدم کے لیے اب مجھے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے ذہنی طور پر مرعوب کرنا تھا۔ اس طرح عین ممکن تھا وہ باز آ جائے، واپس چلی جائے۔

یوں بھی میں اسے احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ ہم بہت زیادہ "بے خبر" ہیں۔ آخر تو

میں ایک عسکری تنظیم کا حصہ تھا۔ اپنے متعلق کوئی غلط گمان میری انا کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھا۔

"ایک منٹ۔" میں نے اسے کہا پھر انٹرکام پر اپنے ساتھیوں کو کچھ ہدایات دیں اور اس کی طرف مخاطب ہوا۔

"عظمیٰ! اگر تم اپنے والد کے متعلق کچھ بتانے آئی ہو تو یہ جان لو کہ ہمیں اس کے متعلق اطلاعات حاصل ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ غیر ملکی تخریب کاروں کا آلہ کار بن چکا ہے۔" میرے منہ سے نکلی بات عظمیٰ کے لیے بجلی کے طاقتور جھٹکے سے کم ہرگز نہیں تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ یکلخت بدل گیا۔

"پھر انتظار کس بات کا؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"حالات کا---- وقت کا' موقعے کا۔ ہم چوہوں پر وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں۔ ہمیں اس پر ہاتھ ڈالنا ہے جو ان پتلیوں کو نچا رہا ہے۔ ہمارے لیے پروفیسر کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ تم ابھی اس بات کو نہیں سمجھو گی کہ اس کھیل میں ایسے لوگوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی---- صرف ایک گولی ضائع کرنے والی بات ہے۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے بہت کچھ کہہ گیا۔

کمزور لڑکی سسکیاں لے کر رونے لگی----!

میں نے اسے فی الوقت دلاسہ دینا مناسب نہ سمجھا۔

جلد ہی وہ نارمل ہو گئی----!

"میں آپ کو یہی کچھ بتانے آئی تھی۔" اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"مجھے خوشی ہے عظمیٰ کہ ایک غدار کے گھر میں جنم لینے والی مسلمان لڑکی نے اپنے فرض کو نہیں بھلایا۔"

"میں یہ کچھ نہ تو اپنی جان بچانے کے لیے کہہ رہی ہوں نہ ہی مجھے کسی اور طرح کا لالچ ہے۔ میں ایک ذمہ دار اور باشعور پاکستانی شہری ہونے کے ناطے آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرے والدین اور بھائی کو گرفتار کر لیجیے۔"

اس نے یہ بات کہنے کے لیے جس حوصلے اور ضبط سے کام لیا تھا' وہ کم از کم میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ اگر خدانخواستہ مجھ پر ایسی کیفیت وارد ہوتی تو میں کبھی اتنی جرأت سے یہ بات نہ کہہ سکتا۔

میری نظروں میں اس کا قد بہت بڑھ گیا----!



ان بونے اور چھوٹے انسانوں کے بیچ عظمیٰ چھتنار کی تناور درخت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی چھایہ میں امان تھی---- پناہ تھی---- امن تھا اور عظمت تھی۔

"میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں عظمیٰ----" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"لیکن یہ میرے مسئلے کا حل نہیں۔" اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

"عظمیٰ! ہم بے خبر تو نہیں تھے' لیکن اب تم امید کی ایسی مشعل بن کر ہمارے ہاتھ لگی ہو جو ان غداروں کے پھیلائے ہوئے اندھیرے کا طلسم توڑ ڈالے گی۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں' لیکن ہمارے کام کا اپنا طریق کار ہے۔ اگر تم ہماری مدد کرنا چاہو تو یہ ہماری خوش نصیبی بلکہ اس ملک اور قوم کی خوش نصیبی ہو گی۔ ہمیں آج تم جیسی بنگالی لڑکیوں کی ضرورت ہے جو پاکستانی بن کر جئیں اور پاکستانی بن کر سوچیں۔"

"مجھے کیا کرنا ہو گا----؟" اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"فی الحال تم نارمل رہو۔ تمہارے گھر والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارے کسی عمل سے تمہیں مشکوک نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں پل پل کی خبر دو۔ ہم تمہاری اطلاعات پر اس طرح عمل کریں گے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو رہی ہو گی---- اور مقصد بھی حل ہوتا رہے گا۔" میں نے اس سے "بزنس" کی بات کی۔

عظمیٰ کے لیے میں نے چائے منگوالی تھی----!

ہم دیر گئے تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میری سوچ کے عین مطابق میری اور اس کی پہلی ملاقات "طے شدہ" پروگرام کا حصہ تھی۔ انہیں اطلاع تھی کہ میں نئے انٹیلی جنس کے انچارج کی حیثیت سے چارج سنبھالنے جا رہا ہوں۔ میرا نام اور تصویر ان لوگوں کے پاس موجود تھی۔ انہوں نے عظمیٰ کو حکم دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ تعلقات استوار کرے۔ مجھے اپنی مٹھی میں جکڑ لے۔

عظمیٰ نے مجھے بتایا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس کی سدھائی ہوئی بہت سی لڑکیاں جن میں زیادہ تعداد ہندو گھرانوں کی لڑکیوں کی ہے---- اپنی اپنی مہم پر نکلی ہوئی ہیں اور ان کا بزنس کامیاب بھی جا رہا ہے۔

یہ لڑکیاں سرکاری عہدوں پر فائز افسروں سے جنسی مراسم استوار کرتی ہیں اور ان سے ملکی راز حاصل کر کے آگے پہنچا دیے جاتے ہیں۔ اکثر افسران یہ راز نشے کی حالت میں اور بہت سے اپنی حیثیت نمایاں کرنے یا اپنی اطلاعات جتانے کے چکر میں اگل دیتے ہیں۔

عظمیٰ نے بتایا کہ اس روز جو ہندو لڑکی نیلما مجھے ملی تھی، وہ بھی اسی مہم پر نکلی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ میرا تعارف بھی اس نے اپنے "شکار" کی حیثیت سے کروایا تھا۔ اس نے اپنی اطلاعات کی حد تک مجھے کچھ بنگالی افسران اور کچھ غیر بنگالی افسران کے نام بھی بتائے اور ان لڑکیوں کی تفصیلات بھی جن کے ذریعے یہ لوگ بڑی معصومیت سے دشمن کا کھلونا بنے ہوئے تھے---- عظمیٰ نے جس جرات سے اور بلاجھجک کے مجھے تمام اطلاعات فراہم کی تھیں، اس سے کم از کم مجھے فی الوقت تو یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ "ڈبل کراس" نہیں کر رہی اور ایمانداری اور مکمل کومٹ منٹ کے ساتھ ہمارا ساتھ دے گی۔

عظمیٰ میری محبوبہ تو تھی ہی، اب میرا "سورس" بھی بن گئی تھی----!

اس کی جان اور آبرو کی حفاظت اب ہماری ذمہ داری تھی کیونکہ اپنی جان پر کھیل کر وہ ہمارے ساتھ تعاون کرنے جا رہی تھی۔

یہ کوئی آسان کھیل نہیں تھا----!

بچوں کا کھیل نہیں تھا یہ----!

پل پل جان کو خطرہ، آن داؤ پر لگی ہوئی، معمولی سا شک، معمولی سی لاپرواہی کس بری طرح سے اس کی جان لے سکتی تھی، اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ مکتی باہنی کے تربیت یافتہ درندے ایسی لڑکیوں کی بری طرح آبروریزی کرنے کے بعد انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا کرتے تھے جو ان سے متعلق کوئی بھی اطلاع ہمیں پہنچاتی تھیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کی ان بدقسمت لڑکیوں کا ریکارڈ ہمارے پاس موجود تھا جنہوں نے جذبہ حب الوطنی کے تحت ہمیں یونیورسٹی میں رچائے گئے گھناؤنے کھیل سے باخبر کیا تھا اور اندر کی کہانی صرف مسلمان اور پاکستان کی بیٹیاں ہونے کے ناطے ہم تک پہنچائی تھیں----!

ان بدقسمت لڑکیوں کا کیا انجام ہوا؟

اس کا تصور ہی شریف انسان پر لرزہ طاری کر دینے کے لیے کافی ہے۔ میں نے اس لمحے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اپنے جیتے جی عظمیٰ کو کبھی اس بھیانک انجام سے دوچار نہیں ہونے دوں گا۔

اپنی تربیت اور تنظیم کے مطابق میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کس مرحلے پر کیا کرنا ہے۔

کام کرنے کا طریقہ----!

اطلاعات پہنچانے کے محفوظ ترین طریقے----!



ہنگامی صورت حال میں رابطہ کیسا کرنا ہے؟

حالات خطرناک ہوں تو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے؟

غرض ہر ممکن طریقے سے میں نے اسے تحفظ کے احساس کی چادر پہنا کر وہاں سے رخصت کر دیا تھا۔

میں نے اسے دم رخصت کہا تھا کہ اب وہ اللہ کے فضل سے ہماری حفاظت اور نگرانی میں ہے---- اس نے جو راستہ اپنایا تھا اس کے لیے قربانی کے جس کڑے امتحان سے گزری ہے، ہم اس پر اس کے سپاس گزار ہیں۔ انشاء اللہ ہمارے ہوتے ہوئے کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ ہمارے درمیان یہ طے پایا تھا کہ میری اور اس کی ملاقات اس کے گھر پر بھی ہوتی رہے گی۔

باہر تو ہمیں ملنا ہی تھا----!

جب عظمیٰ میرے ہاں سے رخصت ہو رہی تھی تو اس کے چہرے سے جھلکتا اعتماد اور سرشاری کی کیفیت مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ اس نے کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر اور اپنے ضمیر کے عین مطابق کیا تھا۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی جو اپنے پراعتماد فیصلوں پر عمل کر گزرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھی۔

بہت مضبوط ارادوں کی مالک تھی وہ----!

عظمیٰ جب اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی تو اسے علم نہیں تھا کہ میرے دو آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ نگرانی اتنے نامحسوس طریقے سے کی جا رہی تھی کہ اس کی بجائے اگر کوئی تربیت یافتہ ایجنٹ بھی ہوتی تو اسے شک نہ گزرتا۔

یہ نگرانی دوہرے مقاصد کے تحت کی جا رہی تھی----!

ہمیں اس بات کا اندازہ لگانا تھا کہ یہاں آتے ہوئے اسے کسی نے نہیں دیکھا اور دوسری بات یہ کہ یہاں سے نکلنے کے بعد تو کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا----!

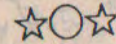
مجھے تھوڑی دیر بعد رپورٹ مل گئی کہ "لائن کلیئر" ہے۔



چند روز پہلے ہی ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایک محب وطن پروفیسر کو ایک غنڈے نے جو خود کو طالب علم لیڈر کہلاتا تھا، خنجروں کے پے در پے وار کر کے بڑے بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

عظمیٰ نے مجھے اطلاع دی تھی کہ مطلوبہ غنڈہ اس کے بھائی کمال کا دوست ہے۔ کمال بھی اس کے ساتھ ہی زیر زمین جا چکا تھا---- اس غنڈے طالب علم نے اس سے پہلے بھی قتل کی پانچ وارداتوں کا ارتکاب کیا تھا جن میں یہ گزشتہ پانچ چھ ماہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔ ہماری اطلاعات کے مطابق وہ عموماً" کلکتہ میں رہتا تھا اور یہاں اسے صرف وارداتیں کرنے کے لیے بھیجا جاتا تھا----!

نذر نام تھا اس کا----!



عظمیٰ کی پہلی اطلاع ہی زبردست اہمیت کی حامل تھی۔ اس کی رپورٹ کے مطابق نذر نے اگلے روز شام ڈھلے فیل خانہ میں رہنے والے ایک ہندو عوامی لیگی کے گھر آنا تھا جہاں رات قیام کے بعد ان لوگوں نے ڈھاکہ شہر میں پاکستان کے حامی ایک عالم دین کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

پہلا شکار ہی بھرپور تھا----!

پہلی "ڈیل" ہی شاندار تھی----!

میرے ہاتھوں میں اس کا نام سنتے ہی بجلیاں بھرنے لگی تھیں---- ہم نے بڑے سلیقے سے منصوبہ بندی کے ساتھ اس پر جال پھینکا تھا۔

ہماری خواہش تھی نذر کو ایسی موت سے دوچار کیا جائے کہ شہداء کی روحیں وجد میں آ کر رقص کرنے لگیں۔

شام تک ہم نے اس قاتل کو زیر دام لانے کا منصوبہ "ڈو سکس" کر لیا تھا۔ میرا دیرینہ ساتھی حوالدار مستان اس مہم میں ساتھ تھا۔ مستان کو کمانڈوز میں "لائن" کہا جاتا تھا---- "فری فال" میں اسے کمال حاصل تھا۔ آسمان سے وہ تودے کی طرح زمین پر آتا تھا۔ اس کا چھاتہ زمین سے بمشکل چند سو فٹ کی بلندی پر کھلا کرتا تھا۔

خالی ہاتھ لڑنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ گھیرے میں آنے کے بعد تو اس کی وحشت دو چند ہو جاتی تھی۔ چھوٹا قد اور گہرا سانولا رنگ ہونے کی وجہ سے وہ یہاں مکمل فٹ بیٹھتا تھا۔

حوالدار مستان کو آج ایک مدت کے بعد اپنے اصلی جوہر دکھانے کا موقعہ ملا تھا۔ اس کا تو رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔



مغرب کی نماز دفتر ہی میں ادا کرنے کے بعد ہم اپنی کمین گاہ سے نکلے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس میرے ساتھیوں نے "فیل خانے" کو آنے جانے والے راستوں پر نظریں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے خوش گپیاں کرتے نیلما کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ مستان نے ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی کمال خوبصورتی سے اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ ہم دونوں نے مقامی طرز کے کھلے پائنچوں والے پائجامے اور کرتے پہن رکھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے کینوس کے تھیلے تھے جن میں ہمارے شکار کی موت کا سامان بند تھا۔ مستان کے ہاتھ والے تھیلے میں "واکی ٹاکی" تھا۔ ہم نے ابھی اپنا پہلا چکر ہی مکمل کیا تھا جب مستان کے واکی ٹاکی پر زندگی بیدار ہوئی اور ایک ساتھی نے اس طرف آنے والے ایک سائیکل رکشہ میں نذر اور اس کے دو ساتھیوں کے آنے کی خوشخبری سنائی۔

ہم دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں منصوبہ طے کیا اور اپنی راہ لگ گئے۔ دونوں اکٹھے ہی اس ذیلی سڑک پر آ گئے تھے جس کا خاتمہ اس ہندو لیڈر کے گھر پر ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک سائیکل رکشہ اس طرف آتا نظر آیا جس سے کچھ فاصلے پر ہمارے ایک ہماری ساتھی کا سائیکل بھی موجود تھا۔ اس نے ہم پر نظر پڑتے ہی سائیکل تیزی سے آگے بڑھایا اور ہمارے نزدیک سے گزرتے ہوئے مخصوص اشارہ کر دیا۔

ہم محتاط تھے----!

نذر کی شکل پر نظر پڑتے ہی میرے خون میں کوندا سا لپکا۔ مستان کا بھی یہی حال تھا۔ اس کے دونوں ساتھی اپنی کٹنگ سے فوجی افسر دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں نے چونکہ ابھی سے ڈھاکہ کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھ رکھا تھا' اس لیے زیادہ احتیاط کا تردد نہیں کرتے تھے۔ منہ اٹھائے چلے آتے تھے کیونکہ انہیں یہی علم تھا کہ سارا مشرقی پاکستان ان کے ساتھ ہے اور کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔

تینوں نے رکشہ وہیں چھوڑا اور پیدل کوٹھی کی طرف چل دیئے۔

ہم جانتے تھے کہ یہ سائیکل رکشہ والا بھی ان کا ساتھی ہے لیکن فی الوقت اس کو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ یہاں سے چند سو گز آگے اس کے استقبال کا سامان موجود تھا۔ جیسے ہی وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچا' ہمارے ساتھیوں نے اسے قابو کر لیا۔ یہ کارروائی اتنی تیز' اچانک اور بھرپور تھی کہ کسی اور کو تو کیا خود اسے علم نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔



اندھیرا ڈھاکہ کی قسمت پر رات کی صورت مسلط تھا----!
بجلی کے پول سے لٹکتی بیمار اور زرد روشنیاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھیں
جب تین سائے ایک دوسرے کے تعاقب میں فیل خانے سے باہر آ رہے تھے۔ ان کا رخ
اس سڑک کی طرف تھا جہاں سائیکل رکشہ والا ان کا ساتھی ان کا منتظر تھا۔ ذیلی سڑک کے
ایک موڑ پر وہ ٹھٹک کر رک گئے۔
شاید یہی ان کی آر-وی (وہ جگہ جہاں جاسوس یا تخریب کار آپس میں ملاپ کرتے ہیں)
تھی۔

ان کی توقعات کے برعکس ان کا ساتھی یہاں موجود نہیں تھا۔ تینوں برق رفتاری سے
واپس پلٹے لیکن اچانک ہم پر نظر پڑتے ہی بھونچکا کر رہ گئے----!
وہ معمولی قسم کے غنڈے نہیں تھے۔ بھارتی فوج کے تربیت یافتہ تخریب کاروں کے
استاد تھے۔ ان میں سے ایک کا ہاتھ بے اختیار پتلون کے پائنچے کی طرف بڑھا---- یہ الگ
بات کہ اس کے ارادے کی خبر مستان کی چھٹی حس نے پہلے ہی مستان کو دلا دی تھی----!
تھیلا زمین پر پھینک کر اس نے چیتے کی طرح زقند بھری۔ اس کی دونوں ٹانگیں اتنی زور
سے بھارتی تخریب کار کے سینے پر لگیں کہ اگر اس کا سینہ فولاد کا بنا ہوا بھی ہوتا تو ٹوٹ
جاتا----!

زمین پر گرے تخریب کار پر وہ الٹے قدموں گرا اور دوسرے ہی لمحے اپنی ٹانگوں پر کھڑا
تھا۔ تخریب کار پر موت جیسی بے ہوشی طاری تھی۔
یہ سب کچھ "آناً فاناً" ہو گیا---- بجلی کی سی سرعت کے ساتھ---- پلک جھپکتے میں
ان کے ایک ساتھی پر قیامت گزر گئی۔
"خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دو۔" میں نے دونوں کو للکارا۔
میری للکار کا جواب دونوں کے ہاتھوں میں موجود لمبے چاقوؤں کی شکل میں موجود تھا۔
"تمہیں اپنی خنجر زنی پر بہت ناز ہے---- لیکن آج تم اپنے ہاتھوں قتل ہو گے۔"
میں نے نذر کو مخاطب کیا۔
میری آنکھوں میں خون اور ہاتھوں میں قہر اتر آیا تھا۔ مستان کی حالت مجھ سے کچھ الگ
نہیں تھی۔

ہم دونوں نے گویا اپنی اپنی مرضی کے شکار منتخب کر لیے تھے۔ نذر نے گالیاں بکتے
ہوئے تربیت یافتہ فوجیوں کے انداز میں مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ میرے



بجائے سڑک پر گرا، لیکن اٹھ کھڑا ہوا اور دوبارہ گالیاں بکتا میری طرف بڑھا۔
کچھ اس طرح کے حالات کا سامنا مستان کو بھی تھا۔
میں نے ایک دو مرتبہ تو اسے بھکائی دے کر خود کو بچایا، پھر اسے اپنی زد میں لے لیا۔
اس سے پہلے کہ وہ واپس پلٹتا، میں نے اس کے خنجر والے ہاتھ کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔
ایک ہی جھٹکے نے اس کی کلائی توڑ ڈالی۔ اس کی چیخ بہت بھیانک تھی۔ خنجر والا ہاتھ م
کر اس کے پیٹ سے جا لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اپ
دوسرے بازو کی مکمل قوت بروئے کار لا کر اسے فضا میں اچھال دیا۔
نذر زمین پر اس پوزیشن میں گرا تھا کہ اس کا خنجر مکمل اس کے پیٹ میں داخل ہو چ
تھا---- دم توڑتے درندے کی طرح وہ ڈکرایا اور بمشکل پہلو بدل سکا۔ خنجر شاید زہر آ
تھا۔ اس سے پہلے وہ اس خنجر کے ذریعے نجانے کتنے بے گناہوں کی جان لے چکا تھا۔
موت نے اسے زیادہ مہلت نہیں دی تھی۔ اس پر جہنم کے دروازے کھل چکے تھ
جلد ہی وہ اپنے انجام سے دوچار ہو گیا۔
حوالدار مستان نے اپنے شکار کی کلائی کی ہڈی توڑ دی تھی۔ وہ زمین پر گرا بے بس
پرندے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ اب تک اس طرف آیا کوئی نہیں تھا۔
یوں ہی آج کل حالات اس نہج پر آ چکے تھے کہ شام ڈھلنے کے بعد لوگ خوف کے مارے
گھروں سے کم ہی باہر نکلا کرتے تھے۔
تھوڑی ہی دیر بعد بھارتی انٹیلی جنس کے دونوں افسروں کو ہم ایک جیپ میں ڈال کر
اپنی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ نذر کی لاش ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ بادی النظر میں یہی
دکھائی پڑتا تھا کہ اس کی موت کار کے ساتھ ایکسیڈنٹ میں واقع ہوئی ہے۔
چونکہ اس کی شناخت ممکن نہیں تھی۔ صبح اس کی لاش مسخ شدہ حالت میں ملی تو اسے
لاوارث سمجھ کر دفنایا گیا۔
اس کے تینوں ساتھی ہمارے پاس زیر تفتیش تھے---- اگلے روز رات گئے تک انہوں
نے نہ صرف بہت سی گزشتہ وارداتوں کا اعتراف کیا بلکہ مستقبل کے منصوبے بھی اگل
دیئے۔ ان کی پلاننگ کتنی ہولناک تھی اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔



عظمیٰ سے میری ملاقات تین روز بعد ہوئی----!

اسے میرے ذریعے نذر کے انجام کا علم ہوا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ کسی کو اس پر شک نہیں گزرا۔ یوں بھی ہم نے ایسے شواہد پیدا کر لیے تھے اور نذر کی موت کے دوسرے ہی دن اخبارات کو ایک بھارتی جاسوس کی گرفتاری کی خبر جاری کر کے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی جیسے اس نے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا ہے اور اگر نذر گرفتار بھی ہے اسی کی وجہ ہے۔

عظمیٰ کو اس کے باپ نے میرے پاس حسب سابق بھیجا تھا۔۔۔۔!

انسان کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں، لیکن وہی انسان اگر گرنے پر آ جائے تو اس کی ذلت وا کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔۔۔۔! مجھے ان لوگوں کو دیکھ کر انسانوں کے روپ دیکھنے کا اتفاق ا۔

عظمیٰ اگر عظمت تھی۔

تو۔۔۔۔!

اس کا باپ کمینگی اور ذلالت۔۔۔۔!

یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی یا پھر حسن اتفاق کہ دونوں ایک ہی گھر میں بظاہر ایک مقدس رشتے سے بندھے زندگی بسر کر رہے تھے۔



ہم دونوں دفتر کی گھٹی گھٹی فضا سے باہر نکل آئے۔۔۔۔!

باہر آنے کے لیے میں نے حسب روایت چور دروازے کا انتخاب کیا۔ انسان کبھی کبھی اتنا مجبور بھی ہو جاتا ہے کہ اپنے گھر میں داخل ہونے اور باہر آنے کے لیے بھی اسے چور دروازوں سے آنا اور جانا پڑتا ہے۔

ہماری روحیں اندھیرے میں ماتمی چادر اوڑھے ماحول پر نوحہ کناں تھیں۔ تنہائی تو جیسے ڈھاکہ کی فضا میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔۔ سناٹا ڈسنے کو آتا تھا۔۔۔۔ کبھی کبھی ہمارے نزدیک سے کوئی سواری چپ چاپ گزر جاتی۔ عجیب بات ہے گاڑیوں کے انجنوں کا شور بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔۔۔۔ شاید کسی نے کالا جادو کر کے ڈھاکہ کے ماحول کو باندھ دیا تھا۔۔۔۔!

اس ماتمی فضا میں میرے ہمراہ عظمیٰ زندگی کی واحد علامت بن کر چل رہی تھی۔ ہم نے اب تک تین چار سڑکیں بدل لی تھیں۔ اس روز ہم دونوں ہی پیدل چلنا چاہتے تھے، ہمارے ساتھ ساتھ سڑکوں کے کنارے گھنے درخت سر جھکائے ماحول کی یاسیت کو دوچند کر رہے



ے

سناٹا چھانے لگا تھا۔

سرسراتی ہواؤں نے اب درختوں کی ٹہنیوں سے بغلگیر ہو کر چیخنا شروع کر دیا تھا۔ بوڑھے آسمان کے ایک کونے سے ڈرتے ڈرتے چاند نے سر نکال کر حسب توفیق چاندنی بانٹنا شروع کر دی تھی۔

عظمیٰ کے کھلے بال جو اس نے بڑے سلیقے سے اپنے شانوں پر ڈال رکھے تھے، ہوا کے دوش پر ساری پابندیوں سے آزاد ہو کر لہرانے لگے۔ ایک آوارہ لٹ بار بار اس کے ماتھے اور پھر ہونٹوں پر سرسرانے لگتی۔

وقت آنسو کی طرح ہمارے ہمراہ بہہ رہا تھا۔

عظمیٰ نے دو تین مرتبہ ہتھیلی کی پشت سے بالوں کی لٹ کو ہٹانے کی کوشش کی، لیکن ہار کر اسے جوں کا توں رہنے دیا۔

ہم دونوں خزاں کے زرد پتوں کی طرح مختلف سڑکوں پر اڑتے چلے جا رہے تھے۔ ڈھاکہ کی ہواؤں میں سازش کا موسم سانپ کی طرح رینگ رہا تھا۔ بنگالی لڑکی زندگی کی علامت بن کر میرے ساتھ سفر کر رہی تھی۔

چلتے چلتے میں کبھی کبھی عظمیٰ کی طرف گردن موڑ کر دیکھ لیتا۔۔۔۔ یہی واحد ذریعہ تھا اسے اپنے ساتھ محسوس کرنے کا۔۔۔۔!

”حالات تو روزانہ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔“ اس نے چلتے چلتے مجھے کہہ دیا۔

اس کی بات زوردار ہوا کے تھپیڑے کی طرح میری سماعت سے ٹکرائی اور ایک چھناکا میرے ذہن میں ہوا۔ وہ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی، لیکن نجانے میں کیوں چاہتا تھا کہ وہ یہ بات نہ کہے۔

”لیکن ہمیں بہرحال اچھے وقت کا انتظار کرنا ہے۔“ اس نے خود ہی اپنی بات کا جواب بھی میری طرف سے دے دیا۔

عجیب لڑکی تھی وہ۔۔۔۔!

اس کی ذات اس لمحے کہرے سے لپٹے ماحول میں دور سے نظر آنے والی واحد پناہ گاہ محسوس ہوئی مجھے۔۔۔۔ وہ خود ہی حالات کا ہولناک تجزیہ کر کے خود ہی روشنی کی کرن بھی مجھے دکھا دیتی تھی۔

عجیب لڑکی تھی وہ۔۔۔۔!

متعدد مرتبہ جب میں یاس و ملال کی اتھاہ گہرائیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا' وہ میرے ہاتھ میں چپکے سے امید کی مشعل تھما دیتی۔

ہم اب انٹرکانٹی نینٹل کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔

ہوٹل کی روشنیاں اندھیری سڑک پر دور تک سائے کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ موسم بدلنے کا منظر کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔

عظمیٰ کے ساتھ ہوٹل کے ڈائننگ ہال کی اس میز پر جو شیشے کی چادر کے نزدیک دھری تھی' آمنے سامنے دھری سفید کرسیوں پر بیٹھ کر مجھے اپنے گاؤں کے کھیتوں کی منڈیروں پر لگے شیشم کے بے شمار درخت یاد آنے لگے تھے۔ میں خود کو جامنوں کے گھنے جھنڈ میں کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ اس موسم میں جامن پک جاتے تھے۔

میرے سامنے جامنی ساڑھی میں ملبوس عظمیٰ بیٹھی تھی۔

اس روز پہلی مرتبہ میں نے بہادر سپاہیوں کی طرح اس کے سامنے اپنی شکست کا اظہار کر دیا---- میں نے اسے بتا دیا کہ کارزار حیات میں لڑائی کے اصولوں کی تربیت میں نے نہیں لی تھی ورنہ شاید میں یوں اس کی سحرزدہ آنکھوں کے سامنے سرنڈر نہ کر جاتا۔

"آپ کا اقرار میرے لیے اعزاز ہے۔ اسے اپنی شکست نہ کہئے۔ مجھے شرمندگی ہو گی۔"

بنگالی کی جادوگرنی نے اپنا فسوں پھونکا۔

ہم دونوں بہت دیر تک اپنے ماضی کی باتیں کرتے رہے۔ جب اٹھے تو ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان کر کے اٹھے تھے۔

میں اسے گھر تک چھوڑ کر واپس آ گیا۔

واپسی کا سفر مختصر لیکن تھکا دینے والا تھا۔

ساری تھکن مجھے اکیلا پاتے ہی مجھ پر حملہ آور ہو گئی تھی۔

تمام خدشے' وسوسے جو اب تک میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں کنڈلی مارے بیٹھے تھے' پھن پھیلا کر میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ میں امید و یاس کی تھکا دینے والی لڑائی لڑتا بالآخر اپنے دفتر تک پہنچ گیا۔

# قیامت کی راتیں

عظمیٰ کے گھر میرے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا----!

ہم دونوں بالکل نامحسوس انداز سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی ہمیں کوئی اہم اطلاع ملتی' ہم اس پر فوری کارروائی کرتے۔ اس کارروائی میں یہ احتیاط بطور خاص ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ دشمن کو کبھی یہ گمان ہی نہ گزرے کہ اس کے اندر کوئی ہمارا آدمی موجود ہے۔

عظمیٰ ہمارا اتنا اہم "سورس" تھی کہ اس کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دی گئی۔

اعلیٰ کمان کی ہدایت پر یہ کیس صرف مجھ ہی تک محدود تھا۔

اس نے دو تین ماہ میں ہمارے لیے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے جو شاید ہم میں سے کوئی برسوں میں نہ دے پاتا۔ ہمارے لیے وہ اپنی جان سے گزر گئی۔ ایک طرف اس کا خود ساختہ سماج اور خون کا رشتہ تھا اور دوسری طرف اس کی اپنے ملک' ملت اور مذہب سے کومٹ منٹ تھی۔ اس مادی دور میں وہ قرون اولیٰ کی کوئی مسلمان زادی نظر آتی تھی۔ اس کا علم اس کے صدق کا آئینہ دار تھا۔

عظمیٰ کی طرح کچھ اور مسلمان لڑکے اور لڑکیاں بھی جی جان سے ہمارے ساتھ تھے۔ یہ لوگ بعد میں اپنی جان سے بھی گزر گئے۔ اپنی جان کی بازی لگا کر بھی وہ ہمارے لیے کام کرتے رہے---- اصل میں لفظ "ہمارے" تو بہت محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ ان کے شایان شان نہیں' وہ تو اپنی عافیت کے لیے---- راہ گم کردہ انسانیت کے لیے' ملت اسلامیہ کے لیے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے سارے بندھن توڑ کر ایک ہی مضبوط رشتہ قائم کر رکھا تھا۔ اپنے دین کا اپنی زمین کا رشتہ۔ جس کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ ان تک دشمن کے زہریلے نظریات کا کلہاڑا کبھی پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔



حسن آراء کی شادی ہو گئی----!

میرے سر سے بوجھ اتر گیا' میری ماں نے مجھے لکھا تھا:

"بیٹا! خود کو کبھی اکیلا محسوس نہ کرنا جیسے میں نے کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کیا۔ تمہارا چھوٹا بھائی، تمہارے باپ کی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عمدہ برآء ہوا ہے۔ اللہ نے جس سے جو کام جہاں بھی لینا ہو، لے لیتا ہے۔ شاید اسے یہی منظور تھا کہ تمہاری یہاں سے زیادہ وہاں ضرورت ہو۔

بیٹا! جنگ تیرے لیے نئی بات نہیں۔ تو سپاہی کا بیٹا اور خود بھی سپاہی ہے۔ اگر کبھی دشمن نے تیری غیرت کو للکارا تو پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ میں تیری شہادت پر فخر کروں گی، لیکن بزدلی کا طعنہ مجھے جیتے جی مار ڈالے گا۔

بیٹا! مجھے لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی بڑا حادثہ، کوئی بڑا معرکہ----! میری دعائیں، ہم سب کی دعائیں تیرے اور تیرے ساتھیوں کے ساتھ ہیں۔ بیٹا! زندہ دشمن کے ہاتھ نہ لگنا۔ یہ سبق تیرا باپ تجھے بچپن سے پڑھاتا آیا ہے۔ اس سبق کو میدان جنگ میں بھی کبھی فراموش نہ کرنا۔ میرے دودھ کی لاج رکھنا۔

اللہ تجھے اور تیرے جیسے تمام بیٹوں کو اپنی امان میں رکھے۔

تیری کامیابی کے لیے دعاگو

تیری ماں"

جو بات میری ماں نے اپنے خط میں لکھی تھی، وہ میرے باپ نے مجھے بچپن میں ایسی پڑھا دی تھی کہ اب میرے خون میں گردش کرنے لگی تھی۔ اس روز میں نے صدق دل سے دعا کی کہ خدایا! اول تو ہم گناہگار بندے کسی آزمائش، کسی امتحان کے لائق ہی نہیں ٹھہرتے---- لیکن کبھی ایسا وقت آ جائے تو ہماری لاج رکھ لینا۔



۲۳ مارچ ۷۱ء کا دن میں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔

اس روز میں سادہ کپڑوں میں ملبوس ڈھاکہ کی ایک پررونق شاہراہ پر کھڑا تھا۔ ۲۱ مارچ کے بعد سے ہمیں ایک پل چین نصیب نہیں ہوا تھا۔ مغربی پاکستان سے سیاسی لیڈروں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اور ہم ان کی حفاظت کے بھی ذمہ دار تھے۔ ڈھاکہ کی فضا میں سلگتا آتش



فشاں اب کسی بھی لمحے پھٹ جانے کو تیار تھا---- ڈھاکہ یونیورسٹی سے ہمارے ذرائع ۲۳ مارچ کو یوم استقلال کے روز کسی بڑی ہنگامہ آرائی کی خبریں دے رہے تھے۔

عوامی لیگ نے اسے "یوم مزاحمت" کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس روز ڈھاکہ کی گلیوں اور بازاروں میں شرپسندوں نے راتوں رات سبز اور قرمزی رنگ کے بنگلہ دیش کے پرچم لہرا دیئے تھے۔ شیخ مجیب کے گھر پر بھی یہی پرچم لہرا رہا تھا۔ اس نے شرپسندوں کے ایک گروپ کے ساتھ اس پرچم کو سلامی دی----!

اس روز بنگالی عصبیت انتہا سے گزر گئی۔

شرپسندوں نے پاکستانی پرچم اور معمار قوم حضرت قائداعظمؒ کی تصاویر کو جلا دیا۔ ریڈیو سے رابندر ناتھ ٹیگور کا گیت "سنار بنگلہ" نشر کیا گیا جسے بنگلہ دیش کے سرکاری ترانے کی حیثیت دی جا رہی تھی۔

استحکام اور اتحاد پاکستان کی دونوں نمائندہ جیتیوں (قائداعظمؒ اور ہلالی پرچم) کو ختم کر کے بدقسمت بنگالیوں نے گویا اپنی آزادی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیا تھا۔

قائداعظمؒ اور پرچم کی توہین کی خبر سے پاکستان ہمدرد طبقوں کے دل ٹوٹ گئے۔ میں نے اس روز درجنوں بنگالیوں کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا---- شاید کسی روتے ہوئے دل، خون بہاتی آنکھ یا پھر زخمی روح نے اس روز بنگالیوں کے لیے "بنگلہ دیش" کی بددعا مانگ لی تھی۔

شاید قائداعظمؒ کا، اس صدی کے بہت بڑے انسان کا، سراپ پڑ گیا تھا ان پر---- اس روز آسمان نے قہر برسانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بدقسمت اور ورغلائے گئے گمراہ بنگالیوں کی تقدیر لکھی جا چکی تھی۔ تاریخ نے ان کی تحریک کو رد کر دیا تھا۔

مجیب الرحمان تقدیر کے مسترد فیصلے کو بنگالیوں کی قسمت بنانے پر تل گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کا فیصلہ کرنے والا بھارت یہ بھول گیا کہ ایسے کئی فیصلے اس کی اپنی زمین پر بھی ہونے والے ہیں----!

بنگلہ دیش لعنت کا طوق بن کر ہمیشہ کے لیے بھارت کے گلے پڑنے والا تھا۔ قائداعظمؒ نے پاکستان ہر مسلمان کے دل میں بنا دیا ہے۔ دنیا میں جہاں بھی کوئی مسلمان آباد ہے---- اس کے دل میں پاکستان زندہ ہے---- پاکستان منزل نہیں، پڑاؤ ہے۔ منزل تو دور کہیں بہت آگے ہے۔

"اکھنڈ بھارت" کے نعرے لگانے والا مہاجن بھول گیا کہ "مسلم انڈیا" کا تصور مسلمان کے دل میں زندہ ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔

آج بنگلہ دیش اندھیرے میں ڈگمگاتی کشتی ہے، بنگلہ دیش کی زمین آج پھر کسی قائداعظمؒ کی منتظر ہے۔ سارا عالم اسلام آج پھر کسی قائداعظمؒ کا منتظر ہے۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے----!

یہ تقدیر ہے----!

یہ نوشتہ دیوار ہے----!

کوئی اندھا ہے تو بھی باطن کی آنکھ سے اسے پڑھ لے----!

یہ آئینہ جتنے ٹکڑوں میں بٹے گا، آئینے کی حیثیت سے زندہ رہے گا۔ دنیا میں، روئے زمین کے کسی بھی خطے پر جہاں کوئی مسلمان موجود ہے، وہ خطہ پاکستان بننے والا ہے۔

ایسا ایک پاکستان اب بھارت کے پیٹ سے جنم لے رہا ہے۔

جو آگ بھارتی حکمرانوں کے اشارے پر ۲۳ مارچ ۷۱ء کو شرپسندوں نے قائداعظمؒ کی تصویر اور ہلالی پرچم کو لگائی تھی---- اس آگ کا سراپ براہمن پر پڑ چکا تھا۔ یہ آگ اب اس کے خرمن ہستی میں سلگنے لگی ہے۔ بس کوئی دن آیا کہ آیا---- جب یہ آگ اسے بھسم کر ڈالے گی۔ تب ایک نیا یدھ ہو گا---- نیا مہابھارت ---- گھمسان کا رن پڑے گا۔

تاریخ کے فیصلے دیر سے تو ہوتے ہیں، لیکن دیرپا ہوتے ہیں۔ قائم رہنے والے۔ زندہ رہنے والے۔ اتنے ہی قائم جتنے قائداعظمؒ، اتنے ہی زندہ جتنا قائداعظمؒ کا پاکستان----!



۲۴ مارچ کی رات کو باول نخواستہ پاکستان آرمی کا وہ فیصلہ ہم تک پہنچا جس نے بعد میں بہت متنازعہ حیثیت اختیار کی۔

بیشتر دانشور اس فیصلے کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد قرار دینے پر بضد ہیں۔ ایک سپاہی ہونے کے ناطے مجھے سیاست کی الف بے کا بھی علم نہیں، لیکن جن حالات میں یہ فیصلہ کیا گیا، ان میں ایسا کرنا ناگزیر ہی ٹھہرتا تھا۔ سوچنے کا اپنا اپنا انداز ہے۔ جس نے ایسا کرنا سوچا ہو گا، اس کے پاس ضرور اس کی کوئی جسٹی فکیشن رہی ہو گی۔

بسا اوقات انسانی بدقسمتی سے اچھے فیصلے برے نتائج اور انسانی خوش قسمتی سے برے فیصلے



اچھے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ شاید ایسا کوئی عمل یہاں بھی وقوع پذیر ہو گیا کہ اچھے فیصلے پر بری طرح عمل کیا گیا اور برے نتائج حاصل ہوئے۔



مجھے اس فیصلے کی رات ڈھاکہ میں گزارنا تھی۔

بہت تلخ تجربہ تھا یہ زندگی کا----!

اس روز شام گئے تک میں اور عظمیٰ اکٹھے رہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس کے گھر کے لوگوں کو کانوں کان یہ خبر نہ ہو سکی کہ ان کے غدار ساتھیوں کے ساتھ جو قیامت گزر گئی ہے اس میں عظمیٰ کا کوئی ہاتھ رہا ہے۔

میں نے یہاں خوش قسمتی کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ان حالات میں ہم صرف تقدیر پر شاکی تھے---- بہت اچھے اچھے منصوبے صرف اس لیے ناکامی سے دوچار ہوتے کہ ان کا افشاء وقت سے پہلے ہو جاتا اور سب کچھ کیا دھرا رہ جاتا----! بسا اوقات تو نتائج اتنے غیر متوقع ہوتے کہ بڑے ذہین اور صابر لوگ بھی جھنجلا کر رہ جاتے۔

عظمیٰ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ اپنی ملت اور مذہب کے رشتے پر کسی رشتے کو وہ مقدم نہیں جانتی خواہ وہ خون ہی کا رشتہ کیوں نہ ہو۔ وہ میری محبت تھی۔ مجھے اس پر اتنا ہی اعتماد تھا جتنا میں خود پر کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے عظمیٰ کو نہیں بتایا کہ آج کی رات کیسی وحشت کی رات ہو گی اور اسے گھبرانا نہیں چاہیے۔

ہم دونوں شام کے بعد الگ ہو گئے----!

میں سیدھا اپنے آفس میں آ گیا جہاں کچھ نئی اطلاعات میری منتظر تھیں۔

میرے ساتھی وردیاں پہنے کچھ کر گزرنے کے منتظر تھے۔

عظمیٰ سے ملنے والی نئی اطلاعات پر ہم نے مزید غوروخوض کیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں اپنے ایریا میں ہونے والی کارروائی کی ہدایات دیں۔

ہمارے حصے میں ڈھاکہ میں شرپسندوں کا سب سے بڑا گڑھ یعنی ڈھاکہ یونیورسٹی آئی تھی۔ مجھے اپنے سیکشن کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سب سے خطرناک حصے جگن ناتھ ہال پر قبضہ کرنا تھا۔ ایک اور سیکشن بھی میری کمانڈ میں دی گئی تھی جس نے اس سے ملحقہ یونیورسٹی کیمپس اور اقبال ہال پر قبضہ کرنا تھا۔ ہماری اطلاعات کے مطابق جگن ناتھ اور اقبال ہال میں شرپسندوں نے خطرناک اور خودکار اسلحہ بڑی تعداد میں جمع کر رکھا تھا اور یونیورسٹی

کے اس حصے میں بھارتی فوج کے باقاعدہ کمانڈوز بھی ان شرپسندوں کی مدد کے لیے موجود
تھے۔

ہمیں پہلے سے تیار شدہ پلان کے مطابق فیل خانہ میں واقع اپنے ہیڈکوارٹر سے سیدھا
رمنا ریس کورس کی طرف جانا تھا۔ اس طرح لمبا چکر کاٹ کر ڈھاکہ یونیورسٹی پہنچنا تھا جب
کہ دوسری سیکشن کو فیل خانہ سے نیو مارکیٹ کے راستے منزل مقصود تک پہنچنا تھا۔ اس
دوران پاکستان آرمی کی مایہ ناز ۲۲ بلوچ رجمنٹ فیل خانہ ہی میں موجود رہتی کیونکہ یہاں ای
پی آر (ایسٹ پاکستان رائفل) کا ہیڈکوارٹر تھا۔ جہاں ای پی آر کی پانچ ہزار نفری موجود تھی۔
۲۲ بلوچ نے ان لوگوں کو غیر مسلح کرنا اور ان کے ٹیلی فون ایکسچینج پر قبضہ کرنا تھا۔۔۔۔!

ہمیں یونیورسٹی کیمپس تک کسی مزاحمت سے بچنے کے لیے یہ راستہ اختیار کرنے کی
تلقین کی گئی تھی کیونکہ فیل خانہ میں ای پی آر کی طرف سے مزاحمت کے امکانات موجود
تھے۔ گزشتہ تین روز سے ہمارا گشتی دفتر عملاً یہیں منتقل ہو چکا تھا اور راجر باغ میں صرف
تین سپاہی اور ایک صوبیدار ہی باقی رہ گئے تھے۔

ہم نے اپنے آپریشن کا آغاز رات ساڑھے بارہ بجے کرنا تھا، لیکن شاید منصوبہ قبل از
وقت افشاء ہو گیا تھا۔ اس لیے ہمیں رات گیارہ بجے روانگی کا حکم مل گیا۔ میرے ساتھ پندرہ
جوان تھے اور ہمارے پاس ہلکے اور خودکار ہتھیار تھے۔۔۔۔ چونکہ کارروائی برق رفتاری سے
انجام پانا تھی اور سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ انسانی جانوں کا ضیاع کم سے کم ہو، اسی لیے شاید
کمانڈوز کا انتخاب کیا گیا تھا۔

یونیورسٹی کے دروازے پر پہنچنے تک ہمیں صرف دو جگہ معمولی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا
جب کہ ہمارے اردگرد قیامت برپا تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے سناٹے کی کوکھ سے اچانک دیوہیکل درندوں نے جنم لے لیا ہو اور اب
وہ اپنی چیخم چنگھاڑ سے آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔ فائرنگ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی
تھی۔

آپریشن کا آغاز شاید سارے ملک میں وقت سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

اس لمحے مجھے رہ رہ کر ان بے گناہوں کا خیال آ رہا تھا جنہیں اس آپریشن کی بھینٹ
چڑھنا تھا۔ ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ کمزور تھے۔ اگر وہ پاکستان کی حمایت بھی کرتے تو زبان
سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، بصورت دیگر انہیں اس کی توقع سے بڑھ کر قیمت ادا کرنا پڑتی۔
اب یہ بے چارے پاکستان۔۔۔۔ شرپسندوں اور فوج کے درمیان گھر کر رہ گئے تھے۔



بعد کے واقعات سے ہمیں علم ہوا کہ متعدد مقامات پر شرپسندوں اور باغیوں نے ان بے
گناہوں کی آڑ لے رکھی تھی اور بیشتر مقامات پر یہ بھی ہوا کہ انہوں نے یا تو ان بے کسوں
کو پاکستانی فوج کی فائرنگ کے سامنے پھینک دیا یا پھر خود گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس طرح
انہیں دوہرے فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو مقتولین کی تعداد میں ان کے پلان کے مطابق
اضافہ ہوا اور بین الاقوامی پریس کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ دوسری طرف محب وطن
بنگالیوں کو کان ہو گئے کہ پاکستان کی حمایت (بھلے وہ خاموش رہ کر ہی کی جائے) کا انجام اتنا
بھیانک ہو گا اور مصیبت پڑنے پر انہیں بچانے کے لیے بھی کوئی نہیں آئے گا۔ (آپریشن
سرچ لائٹ کی تفصیلات میں یہ بات کہیں نہیں لکھی گئی کہ اس ہنگامہ آرائی کے دوران محب
وطن پاکستانیوں کی حفاظت کیسے کی جائے گی۔ شاید منصوبہ سازوں کے نزدیک اس بات کی
کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔)

جس طرح بے گناہ پاکستان کے حمایتی لوگوں سے مکتی باہنی نے بدلہ لیا اس کی تفصیلات
اتنی بھیانک اور شرمناک ہیں کہ ان کا ذکر ہی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا
کہ متعدد مقامات پر ان کا اجتماعی قتل عام کیا گیا۔

سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان عورتوں کی اجتماعی بے حرمتی کی گئی اور ان کے جسمانی
اعضاء کاٹ کر الگ الگ کر دیئے گئے۔۔۔۔!

تاریخ اسلام کے اس سیاہ ہولناک دور کی تفصیل لکھنے کے لیے ایک الگ کتاب کی
ضرورت پیش آئے گی۔



یونیورسٹی کیمپس کے دروازے پر پاکستان آرمی کے جوانوں نے پوزیشنیں سنبھال رکھی
تھیں اور ہماری توقعات کے عین مطابق اندر سے زبردست مزاحمت ہو رہی تھی۔ ہم لوگ
چکر کاٹ کر جگن ناتھ ہال کے سامنے پہنچ گئے۔ ابھی میرے جوان بمشکل ٹرک سے نکل کر
پوزیشنیں ہی لے پائے تھے جب اچانک ایک مارٹر کا گولہ ٹرک پر گرا اور اس کے پرخچے اڑ
گئے۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اندر بھارتی فوج کے تربیت یافتہ کمانڈوز مورچہ بند ہیں اور
ان کے پاس جدید ترین ہتھیار بھی موجود ہیں۔ خدا کا شکر یہ ہوا کہ صرف ایک جوان زخمی
ہوا ورنہ آپریشن کی ابتدا پر ہی ایسے واقعات سے جوانوں کا مورال اثر انداز ہو سکتا تھا۔

میری ہدایت پر اب جوانوں نے ایک خاص تنظیم سے آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں ہالوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے ہم پر گولیاں اور گولے مینہ کی طرح برس رہے تھے' لیکن ابھی تک ہم نے ایک گولی بھی فائر نہیں کی تھی۔ صرف فوجی اصولوں کے مطابق دوسری سیکشن کے لوگ ہمیں کور فائر دے رہے تھے تاکہ دشمن کو اپنی طرف الجھائے رکھیں۔

میری خواہش یہی تھی کہ ان لوگوں کو زندہ گرفتار کیا جائے اور کسی بھی طرح یہ ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہو جائیں۔ میں جانتا تھا ان میں زیادہ تعداد ان ورغلائے گئے بد قسمت بنگالی نوجوانوں کی ہے جنہوں نے ایک آدھ مرتبہ کلکتہ میں لگے بھارتی کیمپوں کو دیکھ لیا تھا اور ہندو نے ان کے منہ کو شراب اور عورت کی ہوس کی چاٹ لگا کر انہیں "بنگلہ دیش" کی زہریلی گولی شوگر کوٹڈ کر کے نگل جانے پر مجبور کر لیا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ اب بھی یہ ورغلائے گئے نوجوان راہ راست پر آ سکتے ہیں---!

لیکن صرف میری سوچ یہاں کیا معنی رکھتی تھی؟

میری حیثیت ہی کیا تھی؟

پاکستانی فوج کے ایک معمولی کیپٹن کی حیثیت سے میں کیا انقلابی قدم اٹھاتا؟

میں جانتا تھا میری طرح میرے تمام ساتھی بھی یہی سوچ رہے تھے۔ یہی چاہتے تھے۔

لیکن---!

جس دشمن سے ہمارا سابقہ تھا وہ کمینگی اور بزدلی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس کے مکار منصوبہ سازوں کے ذہن میں یہ بات ضرور رہی ہو گی کہ مسلمان کے لہو میں دل نوازی کا سلیقہ موجود ہے۔

اسی لیے---!

اس کمینے دشمن نے کبھی ایسے مواقع ہی پیدا نہیں ہونے دیئے۔

دشمن جانتا تھا' سمجھتا تھا کہ:

جب کبھی مسلمان آمنے سامنے آ گئے' انہیں آپس میں مل بیٹھنے کا موقعہ مل گیا' ان کے دلوں کی کدورتیں دور ہو جائیں گی۔

ان کے دلوں کی میل صاف ہو جائے گی۔

یہ مسلمان حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم ہو جائیں گے۔

اسی لیے' صرف اسی لیے دشمن نے کبھی ہمیں مل بیٹھنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔



افسوس! صد افسوس! ہمارے بنگالی بھائی ایک مسلسل دھوکے کا شکار ہو گئے۔



مجھے بادل نخواستہ صرف تین گولے راکٹ لانچر سے فائر کرنے پڑے۔ مزاحمت دو گھنٹے تک جاری رہی' پھر دم توڑ گئی۔ شاید اب مزاحمت کرنے والا کوئی اندر باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس گھناؤنے کھیل کو جاری رکھ سکے۔

پوربو پاکستان کی وہ خون اور بارود سے بوجھل رات آج تک میرے حواس پر سوار ہے---!

اس ایک رات نے انسانی وحشت اور بہیمیت کے کیا کیا مناظر نہ دیکھے ہوں گے---؟

اس رات پاکستان آرمی کے ہر فوجی نے اپنے ہاتھوں اپنے سینے میں گولیاں اتاریں۔

جب ان کی انگلی ٹریگر پر دبتی تو دل خون روتا تھا کہ یہ گولی وہ کس پر فائر کر رہے ہیں؟

لیکن---!

یہ تاریخ کا فیصلہ تھا۔

یہ تقدیر کا فیصلہ تھا۔

اور---!

بے بس اور بے کس انسان خواہ وہ اپنے تئیں کچھ بھی بنتا پھرے' تاریخ اور تقدیر کے فیصلے بدل نہیں سکتا۔ حالت کی بساط پر بچھے بے بس مہروں کی طرح ہم بھی اپنی چال چل رہے تھے۔

کبھی آگے' کبھی پیچھے' کبھی دائیں' کبھی بائیں۔

شاطر ہاتھ اپنا کھیل کھیلتے رہے۔

بھیگے ماجھیوں کی زمین' بانس اور تاڑ کے درختوں والا مشرقی پاکستان' ناریل کی خوشبودار ہواؤں والا ڈھاکہ خون کی ہولی میں نہا گیا۔

جب میں اپنے جوانوں کے ساتھ جگن ناتھ ہال میں داخل ہوا تو یہاں اسلحے کے ڈھیر آگ میں جل رہے تھے۔

ایک طرف کاغذات کا پلندہ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

ہمارے قدموں میں جو لاشیں بچھی تھیں ان میں بیشتر کے چہروں پر برستی نحوست یہ باور

جب میڈیکل کور کے دو جوان سٹریچر لے کر واحد کی لاش اٹھانے آئے تو میں نے انہیں ہدایت کی کہ میرے پیچھے چلے آؤ۔

وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھتے رہے۔

میرے حکم پر انہوں نے واحد کی لاش والا سٹریچر میری جیپ میں رکھ دیا۔

"تم لوگ جاؤ۔"

انہوں نے مجھے سلیوٹ کیا اور چلے گئے۔

☆○☆

مجھے علم نہیں میں کتنی دیر میں اپنے ذہن میں محفوظ واحد کے ایڈریس تک پہنچا تھا۔ اردگرد کی تباہی سے بے نیاز---- بس ایک میکانکی عمل کے تابع میں جیپ اڑائے چلا جا رہا تھا۔

راستے میں شاید دو جگہ پاکستان آرمی کے جوانوں نے روک کر تسلی بھی کی تھی۔ جب میں واحد کے گھر پہنچا تو سورج نے ڈرتے ڈرتے اپنا خونیں چہرہ ننگا کر لیا تھا۔

ڈھاکہ کی گلیوں اور بازاروں میں موت کا وحشت ناک رقص جاری تھا۔ کہیں کہیں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ کسی بازار کی نکڑ پر، کسی مکان کے سامنے موجود بے گور و کفن لاشیں رات کے ہولناک رقص اجل کا نوحہ الاپ رہی تھیں۔

تمام راستے پر سوائے فوجی وہیکلز یا پھر اکا دکا فوجی ٹولیوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا---- کوئی چرند نہ پرند۔ ڈھاکہ کی رونقیں مر چکی تھیں۔

یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے یہاں کبھی جنم لیا ہی نہیں تھا۔

ایک بازار سے ملحق آبادی کے باہر دروازے پر لگی نیم پلیٹیں پڑھتا میں ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ اس مکان پر میری توقع کے عین مطابق بنگلہ دیش کا پرچم نہیں تھا نہ ہی باہر کوئی ایسا نشان دکھائی دیتا تھا جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہاں کے مکین مکتی باہنی کے حامی ہیں۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔

لوہے کے دروازے پر پڑنے والی دستک کی گونج شاید ساری آبادی میں سنائی دی ہو گی، لیکن کوئی باہر نہ آیا۔

ایسا ہولناک سناٹا تھا کہ لوگ آواز سے خوفزدہ تھے۔



قریباً" دو منٹ کی بار بار دستک دینے کے بعد ایک بزرگ صورت دروازے کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ ڈھلتی عمر، سیاہی مائل گندمی رنگ، چہرے پر خشخشی داڑھی، کرتا اور دھوتی پہنے ایک چمکدار اور فراخ ماتھے والے بزرگ میرے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے سر پر نماز پڑھنے والی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی کہ ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار بالکل نہیں تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ مطمئن اور کسی بھی آنے والے لمحے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر کے باہر آئے ہیں۔

یہ صورت حال میری توقعات کے بالکل برعکس، لیکن قدرے اطمینان بخش تھی----!

مجھے تو یہ امید تھی کہ دروازہ کھلنے پر خوفزدہ صورت برآمد ہو گی۔ اسے مطمئن کرنے میں بہت وقت لگے گا جو یقیناً ایک الگ اور تکلیف دہ مسئلہ تھا۔ ان حالات میں مجھے اس بزرگ کے اطمینان بھرے چہرے پر رشک آ رہا تھا۔ خود میں غیر مطمئن تھا۔

سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں تک چلا تو آیا ہوں، اب آگے کے حالات کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔

عجیب تکلیف دہ ذمہ داری میں نے خوامخواہ خود پر عائد کر لی تھی۔

کسی باپ کو اس کے جگر گوشے کی لاش سونپنے کا منظر، تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ عملاً ایسے حالات سے گزرنا، پل صراط سے گزرنے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔

"اسلام علیکم----!"

"وعلیکم السلام----!" ان کی پرسکون آواز سنائی دی۔

ابھی تک انہوں نے میری جیپ پر نظر نہیں ڈالی تھی۔

"میرا نام کیپٹن شیر افگن ہے........"

"خدا کا شکر ہے۔" انہوں نے میری بات درمیان سے کاٹ دی۔ "میں ذہنی طور پر کسی اور مرحلے کی تیاری کر کے باہر آیا ہوں۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ پاکستانی فوجی باہر موجود ہے۔ بہرحال زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے، میرا ہمیشہ سے ایمان رہا ہے۔"

"بزرگوار----" میں نے تھوک نگل کر اپنے خشک گلے کو تر کرتے ہوئے گفتگو کی تمہید باندھی---- "میں بدقسمتی سے آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔ ایک ناخوشگوار فریضہ انجام دینے آیا ہوں۔"

"اگر تم یہ کہنے آئے ہو کہ میرا بیٹا واحد مارا گیا ہے تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری ملت کے لوگ اس کے مزید شر سے محفوظ ہو گئے۔ ایک باپ ہونے کے ناطے میری یہ

بات تمہیں بہت عجیب لگے گی، لیکن یہ حقیقت میرے اللہ کو بخوبی معلوم ہے کہ جس روز سے مجھے اس کے غدار ہونے کی اطلاع ملی ہے میں دن رات اس کی موت کی دعا مانگ رہا ہوں--- اور........" انہوں نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا--- "ان دعاؤں میں اس کی بد قسمت ماں بھی میرا ساتھ دے رہی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔

یہاں تو صورت حال ہی مختلف تھی۔ میری توقعات کے بالکل برعکس---! ایثار و وفا، قربانی اور حب الوطنی کے جو عظیم مظاہر مجھے دیکھنے کو مل رہے تھے۔ انہیں جان کر تو یہ سب کچھ جو ہمارے اردگرد ہو رہا تھا۔ جھوٹا اور بے وقعت دکھائی دیتا تھا۔ یوں احساس ہوتا تھا جیسے کسی نادیدہ ہستی نے ایک مصنوعی ماحول ہم پر مسلط کر دیا ہے۔

جیسے ہم کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہیں۔

بس ابھی آنکھ کھلے گی اور یہ خواب اپنی تمام تر نحوستوں سمیت ٹوٹ جائے گا، لیکن---!

آہ! یہ خواب جب ٹوٹا، تب اپنا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ سارے بھیانک مناظر ایک ایک کر کے سچ ہو چکے تھے۔

کسی منظر کو سچ ہونے سے پہلے موت نہ آئی۔ کوئی لمحہ اپنی اذیت ناکی کا ادراک کرائے بغیر ہم سے رخصت نہ ہو سکا۔



"میرے محترم بزرگ! بسا اوقات حقائق وہ نہیں ہوتے جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ آپ نے واقعی اپنے بیٹے کے لیے "دعا" کی تھی، خدا نے وہ قبول کر لی۔ میں کیپٹن شیرافگن، پاکستانی فوج کا ایک سپاہی خدا کو حاضر ناظر جان کر بیان کر رہا ہوں کہ آپ کا بیٹا کتے کی موت نہیں مرا--- شہید ہوا ہے۔"

میری آواز بھرا گئی۔ بمشکل میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا۔

"اس نے کسی مبارک ساعت میں ہدایت کی راہ اپنا لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اللہ نے آپ کی ریاضتیں قبول فرمالی ہیں۔"

میں کہتا رہا، اسے اس کے بیٹے کی کہانی سناتا رہا۔

بے چارہ مجبور، بیکس اور لاچار بوڑھا مسلمان ایک ٹک میرے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کی



آنکھوں سے خون بہہ کر اس کے گالوں پر پھیل رہا تھا۔ اس کی مقدس داڑھی اس میں بھیگنے لگی تھی۔ اس کا چہرہ مظلوم اور خون میں نہائے پوربو پاکستان کی تصویر بن چکا تھا۔ جو کہانی اس کے چہرے پر لکھی تھی، وہ مشرقی پاکستان کی کہانی تھی۔

"کہاں ہے میرا بچہ---؟" انہوں نے میری طرف دیکھ کر بڑے عزم سے دریافت کیا۔

میں جیپ کی طرف چل دیا۔

بوڑھے بنگالی نے جیپ کے پچھلے حصے میں سٹریچر پر دھری لاش پر ایک نظر ڈالی اور اپنے شہید بیٹے کی پیشانی کو چوم لیا۔

اس کی آنکھوں سے بہنے والے خون کا ذائقہ میرے لبوں پر آ گیا۔

دیوانہ وار وہ آنسو بہاتا، اپنے بچے کے ہاتھوں اور ماتھے کو چومتا رہا۔ پھر نجانے کیسے اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا--- اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

لیکن---!

وہ بین نہیں ڈال رہا تھا---!

وہ کسی سے فریاد نہیں کر رہا تھا---!

اپنی الم ناکیوں کا نوحہ نہیں الاپنے لگا تھا وہ---!

اس نے تو بنگالی زبان میں زور زور سے چلا کر اپنے بیٹے کی شہادت کا اعلان کیا تھا۔ وہ تو اپنے محلے کے لوگوں کو بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ اس کا بیٹا مکتی باہنی کا غدار نہیں بلکہ محب وطن مسلمان کی موت مرا ہے۔ اس نے پاکستان کے دشمنوں کے ہاتھوں شہادت کا جام پیا ہے۔

سب سے پہلے اس کے مکان کے دروازے سے واحد کی ماں اور بہنیں روتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں محلے کے کچھ بوڑھے اور نوجوان اکٹھے ہونے لگے۔

وہ باری باری واحد کا آخری دیدار کر رہے تھے۔

یہ سارا محلہ ہی پاکستان کے حمائتی لوگوں پر مشتمل تھا۔ اگر کوئی مکتی باہنی کے لوگ تھے بھی تو انہوں نے شاید میرے سامنے مصلحتاً منافقت اختیار کر لی تھی کیونکہ رات ہونے والی تباہی انہوں نے اپنے کانوں سنی اور آنکھوں دیکھ لی تھی اور کم از کم کچھ عرصے ہی کے لیے سہی، اب وہ سہم گئے تھے۔

لاش سٹریچر سمیت اٹھا کر واحد کا بوڑھا باپ اور اس کے ساتھی مکان کے اندر لے گئے۔

پھر نزدیکی مسجد کا تالا توڑ کر انہوں نے چارپائی نکالی اور سٹریچر سے لاش اس پر منتقل کر دی۔

میری موجودگی میں اس کے والد نے اپنے شہید بیٹے کا جنازہ پڑھوا دیا۔ شاید یہ اس بوڑھے بنگالی کی واحد نرینہ اولاد تھی۔۔۔۔!

اس نے شہید کو نہلانے یا کفن میں دفنانے سے بھی انکار کر دیا۔ دم رخصت اس کی سسکیاں بھرتی بہنوں نے اپنے دوپٹے بھائی کی لاش پر پھینک دیئے تھے۔

قبرستان نزدیک ہی واقع تھا۔ میں قبرستان تک ان کے ساتھ گیا۔۔۔۔ خدا جانے شہید کے جنازے میں شرکت کے لیے اتنے لوگ کہاں سے اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس روز جب انسانی لاشوں کو گڑھے میں دبایا جا رہا تھا' یا پھر ان پر مردار منڈلا رہے تھے۔

اس روز۔۔۔۔!

اس عظیم شہید کی لاش کو جو تکریم نصیب ہوئی' وہ اسی کا نصیبا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سارے ڈھاکہ کی زندگی اس چھوٹے سے محلے میں سمٹ آئی تھی۔ شہید کو سپرد خاک کرنے کے بعد میں بوجھل قدموں اور دکھی دل کے ساتھ یونیورسٹی کیمپس کی طرف جا رہا تھا۔ واپسی پر منظر جوں کا توں تھا۔

وہی ویرانی' اداسی' دھواں' آگ' شعلے اور خاموشی۔۔۔۔!

شہید کی ماں اور باپ نے اپنے بیٹے کی لاش اس طرح ذمہ داری کے ساتھ وہاں پہنچانے پر مجھے اتنی دعائیں دی تھیں جن کا شمار میں آج تک نہیں کر پایا۔

شاید اس معرکہ کرب و بلا سے میرا زندہ بچ نکلنا انہی دعاؤں کا مرہون منت رہا ہو۔

# قوم کی ماں

صبح دیر گئے میں اپنے آفس میں لوٹ آیا۔

ہماری رپورٹ ہیڈکوارٹر پہنچ چکی تھی اور "آپریشن" کی کامیابی پر گو کہ اطمینان کا اظہار کیا جا رہا تھا' لیکن بے گناہ انسانی جانوں کے ضیاع کا دکھ سب نے محسوس کیا۔ خصوصاً نوجوان افسر اس بات پر کف افسوس مل رہے تھے کہ انہیں بادل نخواستہ سویلین کے خلاف کارروائی میں حصہ لینا پڑا۔

میں اپنے کمرے میں دھری کرسی پر قریباً" بے جان سا لیٹا' رات کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ شہر میں کرفیو کا نفاذ ہو چکا تھا۔ نہ بھی ہوتا تو اتنی قتل و غارت کے بعد شاید کوئی بھی باہر آنے کی جرأت نہ کرتا۔

میرا اردلی اب تک دو مرتبہ میرے لیے چائے بنا کر واپس لے جا چکا تھا۔ وہ میرے سامنے چائے رکھ دیتا اور جب ٹھنڈی ہو جاتی تو اٹھا کر واپس لے جاتا۔ اسے اپنے "صاحب" کے ذہنی کرب کا احساس تو ضرور تھا' لیکن شاید وہ بھی میرے دکھ کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

کمرے میں بیٹھے ہوئے جب سوچ سے میری نسیں ٹوٹنے لگیں تو میں اٹھ کر باہر برآمدے میں آ گیا۔

برآمدے میں کھڑے ہو کر میں نے باہر سڑک پر نظر دوڑائی۔ دور دور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چاروں طرف موت جیسا گہرا سناٹا طاری تھا۔

مین گیٹ پر کھڑا گارڈ مجھے باہر دیکھ کر مزید چوکس ہو گیا تھا۔ برآمدے کے ایک کونے میں ہماری جیپ کھڑی تھی جس میں نصب وائرلیس پر میرے ایک ماتحت نے دوسری پٹرول کرنے والی سیکورٹی کی جیپوں سے رابطہ کر رکھا تھا۔ اچانک وہ اپنے کانوں سے ہیڈفون اتار کر میری طرف آیا۔

"سر آپ کے لیے میسج ہے۔" اس نے اپنی ایڑیاں بجا کر مجھے تعظیم گزارتے ہوئے

کہا۔

"او۔کے"

میں نے ہیڈفون کانوں پر چڑھا لیے۔ ڈھاکہ میں گشت کرنے والی ایک آرمی جیپ سے ایک لیفٹیننٹ مخاطب تھا۔

"سر! ہم نے یہاں ایک مشتبہ لڑکی کو گرفتار کیا ہے۔ لڑکی اپنا نام عظمیٰ بتاتی ہے۔ وہ یہاں ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کا اصرار ہے کہ سوائے آپ کے اور کسی سے بات نہیں کرے گی۔۔۔۔ خود کو آپ کا "سورس" بتاتی ہے۔"

"اسے احترام سے یہاں تک پہنچا دو۔ تمہارا بہت شکریہ۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔۔ ہیڈفون اتار کر میں دوبارہ برآمدے میں آن کھڑا ہوا۔

پریشان تو پہلے ہی تھا اب پریشانی مزید بڑھنے لگی۔ میں حیران تھا کہ عظمیٰ کو جس جگہ سے آرمی کے گشتی دستے نے گرفتار کیا تھا وہ اس کے گھر سے کم از کم سات آٹھ میل دور تھی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ یہاں کیا لینے گئی تھی؟ اگر اسے پناہ ہی درکار تھی تو وہ میرے آفس کا رخ کرتی' اسے علم تو تھا کہ میرا دفتر کہاں ہے؟

ابھی میں کسی فیصلے پر پہنچنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس مسئلے پر مزید سوچ بچار ملتوی کر کے برآمدے سے گیٹ کی طرف چل دیا۔ مجھے آتے دیکھ کر گارڈ نے دروازہ کھول دیا۔

باہر سڑک پر دور دور تک موت کا سا پر ہول سناٹا طاری تھا۔۔۔۔ ماحول پر سکتہ کی کیفیت طاری تھی' لیکن انٹیلی جنس میں رہنے اور حالات سے باخبر ہونے کی وجہ سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ جب یہ سکتہ ٹوٹے گا تو اس سے کون سی قیامت جنم لے گی۔ اس خاموشی کے نیچے منڈلاتے' چکراتے طوفان کی شدت کا اندازہ مجھ سے بہتر کون لگا سکتا تھا۔ میں ہی تھا جو جان سکتا تھا کہ جب یہ خاموش آتش فشاں پھٹے گا تو سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔

ایک پاکستانی ہونے کے ناطے مجھے احساس تھا کہ ان حالات میں یہ آپریشن ناگزیر تھا۔ فاسد مادہ الگ کیے بغیر' چیر پھاڑ کیے بغیر جسم کی سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

لیکن۔۔۔۔!

میں محسوس کر رہا تھا کہ نشتر ضرورت سے زیادہ ہی گہرا چلا گیا ہے۔ جانے عمل جراحت کی باریکیاں کیسے نظرانداز کر دی گئیں؟



جانے کیوں اس عمل جراحی کے تمام تقاضے مدنظر نہ رکھے گئے۔

کچھ بھی ہو۔

بہرحال۔۔۔۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اب ہمیں خود کو آنے والے کسی بڑے طوفان کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنے کے لیے بہرحال تیار رکھنا چاہیے۔



دور سڑک کے ایک موڑ سے ایک فوجی جیپ مجھے اس طرف آتی دکھائی دی۔ پھر اس کے سوار بھی نمایاں ہونے لگے۔ اگلی سیٹ پر مجھے عظمیٰ بیٹھی نظر آئی۔ اس لیفٹیننٹ نے عظمیٰ کو مکمل احترام دیا تھا۔ وہ جان گیا ہو گا کہ عظمیٰ پاکستان آرمی کے لیے قابل احترام کیوں ہے؟

جیپ میرے نزدیک روک کر لفٹین اتر کر باہر آیا۔ چہرہ شناسا دکھائی پڑتا تھا۔ اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے مجھے تعظیم گزاری اور عظمیٰ کو میرے سپرد کرنے کے بعد معمول کی کارروائی کر کے واپس چلے گئے۔

عظمیٰ اور میں اکٹھے ہی اپنے کمرے میں آئے تھے۔

کمرے میں پہنچتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات برسنے لگی۔ بالکل یوں جیسے وہ رونے کے لیے بے تاب ہو رہی ہو اور مجھے دیکھتے ہی اب اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

چاہتے ہوئے بھی میں نے اسے صبر کی تلقین کرنا مناسب نہ جانا۔

میں چاہتا تھا وہ اچھی طرح رو کر اپنا دل ہلکا کر لے۔ اس بات کا اندازہ تو میں کر ہی چکا تھا کہ ضرور اس پر بھی کوئی قیامت ٹوٹی ہے۔

اگر ایسا ہی تھا تو یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ آج نہیں تو کل! بہرحال اسے ایک بڑے روحانی گھاؤ سے گھائل ہونا ہی تھا۔ اس پر الم ٹوٹنا ہی تھا۔ شاید قدرت نے انسانوں کو بڑے دکھ اور بڑی خوشیاں دینے کے اوقات کار سے اس لیے مطلع نہیں کیا کہ وہ پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہو کر ان کی شدت کے احساس سے عاری نہ ہو جائیں۔

عجیب اسرار ہے ہستی کا۔۔۔۔!

عجیب بھید بھری خوشیاں' بھید بھرے دکھ ہیں جو انسانوں کا نصیبا بن جاتے ہیں۔ جلد ہی وہ نارمل ہو گئی۔

میں نے ابھی تک اس سے استفسار نہیں کیا تھا۔
کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔
لیکن عظمیٰ جانتی تھی، میں کیا جاننا چاہتا ہوں۔
اس نے سسکیاں لیتے ہوئے مجھے رات اپنے ساتھ گزرنے والے واقعات سے آگاہی پہنچائی۔

اس نے بتایا کہ اس کے والدین کو جانے کہاں سے رات نو بجے علم ہو گیا تھا کہ آرمی ایک بڑا آپریشن کرنے والی ہے۔ ان لوگوں نے گھر چھوڑ کر بھاگنے کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ "رات قریباً" ساڑھے نو بجے ایک وین ہمارے گھر آئی۔" عظمیٰ نے بتایا۔
"افراتفری میں جمع کردہ زیورات اور خاصی تعداد میں کرنسی سمیت میرے والدین نے اس میں راہ فرار اختیار کرنا تھی۔ وین میں پہلے ہی سے ایک عورت اور تین مرد موجود تھے۔ ان لوگوں کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھے اور میں نے اس بات کا اندازہ بھی کر لیا تھا کہ اگر ہم نے ان کے احکامات کی تعمیل نہ کی تو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ میں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ مجھے یہاں چھوڑ جائیں، مجھے پاکستانی فوجی کچھ نہیں کہیں گے---- لیکن والد نے سختی سے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔"
اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو قدرے نارمل کیا اور بولی---- "اس مرحلے پر اچانک میری ماں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے میرے والد سے کہا۔
"شمس الدین آج تک میں نے ایک بیوی ہونے کے ناطے تمہارے ہر جائز اور ناجائز حکم کی تعمیل کی، لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ معاملات وہ نہیں جو تم مجھے بتاتے آئے ہو۔ حالات کچھ اور ہیں---- بات کچھ اور ہے۔ تم نے آج تک مجھے یہی بتایا کہ ہم زیرِ زمین اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، لیکن مجھے آج علم ہو گیا ہے کہ دراصل تم ایک غیر ملکی طاقت کے، اس حکومت کے ایجنٹ ہو جو روزِ اول سے ہمارے وجود کو تسلیم ہی نہیں کر رہی۔ جس نے اپنی تمام توانائیاں ہمیں تباہ کرنے کے لیے مختص کر دی ہیں۔ تم غدار ہو شمس الدین، تم غدار ہو۔ خدا کی لعنت ہو تم پر---- خدا مجھے معاف کرے۔ نادانستگی میں مجھ سے جو گناہ سرزد ہو گیا ہے خدا مجھے معاف کرے، لیکن اب جب کہ تمام حالات کا مجھے علم ہو چکا ہے میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"
"پاگل ہو گئی ہو تم---- کیا بک رہی ہو؟ یہ پاکستانی فوج ہماری دشمن ہے۔ اگر تم یہاں رہ گئی تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ تمہاری بیٹی کی آبروریزی کریں گے۔"



میرے والد نے کہا۔
"تم بکتے ہو۔ بکواس کرتے ہو تم۔ میں جانتی ہوں تمہارے منہ میں اپنی زبان نہیں۔ تم نے اپنا ضمیر گروی رکھ دیا ہے غیروں کے پاس---- چند ٹکوں کے عوض---- تم بک چکے ہو شمس الدین---- تمہاری حیثیت فروخت ہو جانے والے جانور سے زیادہ نہیں رہی۔ تمہاری آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ گئی ہے۔ تم اندھے ہو گئے ہو شمس الدین۔ خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"
میری ماں اس لمحے ایک بدلی ہوئی عورت تھی۔
ایک مسلمان عورت تھی۔
قرونِ اولیٰ کی مجاہدہ!
ایسی مسلمان ماں جس کا یہ روپ دیکھنے کے لیے میں ترس رہی تھی۔ میرے باپ نے غصے سے کھولتے ہوئے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں اور دھمکیاں دینے لگا۔ وہ حواس باختہ اور پاگل نظر آ رہا تھا۔ اس نے میری ماں کو بازو سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ کمزور عورت دیوار سے ٹکرا گئی۔ اس کا سر اتنی زور سے دیوار سے ٹکرایا کہ اس سے خون بہنے لگا----!!
میری ماں کتنی بہادر، کتنی عظیم عورت ہے۔ مجھے اس کا احساس تھا نہ علم۔ اس روز میں نے اس موم کی عورت کو فولاد بنتے دیکھا۔
اس نے کہا۔ "شمس الدین اگر مرنا ہی مقدر ہے تو بھی میں اپنے مسلمان بیٹے یا بھائی کی گولی سے مرنا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی، لیکن ان ہندو بھیڑیوں کو اپنا خون پینے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔ تم مجھے جان سے مار ڈالو، لیکن میں اس گھر سے قدم باہر نہیں نکالوں گی نہ ہی کوئی میرے جیتے جی میری بیٹی کو یہاں سے لے جا سکتا ہے۔"
میری بہادر ماں میرے اور ان کے درمیان دیوار بن گئی۔
میرے والد نے طیش میں آ کر بندوق سیدھی کر لی اور میری ماں سے کہا وہ اسے گولی مار دے گا۔
"یہ کام ہم کریں گے شمس الدین۔ یہ تمہارا کام نہیں۔" آنے والوں میں سے ایک نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پستول سیدھا کر لیا۔
"اے بڑھیا۔ چپ چاپ چلتی ہے یا........" اس درندے نے جس کی شکل پر لعنت برس رہی تھی، میری ماں سے کہا۔
"ہرگز نہیں۔" میری ماں نے میرے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"مار دو اسے۔ وقت ضائع نہ کرو۔ ختم کرو۔" میرے غدار باپ نے اس سے کہا۔

"شمس الدین میں موت سے نہیں ڈرتی' لیکن مرتے ہوئے بھی مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ تم کبھی انہی لوگوں کے ہاتھوں کتے کی موت مارے جاؤ گے جن کے لیے تم نے اپنے دین' اپنے وطن اور اپنے آپ سے رشتہ توڑ لیا۔"

"تقریر بہت کرتی ہے----!" اس شخص نے میری ماں کو گالی دی اور پستول لے کر اس کے نزدیک آگیا۔

"چلتی ہے یا----؟" اس نے میری ماں کی کنپٹی پر پستول کی نالی رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری حفاظت نہ کر سکی۔ اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ بیٹی! مر جانا لیکن اپنے باپ کے احکامات کی تعمیل نہ کرنا۔" اس نے بجائے اس بھیڑیے کو جواب دینے کے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی کہ اس درندے نے میری ماں کی کنپٹی پر گولی چلا دی۔ عظیم عورت گر پڑی.........

عظمیٰ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

خود میرا دل بھر آیا تھا۔

نجانے کسی کمزور لمحے پر دو آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہنے لگے تھے۔ آنسوؤں کی نمی نے مجھے احساس دلایا کہ میں بزدلی کا مظاہرہ نہ کروں۔ میں نے اپنی قمیص کی آستین سے آنسو صاف کیے اور عظمیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے صبر کی تلقین کی۔

"مجھے معلوم نہیں میری شہید ماں نے آخری لمحے کیا کہا ہو گا؟"

کسے یاد کیا ہو گا؟

کیا باتیں کی ہوں گی؟

وہ وحشی مجھے گھسیٹتے ہوئے وین تک لے گئے۔

اپنے آنسو پونچھ کر اس نے خود کو قدرے نارمل کیا۔

"وین کو ایک دو مرتبہ حادثہ پیش آتے آتے رہ گیا۔ ایک جگہ ہم لوگ گھیرے میں آ گئے۔ کسی طرف سے آرمی کا ٹرک آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے وین کو رکنے کا اشارہ کیا تو وین والوں نے مقابلہ شروع کر دیا----!

قدرت نے شاید ابھی اور کوئی دکھ دیکھنے کے لیے زندہ رکھنا تھا۔ میں اس افراتفری میں ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ رات کے اندھیرے نے مدد کی ورنہ انہوں نے تو مجھے مار ڈالنے



میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"ساری رات میں اس ٹوٹی ہوئی عمارت میں چھپی اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہی۔"

اس نے اپنی داستان ختم کی۔

اس کے بعد کے واقعات کا علم مجھے لفٹین کی زبانی ہو گیا تھا۔

☆○☆

عظمیٰ کی ماں کا اصلی روپ دراصل یہی تھا۔

یہی ہے ہر مسلمان کا اصلی روپ

وقت نے' حالات نے' منافقت نے جتنے خول اس کی شخصیت پر چڑھا دیئے تھے۔ کسی ایک شوریدہ سر لمحے نے وہ سارے خول اتار کر پھینک دیئے۔

شاید یہی ہوتا ہے نجات پانے کا لمحہ----!

عظمیٰ کا ان حالات میں اپنی جان اور عزت سمیت زندہ بچ کر نکل جانا اگر معجزہ تھا تو اس معجزے کا سبب بھی یقیناً اس کی ماں کی دعائیں تھیں۔ میرے لاکھ صبر کی تلقین کے باوجود اس کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔

کوئی حادثہ سا حادثہ گزرا تھا اس دھان پان سی لڑکی پر۔

کوئی قیامت سی قیامت ٹوٹی تھی اس پر۔

میں اسے پرسہ دے رہا تھا' لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سب بیکار ہے۔ اس کا تو سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اسے تو روتے روتے مر جانا چاہیے تھا---- دنیا کے تمام دکھوں سے نجات پا لینا چاہیے تھا۔

لیکن----!

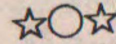
یہ بڑی ظالمانہ سوچ تھی۔ یہ تو بیمار گھوڑے کا علاج بندوق کی گولی سے کرنے والی بات تھی۔ لاشعوری طور پر اس نے مجھے اپنا سہارا بنا لیا تھا۔

کتنی کمزور ڈھال اپنے سامنے تان لی تھی اس نے----!

میری بھلا حیثیت ہی کیا تھی۔ حالات کی' حادثات کی زوردار کاٹ کا مقابلہ میں کیا کر سکتا تھا' کیسے کر سکتا تھا؟

میں تو خود ایک ناتواں' کمزور درخت کی طرح ہوا کے تھپیڑوں کا عذاب سہہ رہا تھا۔ بس یہی تھا کہ میری جڑیں مضبوط تھیں' لیکن جانتا تھا کہ زوردار آندھیاں تناور درختوں کے تنے

توڑ ڈالتی ہیں۔ زمین میں جڑیں کون تلاش کرتا پھرے۔ جانے پھر کب یہ جڑیں اپنا سر باہر نکالیں اور پودا زمین سے باہر آئے۔



ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ اپنے ہی ملک کی ایک مسلمان لڑکی کو سہارا دوں' بھلے میں کتنا ہی کمزور سہی۔

میں نے عظمٰی کو حوصلہ دیا' اسے چپ کروایا۔ اس کے کندھے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے کہا کہ وہ خود کو اکیلا محسوس نہ کرے۔ ساری پاکستانی قوم اس کا کنبہ ہے۔ میں نے اسے حوصلہ دیا' عزم دیا۔ اس کے جذبہ حریت کو جذبہ حب الوطنی کو سلام کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں آرمی کی جیپ میں اس کے گھر کی طرف جا رہے تھے جہاں اس کی شہید ماں اپنی بیٹی کی منتظر تھی۔

سارا محلہ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

سورج کی روشنی نے رات کی سیاہی کو ننگا کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کبھی کبھی سڑکوں کے بیچوں بیچ کوئی بے گوروکفن لاش پڑی دکھائی دے جاتی تھی۔

فضاء بارود کی بو اور گناہوں کے بوجھ سے بوجھل اور ماحول چھلنی ہو رہا تھا۔ یاس کی ایک لہر من ساگر سے اٹھتی اور مجھے دور تک بہا کر لے جاتی---- دوسری لہر پٹخنی دیتی اور مجھے حقائق کے تپتے ریگ زاروں پر لا کر پھینک دیتی۔

ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں عظمٰی کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہم ان کے برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

میری نظروں کے عین سامنے بڑے صوفے پر اس کی ماں ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اگر میں نے عظمٰی سے اس کی شہادت کی کہانی نہ سن لی ہوتی تو میں اسے زندہ ہی سمجھتا----!

مجھے یاد آگیا کہ عظمٰی کی ماں اکثر اسی جگہ بیٹھا کرتی تھی۔

خون اس کی کنپٹی سے بازو پر پھیلتا اس کی سوتی ساڑھی کے دامن کو بھگوتا ہوا صوفے اور زمین پر بچھے قالین میں جذب ہو رہا تھا۔

سر کے دائیں طرف جہاں گولی لگی تھی ایک سیاہی مائل سرخ دائرہ بن چکا تھا۔ جس پر سکون انداز میں اس کی ماں صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھی تھی' اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ



فرشتہ اجل نے بڑی عقیدت سے' بڑے احترام سے اس کی جان لی ہے۔ میں نے آگے بڑھ اس کی کھلی آنکھوں کو بند کر دیا اور صوفے پر لٹا دیا۔ اس حالت میں لاش اکڑ جانے کا خطرہ بہرحال موجود تھا۔

عظمٰی کے صبر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

میں راستے میں اسے سمجھاتا آیا تھا کہ حوصلے سے' ہمت سے حالات کا سامنا کرنا۔

لیکن----!

یہاں آ کر میرا اپنا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا۔ کوئی بے نام سی کسک نیزے کی انی کی طرح میرے کلیجے میں اترنے لگی تھی۔ مجھے اپنا آپ ٹوٹتا اور پھر ٹوٹ کر بکھرتا محسوس ہوا' لیکن جلد ہی میں نے خود پر قابو پالیا۔

میں نے سسکیاں لیتی عظمٰی کے قریب بیٹھ کر پھر یقین دلایا۔

"عظمٰی تم خود کو اکیلی نہ سمجھنا۔ سارے پاکستان کی فوج تمہاری ماں ایسی ماؤں کی حفاظت کرے گی۔ میں پاکستانی فوج کا ایک نمائندہ تم سے عہد کرتا ہوں کہ میں تمہاری ماں کے قاتلوں کو چین کی نیند نہیں سونے دوں گا---- انہیں پاتال سے نکال کر کیفرکردار تک پہنچاؤں گا۔ ان کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملے گی عظمٰی۔ اس دنیا میں' اس سرزمین پر۔"

اور----!

بے چاری دھان پان سی----!

کمزور سی----!

بے بس سی----!!

بنگالی لڑکی نے جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سرخی مائل ڈورے تیر رہے تھے۔ جس کے سانولے رنگ میں زندگی اپنے پورے جوبن کے ساتھ زندہ تھی۔ جس کے کپکپاتے ہونٹ' لرزتا بدن شقی القلب کو بھی رلا دینے کی' مار ڈالنے کی سکت رکھتا تھا۔

اس کمزور سی' بے بس سی بنگالی لڑکی نے میری بات پر یقین کر لیا۔

اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

میرے بضد ہونے پر اس نے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے بھی ڈال لیے۔ میں نے اس کے گھر سے بستر کی ایک چادر اس کی ماں کی لاش پر ڈال کر اسے ڈھانپ دیا تھا۔

یہ لڑکی اب میری حفاظت میں تھی۔

اس نے مجھ سے امان طلب کی تھی۔

ایک مسلمان ہونے کے ناطے اس کی پناہ اور حفاظت میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑی تھی۔ میں نے اپنی جیپ میں نصب وائرلیس کے ذریعے میڈیکل کور کے کچھ لوگوں کو وہاں طلب کر لیا۔۔۔!

محلے کی کچھ عورتیں عظمٰی کے بلانے پر وہاں آ گئیں۔

خدا جانے وہ غدار کہاں تھے؟ وہ مکتی باہنی کے خونخوار بھیڑیے کون تھے؟ مجھے تو یہاں آنے والی ہر عورت کے چہرے پر ایک ہی سوال دکھائی دے رہا تھا کہ آخر انہیں کس جرم کی سزا دی گئی ہے؟

انہیں اپنے اور بیگانوں کے دوہرے عذاب کا سامنا تھا۔ غدار اندر سے اور اپنے باہر سے ان پر حملہ آور ہو رہے تھے۔

عورتیں عظمٰی کو دلاسہ دینے لگیں۔ اس محلے میں اس کی والدہ کی کچھ شاگرد بھی رہتی تھیں، وہ بھی چلی آئیں۔

مجھے آج دوسرے جنازے کا اہتمام کرنا تھا۔

میں سوچ رہا تھا واحد اور عظمٰی کی ماں تو خوش قسمت ہیں۔ ان کے تو جنازے اٹھے۔ انہیں دفن ہونے کو زمین تو نصیب ہوئی۔ یہاں تو جانے کتنی بے گور و کفن لاشیں پڑی تھیں۔ کون جانے ان میں کتنے محب وطن تھے، کتنے غدار۔

دوپہر تک انہوں نے مرحومہ کو نہلا کر کفن میں لپیٹ دیا۔ بمشکل سارے محلے سے تین چار مرد ہی میسر آئے تھے، باقی خوفزدہ ہو کر دبکے رہے۔ کوئی جنازے کے لیے بھی آنے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے میڈیکل کور کے کچھ لوگوں کی مدد سے جنازہ اٹھایا۔ قبرستان کچھ دور نہیں تھا۔ عظمٰی کو یہیں چھوڑ کر ہم اسے دفنانے چلے گئے۔ اس کے لیے قبر بھی ہم نے خود تیار کی تھی۔

میں نے اس عورت سے جنم نہیں لیا تھا، لیکن یہ عورت میری ماں تھی۔ میرے ساری قوم کی ماں تھی۔ اس لمحے مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنی ماں کے جسد خاکی پر مٹی ڈال رہا ہوں۔

واپسی پر میں عظمٰی کے گھر ہی چلا آیا۔۔۔!

مجھے بہت کچھ سوچنا اور بہت جلد کسی فیصلے پر پہنچنا تھا۔

حالات نے عجیب چوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا مجھے! جہاں سے فرار کی کوئی راہ



جاتی تھی۔



یہاں ڈھاکہ میں میری صرف ایک پنجابی فیملی سے آشنائی تھی۔ اس کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ وہ لوگ میرے نزدیکی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس فیملی کا سربراہ معظم تھا۔ ہماری عمروں میں دس بارہ سال کا تفاوت رہا ہو گا، لیکن اپنے علاقے کی روایت کے مطابق ہم جلدی آپس میں بے تکلف ہو گئے۔

معظم کے تین بچے یہاں زیر تعلیم تھے اور وہ پولیس میں ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز تھا۔ میرے دفتر کے نزدیک ہی چند مغربی پاکستان کے سرکاری ملازمین رہائش پذیر تھے اور یہیں معظم بھی رہتا تھا۔

میرے دماغ میں آیا کہ اس موقعے پر صرف وہی میرے کام آ سکتا ہے کیونکہ حالات ایسے تھے کہ کسی بھی لمحے میری کہیں بھی پوسٹنگ ہو سکتی تھی پھر سپیشل سروسز گروپ سے میرا تعلق ہونے کے ناطے مجھے کوئی بھی اہم ڈیوٹی کسی بھی علاقے میں سونپی جا سکتی تھی۔

معظم سے میں نے عظمٰی کا تذکرہ تو کیا تھا، لیکن اس کی "خدمات" کا ذکر کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ پولیس آفیسر بعد میں تھا پہلے میرا گرائیں۔ یہ کیسے ممکن تھا میری بات نہ سمجھتا۔ متعدد مرتبہ اس نے عظمٰی کے والدین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، لیکن میں "سیکورٹی" کے نقطہ نظر سے اسے ٹالتا آیا۔۔۔ لیکن اب میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

اب تو سارا کھیل ہی ختم ہونے جا رہا تھا۔

میں نے عظمٰی سے تھوڑی دیر تک لوٹ آنے کا کہا اور سیدھا معظم کے گھر کی طرف چل دیا۔

بے چارہ رات کا تھکا ماندہ صبح دیر گئے آ کر سویا تھا، لیکن مجھے وہاں دیکھتے ہی بھابی نے اسے بیدار کر دیا۔

آنکھیں ملتا معظم جب بیٹھک میں آیا تو مجھے وردی میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"خیریت۔۔۔ کیا اب ادھر چڑھائی کا ارادہ ہے؟" اس نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے لطیف پیرائے میں رات کے واقعات کے متعلق طنز کیا۔

"ہاں معظم۔۔۔!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"معظم! آج تمہارے پاس بڑی امید لے کر آیا ہوں۔ بس یوں جانو کہ حالات نے مجھے جس امتحان میں ڈال دیا ہے، اس سے سرخروئی تب ہی ممکن ہے جب تم میرا ساتھ دو گے۔"

"یار کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ بات کرو۔ تم جانتے ہو ہماری طرف محبت غیر مشروط ہوتی ہے اور یہ بھی جان کر آئے ہو کہ میں کسی بھی معاملے میں انکار نہیں کروں گا۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں جانتا ہوں۔ اپنی مٹی کی پہچان ہے مجھے--- جس مٹی نے تمہیں اور مجھے حوالہ دیا ہے اس کی روایات سے بھی آگاہ ہوں۔"

میں نے معظم کو ساری کہانی سنا دی۔ اس کی بیوی کو میری خواہش پر معظم نے وہیں بلا لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جیسے جیسے میں عظمیٰ کی کہانی سنا رہا تھا، ان کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ یہ سیدھے سادھے لوگ تھے--- جو دلوں میں تھا وہی چہروں پر---!

اور---!

ان کے چہروں سے میں نے یہ تحریر بخوبی پڑھ لی تھی کہ وہ دل ہی دل میں ایسی عظیم لڑکی کو خراج گزار رہے ہیں۔

"تم مطمئن رہو شیر افگن۔ وہ صرف تمہاری ہی نہیں میرے ملک کی امانت ہے۔ میں اپنی بیٹی اور بہن کی طرح زندگی کے آخری لمحات تک اس کی حفاظت کروں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔ دعا کرنا خدا مجھے وعدہ پورا کرنے کی توفیق دے۔" میری بات کے خاتمے پر اس نے مضبوط ارادے سے کہا۔

ہمیں اس کے پاس چلنا چاہیے۔" معظم کی بیوی نے کہا۔

ان کے بچوں کو نانی مغربی پاکستان لے گئی تھی۔ گو کہ اس نے چند روز کا بہانہ کیا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ جب تک حالات صحیح نہ ہوں، بچے کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

شام کی آمد آمد تھی جب میں معظم اور اس کی بیوی کے ساتھ عظمیٰ کے گھر پہنچا۔

عظمیٰ سے میں نے معظم کا ذکر کر رکھا تھا، اس لیے تعارف میں کوئی تفصیل نہیں بتانی پڑی۔ معظم کی بیوی نے اسے اپنے سینے سے لگا کر تسلی دی تھی اور اس بات کا یقین دلایا تھا کہ وہ اسے کبھی تنہا نہیں رہنے دیں گے۔

شام ڈھلے تک میں وہیں رکا رہا، پھر بھابی نے مجھے اور معظم کو واپس بھیج دیا۔ وہ عظمیٰ



کے ساتھ اس کے گھر ہی میں رہ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ ابھی عظمیٰ کو اس گھر سے الگ کرنا ٹھیک نہیں۔

ہم نے ارادہ یہی کیا تھا کہ اس گھر کو تالا لگا دیا جائے اور عظمیٰ کو یہ لوگ اپنے ساتھ لے آئیں۔ جب حالات بہتر ہو جائیں تو ہم یہاں مقیم ہو جائیں گے۔ فی الوقت کسی پنجابی کا اس علاقے میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

لیکن---!

وہ عظیم لوگ میرے لیے--- عظمیٰ کے لیے--- پاکستان کی ایک بیٹی کے لیے اپنی جان سے بھی گزرنے کو تیار تھے۔

میں نے احتیاطاً" یہاں پٹرول کرنے والی آرمی کی ٹیم کو اس گھر کی نشاندہی کر دی تھی۔ یوں بھی یہ ہمارا فرض تھا کہ زندگی کے آخری لمحات تک ہم عظمیٰ کی ہر ممکن حفاظت کریں۔

لوٹتے ہوئے میں مطمئن تھا کہ اب عظمیٰ محفوظ ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔

# بدر کی تاریخ

رات گئے تک ڈھاکہ بظاہر پرسکون رہا----!

کسی طرف سے کسی خاص واقعے کی اطلاع نہ ملی---- لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے کتنے قہرناک طوفان گردش کر رہے ہیں۔

انٹیلی جنس ڈیوٹی کرنے کے ناطے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ جب یہ ہولناک اندیشے جو میرے ذہن میں سانپوں کی طرح کلبلا رہے ہیں---- اچانک سر اٹھائیں گے تو منہ پھاڑ کر شاید ہماری سلامتی ہی کو نہ نگل جائیں۔ میں اس وقت کے تصور ہی سے لرزاں تھا۔

وہ برا وقت جو جلد آنے والا تھا----!

لیکن انسان کتنا خوش فہم واقع ہوا ہے۔

مجھے تب بھی یہی امید تھی کہ ہم حالات پر قابو پالیں گے۔

یہ تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ہم بیچ میں سے ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔

اگر دور دور تک بھی میرے وہم و گمان میں یہ بات ہوتی تو میں عظمیٰ کو یہاں رکنے کے بجائے پاکستان اپنے گھر بھیج دیتا۔

میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اسے اچانک اپنے درمیان پا کر میری کو ماں کو کتنی خوشی ہو گی۔ جس خواہش کو دل میں لیے وہ تیزی سے زندگی کی شاہراہیں پھلانگ رہی تھی، اس کی تکمیل پر وہ پھولے نہ سماتی۔

اس نے تو اتنی مرتبہ مجھ سے شادی کر لینے کی آرزو کی تھی کہ اب بیچاری نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا---- لیکن حسن آراء کی شادی کے بعد سے اس نے جو بھی خط لکھا، اس میں یہی کہا کہ اب وہ میری کوئی بات نہیں سنے گی اور جیسے ہی میں سرخرو ہو کر لوٹا، وہ میری شادی کر دے گی۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس مرتبہ اسے خط میں لکھ دوں گا کہ وہ اب اس فکر سے بے نیاز ہو جائے اور اس کے بیٹے نے اس کی خواہش پوری کر دی ہے۔

اور یہی ہوا۔۔۔۔!

میں نے اگلے روز ہی اپنی والدہ کو ایک طویل خط لکھا جس میں عظمیٰ کی ساری کہانی لکھ کر اس سے اجازت طلب کی تھی اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ میں اس کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کروں گا اور اگر اس نے اجازت دے بھی دی تو اس کے پاس گاؤں میں آ کر اس کی خواہشات کے عین مطابق شادی کروں گا۔

میں جانتا تھا اسے مجھے دولہا بنے دیکھنے کی آرزو کتنی شدت سے تھی۔

شاید قدرت نے اس کی دعاؤں کی لاج رکھتے ہوئے ہی عظمیٰ کی اور میری ملاقات کروائی تھی۔

میں نے آپ سے کہا ناں کہ انسان بہت خوش فہم واقع ہوا ہے اور یہ امر واقعہ ہے۔

ہم بہت مستعد ہو گئے تھے اور بہت مصروف بھی۔

کبھی خوش قسمتی سے چوبیس گھنٹوں میں تین چار گھنٹے بھی آنکھ لگانے کو مل جاتے تو ہم اسے اپنی خوش بختی سمجھتے۔ شہر کا انتظام اب عملاً فوج کے کنٹرول میں تھا۔ صرف مغربی پاکستان سے آنے والی پولیس اور مقامی رضاکار ہی ہمارے ساتھ تھے ورنہ تو یہاں ہمارے لیے صرف نفرت تھی اور انتقام تھا۔۔۔۔!

اس دوران باقاعدگی سے میں عظمیٰ سے ملتا رہا۔

عظمیٰ کا بھابی سے کافی دل لگ گیا تھا۔ وہ لوگ اب میرے نزدیک معظم کے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔ بھابی نے اسے ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر لیا تھا اور اسے کہا تھا کہ حالات سدھرتے ہی وہ لوگ یہاں فیل گنج میں آ جائیں گے۔ عظمیٰ کے گھر کو تالا لگا دیا گیا تھا۔



کچھ دنوں بعد مجھے ایک اہم مشن کے لیے طلب کر لیا گیا۔

اپریل کے آخر تک مشرقی پاکستان کے سرحدی علاقوں میں دشمن کی کھلم کھلا مداخلت اپنے نقطہ عروج کو چھونے لگی تھی۔ ہم نے متعدد بھارتی فوجی، سپاہی اور افسران گرفتار کیے تھے۔ انہیں انٹرنیشنل پریس کے سامنے پیش کیا تھا۔

لیکن۔۔۔۔!

ہماری بدقسمتی تھی یا بھارتی سفارت کاروں کا کمال کہ بین الاقوامی پریس نے ہمارے



خلاف یکطرفہ کارروائی جاری رکھی۔ انہیں معمولی واقعات میں پاکستانی افواج کا "بے تحاشہ ظلم و ستم" تو نظر آ جاتا۔۔۔۔ لیکن بین الاقوامی اصولوں کی اس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی اور جارحیت دکھائی نہ دیتی۔۔۔۔! شاید ساری دنیا کے پریس نے مل کر ہمارے خلاف ایکا کر لیا تھا اور دنیا کو تصویر کا ایک ہی رخ دکھایا جا رہا تھا۔

دشمن کا توپ خانہ پاکستانی سرحد کے اندر دور تک گولہ باری کرتا رہتا اور اس گولہ باری کی آڑ میں تربیت یافتہ بھارتی اور بنگالی تخریب کار پاکستانی سرحدوں کا تقدس پامال کرتے تھے۔

ان دنوں دراصل بھارتی فوج کی کوشش یہی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو تخریب کاروں کو مشرقی پاکستان کی سرحد کے اندر چند میل کے علاقے پر دسترس حاصل ہو جائے تاکہ یہ لوگ یہاں بنگلہ دیش کی حکومت قائم کر کے اپنی مرضی سے کھل کھیل سکیں۔

لیکن۔۔۔۔!

سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستانی افواج اس کوشش کی راہ میں رکاوٹ بنی رہیں۔

اس گھناؤنے مقصد کے لیے بھارتی فوج عموماً" ان علاقوں کا انتخاب کرتی جو تکون کی شکل میں بھارتی سرحد کے اندر تک چلے گئے ہوں۔

بھارت کے ساتھ مشرقی پاکستان کی سرحد کوئی لمبی اور سیدھی پٹی نہیں بلکہ کٹی پھٹی، کہیں سے بہت پیچھے ہٹی اور کہیں سے بہت آگے کو نکلی ہوئی ہے۔

کومیلا کا علاقہ خصوصاً" اس نوعیت کا ہے۔ دشمن نے اپریل ۷۱ء کے پہلے ہفتے میں ایک روز اچانک زبردست گولہ باری شروع کر دی اور "فینی" نامی علاقہ جو ایک تکون کی شکل میں بھارتی سرحد کے اندر پھیلتا چلا گیا تھا، قریباً" پندرہ میل کی پٹی پر قبضہ کر لیا۔

پاکستانی جوان ذہنی طور پر دشمن کے اس اچانک اور توپخانے کے بھرپور حملے کے لیے تیار بھی نہیں تھے نہ ہی یہ امید کی جا رہی تھی کہ دشمن ایسی اوچھی حرکت بھی کر سکتا ہے۔

فینی کی پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ یہ علاقہ پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہاں قابض ہوتے ہی دشمن نے ان پہاڑیوں پر زبردست مورچہ بندی کر لی اور تمام اہم پوزیشنوں میں مورچے سنبھال لیے۔

اگلے روز پاکستانی فوج کی دو بٹالین نے اس علاقے کو واپس لینے کے لیے دشمن پر حملہ کر دیا، لیکن محفوظ اونچی پناہ گاہوں میں ہونے کی وجہ سے وہ لوگ دشمن کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے۔ ابتدا ہی میں کچھ جوانوں کی شہادت کا نقصان اٹھانے کے بعد انہوں نے پسپائی اختیار کر لی۔



۱۳ اپریل کی صبح مجھے میرے کمانڈنگ آفیسر نے معمول سے ہٹ کر بڑے خوشگوار موڈ میں طلب کیا۔ فون پر صرف اتنا کہا۔

"شیر افگن آؤ ذرا کاکس بازار کی سیر کر آئیں۔"

میرے او سی بہت سنجیدہ قسم کے آفیسر تھے اور عموماً" ریزرو ہی رہا کرتے تھے، لیکن آج ان کا موڈ خلاف معمول بڑا خوشگوار دکھائی دے رہا تھا۔

"او-کے سر!" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں نزدیکی ہیلی پیڈ پر پہنچ گیا جہاں مجھے طلب کیا گیا تھا۔ یہاں پہلے ہی سے ایک ہیلی کاپٹر تیار کھڑا تھا جسے ملک کے ایک مایہ ناز پائیلٹ جو بعد میں اپنے عظیم کارنامے یعنی اپنی یونٹ کے ساتھ فرار ہو کر اپنے ہوائی بیڑے سمیت برما پہنچے تھے، اڑا رہے تھے۔ جنرل صاحب نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور ہم لوگ ڈھاکہ سے ٹیک آف کر گئے۔ ہم نے چٹاگانگ ری فیول کرنا تھا۔

ہیلی کاپٹر نے چٹاگانگ لینڈ کیا۔ یہاں پہنچ کر جنرل صاحب کے علم میں مقامی ایریا کمانڈر کے ذریعے یہ بات آئی کہ کومیلا کے سرحدی علاقے "فینی" پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے---- صورت حال بڑی تشویشناک تھی۔

دونوں کمانڈر وہیں ایک کونے میں کھڑے ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ اس سے کس طرح عہدہ برا ہوا جائے۔ "فینی" پر قبضے سے نہ صرف دشمن کے ہاتھ ایک مضبوط مورچہ آگیا تھا بلکہ یہاں بیٹھ کر وہ ہمیں دور تک مار کر سکتا تھا اور اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا۔

ہم دونوں کرنل لیاقت اور میں کمرے سے باہر بیٹھے رہے اور دو گھنٹے تک دونوں آفیسر مشورہ کرتے رہے، جب کہ میں اندر ہونے والی صورت حال سے بے خبر باہر جنرل کا منتظر تھا۔

قریباً" ڈیڑھ دو گھنٹے کی میٹنگ کے بعد جنرل صاحب نے مجھے اور کرنل کو بلایا اور ہمیں کہا کہ فینی کو دشمن سے واپس لینے کے لیے ایک منصوبہ طے پایا ہے جو کچھ اس طرح تھا۔ پلان یہ تھا کہ ہم لوگ دو ہیلی کاپٹروں میں رات کے اندھیرے میں کمانڈوز کو لے جائیں اور دشمن کے سر پر لینڈ کریں۔ ہیلی کاپٹر واپس لوٹ آئیں۔ باقی کام کمانڈوز نے کرنا تھا۔



یہاں میں آپ کو ضروری بات بتاتا چلوں کہ جس علاقے میں ہم نے کوئی بھی ایکشن کرنا ہوتا ہے خواہ وہ مشکل ہو یا آسان ضروری ہوتا ہے کہ ہمیں اس کی مکمل معلومات حاصل ہوں۔ جب کہ صورت حال یہ تھی کہ وہاں کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ دشمن کہاں کہاں قابض ہے۔ خصوصاً" ایوی ایشن والوں کی معلومات تو اس علاقے کے متعلق صفر تھیں۔

یہ آپریشن ہم نے رات کے اندھیرے میں کرنا تھا اور اپنی تمام لائٹس آف رکھنی تھیں اور علاقے کے متعلق تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ پہاڑی علاقہ تھا۔ جگہ جگہ ندی نالے اور گہرے کھڈ اس سے سوا تھے۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ جہاں ہم نے لینڈ کرنا ہے وہ زمین کیسی ہو گی۔ ایوی ایشن کے مقامی کرنل نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ منصوبہ ناممکن العمل ہے۔ جنرل صاحب نے پائیلٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"لیاقت Can You Do it?"

کرنل لیاقت نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے کہہ دیا---- "جناب میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔"



وہاں موجود سبھی افسران حیران رہ گئے کہ اس نے کیسے ہاں کر دی ہے کیونکہ کوئی بھی سمجھ دار افسران حالات میں ایسی نازک ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مجھے بعد میں کرنل صاحب نے بتایا۔

"میں نے صرف ایک بات سوچی تھی کہ اگر دشمن سے ہم یہ علاقہ واپس نہ لے سکے تو اسے خوامخواہ برتری کا احساس ہو گا اور میرے لیے پاک فوج کا ایک کرنل ہونے کے ناطے یہ سوچ ہی بڑی اندوہناک تھی کہ میرے جیتے جی دشمن ہمیں بزدلی کا طعنہ دے۔"

ہمارے جنرل صاحب وہیں رک گئے اور ہم نے اس آپریشن میں حصہ لینے کے لیے کمانڈوز کو وہاں جمع کرنا شروع کر دیا۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ یہ پلان اتنا اچانک تھا کہ ہمیں کمانڈوز بھی چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے سے لے کر آنے پڑے، کیونکہ پاکستان آرمی کے سپیشل سروس گروپ کو چٹاگانگ کی پہاڑیوں میں ڈیپلائے کیا گیا تھا۔

یہاں ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا کہ اگر ہم نے کمانڈوز کو اس علاقے سے نکال لیا تو محاذ خالی ہو جائے گا جب کہ خانہ پری کے لیے ہمارے پاس ایک بھی فالتو سپاہی نہیں تھا۔ پاک فوج کا ایک ایک جوان اپنی جگہ اہم ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس مسئلے کا حل ہم نے یہ نکالا کہ

کمانڈوز کی جگہ میزو قبائل کو یہاں بٹھا دیا۔ میزو قبائل پاکستان کے زبردست وفادار تھے اور پیدائشی فوجی ہوتے ہیں۔

شام گئے تک ہیلی کاپٹر پر مختلف مقامات سے کمانڈوز کو لا کر اس جگہ اکٹھا کرتے رہے۔ ہم نے اپنے آپریشن کا آغاز رات آٹھ بجے کرنا تھا۔ جو کمانڈوز اس مشن میں حصہ لے رہے تھے' ان کا تعلق تھرڈ کمانڈو بٹالین سے تھا۔ ہمارے ساتھ دوسرے ہیلی کاپٹر پر میجر پیٹرک تھے۔

جب میجر پیٹرک کو صورت حال کا علم ہوا تو اس نے حیرانگی سے کرنل لیاقت سے پوچھا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "پٹ تم اپنے کرائسٹ کو یاد کرو۔ میں اپنے اللہ کو یاد کرتا ہوں۔ یہ آپریشن تو بہرحال ہم نے کرنا ہے خواہ جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

آپ اندازہ نہیں لگا سکتے اس وقت ہمارے جذبات کا کیا عالم تھا۔ اس بات نے میجر پیٹرک کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے بڑے عزم سے کہا کہ ہم انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

دونوں ہیلی کاپٹروں میں کمانڈوز سوار کر لیے گئے۔ جنرل اس آپریشن کی براہ راست نگرانی کر رہے تھے اور اس جگہ موجود تھے جہاں سے ہم اڑنے والے تھے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ جنرل صاحب عموماً" ریزرو رہتے تھے' لیکن اس روز وہ ہم سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے اور ہمارا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ہیلی کاپٹر میں' میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ اس مختصر سے گروپ کی کمان مجھے کرنی تھی۔ پہلے ہم نے ہی لینڈ کرنا تھا۔ ہم کرنل لیاقت کے ہیلی کاپٹر میں سوار تھے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ مشن کتنا ناممکن العمل ہے۔

لیکن۔۔۔۔!

یہاں سوچنے کی مہلت ہی کسے نصیب تھی۔

وہاں تو ہم نے احکامات پر عمل کرنا اور ناممکن کو ممکن کر دکھانا تھا کیونکہ ایک کمانڈو کو یہی تربیت دی جاتی ہے۔۔۔۔ اور اس دن کے لیے فوج اپنے جانباز تیار کرتی ہے۔

دوسری ہیلی کاپٹر کو ہمارے تعاقب میں آنا تھا جسے میجر پیٹرک جنہیں سب پٹ کہتے' اڑا رہے تھے۔ ہمیں یہ آپریشن ہیلی کاپٹروں کی تمام لائٹس آف رکھ کر رات کے اندھیرے میں انجام دینا تھا۔ میں نے اپنے ہیلی کاپٹر میں داخل ہو کر ایک نظر اندر کمانڈوز پر ڈالی تو جیسے میرے بدن میں ایک تیز سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ وہ جیالے سرفروش تھے جو مادر وطن کے لیے ایک خودکشی کی حد تک دلیرانہ آپریشن کرنے جا رہے تھے۔



یقین مانیے ان پر نظر پڑتے ہی اگر میرے دل میں کوئی معمولی سا شائبہ بھی تھا تو وہ ختم ہو گیا۔

اللہ کا نام لے کر ہم نے پہلے ٹیک آف کیا۔ لائٹیں تو مکمل آف تھیں لیکن میں ونڈسکرین میں سے جنرل کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ انہوں نے ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔ ہمارے پیچھے میجر پیٹرک جانبازوں کی ایک ٹولی کے ساتھ اڑا۔۔۔۔!



میں دل ہی دل میں صرف ایک دعا کر رہا تھا کہ یااللہ جس کام کا بیڑا میں نے اٹھایا ہے' اسے تو اپنی رحمت سے پایہ تکمیل تک پہنچانا۔ بظاہر تو کامیابی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہمارے پاس کوئی نقشہ نہیں تھا۔ ہمیں لینڈ کرنے یا آپریشنل ایریا دکھانے کے لیے دوسری طرف کوئی بندوبست نہیں تھا۔ علاقہ کی اونچ نیچ کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔ جو کچھ بھی کرنا تھا اللہ کی مدد اور اپنی قوت بازو کے بھروسہ پر ہی کرنا تھا۔

کرنل نے دل ہی دل میں اپنی یادداشت کے بھروسے پر ایک مخصوص سمت کا تعین کر لیا اور یہ اندازہ لگا لیا کہ ہم فی منٹ دو میل کا سفر طے کریں گے۔ اسی حساب سے ہم نے سمت کا تعین کرنا اور پھر لینڈ کرنا تھا۔ میجر پٹ کو بھی تعاقب میں آنا تھا اس لیے عملاً تمام ذمہ داری کرنل لیاقت پر آن پڑی تھی۔ اگر علاقہ کھلا یا میدانی ہو اور چاندنی چٹکی ہوئی ہو تو بھی ہم لوگ زمین پر ہونے والی معمولی سی چمک ہی سے اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ جگہ ہمارے لینڈ کرنے کے لیے مناسب ہے یا نہیں' لیکن یہاں تو سوائے درختوں' جھاڑیوں اور پہاڑی ٹیلوں کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔۔۔۔!

ابھی ہم نے تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک ہیلی کاپٹر بادلوں میں گھر گیا۔ یہ ایک نئی مصیبت تھی جس کا ہم نے اڑنے سے پہلے اندازہ نہیں لگایا تھا کہ اس علاقے میں بادل بھی خاصے نیچے تھے۔ اب ہمارے لیے ضروری تھا کہ بہت نیچے آ جائیں۔ یہاں ایک اور خطرہ بھی پیش نظر تھا کہ اگر ہم زیادہ نیچے چلے گئے تو اندھیرے میں کسی درخت کی چوٹی' کسی پہاڑی وغیرہ سے ہی نہ ٹکرا جائیں۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ دونوں پائیلٹ وائرلیس پر ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس طرح یہ خطرہ سر پر موجود تھا کہ آپس کی گفتگو دشمن کو کسی شک میں مبتلا نہ کر دے۔ وہ سیٹ اسی وقت استعمال کرتے جب یہ ناگزیر ہوتا۔

علاقے کی پوزیشن ہماری توقعات سے بڑھ کر خطرناک تھی۔۔۔۔!

ہر طرف پہاڑیاں' بڑے بڑے درخت' جنگلات کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ یہاں کوئی بھی ایسا قدرتی سگنل میسر نہیں آ رہا تھا جسے دیکھ کر ہم لینڈ کرتے۔ حالانکہ عموماً" کوئی نہ کوئی اشارہ ایسی صورت حال میں مل جایا کرتا تھا۔

میں آج بھی جب اپنے اس عظیم پائیلٹ کرنل لیاقت کو یاد کرتا ہوں تو میرا ہاتھ خود بخود ماتھے تک اٹھ جاتا ہے۔

میں اس کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ ایسے ناممکن حالات میں کوئی مائی کا لال اپنی جان سے کھیلنے کا خطرہ مول نہیں لیا کرتا۔

میں کرنل کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

خدا خدا کر کے انہوں نے اپنی فنی مہارت اور اللہ کی نصرت کے بل بوتے پر بادلوں سے جان چھڑائی۔ اب ہم ایسی پوزیشن میں تھے کہ کم از کم اندھیرے میں نیچے کچھ تو دکھائی دے جاتا۔

اچانک ہی ہم دونوں کو جھٹکا لگا۔

خلاف توقع ہمارے سامنے نصب ریڈیو میں زندگی پیدا ہوئی اور دوسری طرف میجر پٹ کی آواز سنائی دی۔

"میں بادلوں میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ تمہارا ہیلی کاپٹر بھی نظر نہیں آ رہا۔"

ہم اندازہ کر سکتے تھے کہ میجر پٹ نے کتنی مجبوری کی حالت میں گفتگو کا خطرہ مول لیا تھا۔ یہاں پھر کرنل لیاقت کی فنی مہارت کام آئی۔ انہوں نے مخصوص تکنیکی زبان میں میجر پٹ کو سمت کا تعین کروایا۔

اور ہم خاصا نیچے آ گئے۔



ہمارے ساتھیوں کو صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ اس ایریا میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی ہے۔ اب وہی ندی تلاش کرنا تھی جس کے پانی سے پیدا ہونے والی چمک کی مدد سے ہم نے راستہ تلاش کرنا تھا۔ اللہ نے کرم کیا کہ جلد ہی ہمیں پانی کی معمولی سی چمک دکھائی پڑی۔ کرنل نے اس کے اوپر اوپر اڑنا شروع کر دیا۔



میجر پٹ تعاقب میں آ رہا تھا۔

یہ "قدرتی سگنل" میسر آتے ہی کرنل نے کمانڈوز کو تیار رہنے کا اشارہ کیا اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر وہاں لینڈ کر گیا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ہم زمین پر اتر جائیں۔ کرنل نے زمین سے چند فٹ کی بلندی پر ہیلی کاپٹر کھڑا کر لیا اور میرے ساتھی چند ہی منٹ میں اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ نیچے کود گئے۔

پہلا ہیلی کاپٹر خالی ہوتے ہی فضا میں بلند ہو گیا اور میجر پٹ کو لینڈ کرنے کا سگنل دیا۔ خود اس کی نگرانی اور کسی ناگہانی آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے سر پر موجود رہے' کیونکہ عین ممکن تھا کہ دشمن نے ہمیں دیکھ لیا ہو اور وہ گولہ باری شروع کر دے۔ پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

اس اثناء میں دشمن کو ہماری موجودگی کا علم ہو چکا تھا اور ہمارے لینڈ کرتے ہی اس نے زبردست فائرنگ شروع کر دی' لیکن دشمن ہمارے اس جرات مندانہ ایکشن سے اس بری طرح بوکھلا گیا تھا کہ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا ٹارگٹ کون سا ہے۔

اس فائرنگ میں پٹ بھی لینڈ کر گیا۔ اس کا ہیلی کاپٹر جہاں اترا وہ جگہ قدرے دلدلی تھی' لیکن آفرین ہے ہمارے شیر دل کمانڈوز پر کہ انہوں نے کسی مشکل کو خاطر میں لائے بغیر چھلانگیں لگا دیں اور دلدل سے سلامتی سے باہر نکل آئے۔

یہاں قدرت نے ہماری بڑے شاندار طریقے سے مدد کی۔ شاید جوانوں کی جرأت پر وقت بھی انہیں نذرانہ عقیدت گزارنا چاہتا تھا۔

جس علاقے میں کوئی فوج قبضہ کرتی ہے وہاں جو پوسٹیں قائم کی جاتی ہیں' ان کی پوزیشن اس طرح رکھی جاتی ہے کہ سرحد کے بالکل نزدیک ایک پوسٹ ہوتی ہے۔ پھر اس سے کچھ دور پیچھے ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر دو پوسٹیں بنائی جاتی ہیں۔ اس طرح مقصد یہ ہوتا کہ اگلی پوسٹ پر اچانک حملے کی صورت میں پچھلی دونوں پوسٹوں سے اسے کور فائر دیا جاتا ہے۔۔۔۔!

جہاں ہم نے لینڈ کیا وہ جگہ ان تینوں پوسٹوں کے عین درمیان تھی۔

دنیا کی تجربہ کار فوجیں بھی بمشکل کمانڈوز کے اچانک حملے کی صورت میں اپنے اعصاب پر قابو رکھ سکتی ہیں۔ ہمارا مقابلہ تو ایک وحشی قوم کی ظالم فوج سے تھا اور ظالم روائتی طور پر بزدل بھی ہوتا ہے۔

وہی ہوا۔۔۔۔!

کمانڈوز کی اچانک حیرت انگیز حد تک تیز اور بروقت کارروائی نے غاصبوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ اب صورت حال یہ ہوئی کہ پچھلی دونوں پوسٹوں کو یہی گمان گزرا کہ اگلی پوسٹ پر حملہ ہو گیا ہے اور اگلی پوسٹ نے یہ سمجھا کہ کمانڈوز ان کی پشت پر موجود حفاظتی پوسٹوں پر اتر گئے ہیں۔

رات کا اندھیرا----!!

دلدل، پہاڑی اور جنگلی علاقہ----!

دشمن خوف اور دھوکے کا شکار ہو گیا اور ایک دوسرے کو بچانے کے لیے انہوں نے اپنی گنوں کے دہانے ایک دوسرے کی طرف گھما دیئے۔

دونوں نے ایک دوسرے پر گولہ باری شروع کر دی۔

میں نے اس کو تائید غیبی جانا----!

تمام کمانڈوز میرے حکم پر اپنی جگہ دبک کر بیٹھ گئے۔ جب ان کی گولہ باری کی شدت میں کمی آنے لگتی، ہم دونوں پوسٹوں پر فائرنگ شروع کر دیتے اور وہ پھر جوش و خروش سے ایک دوسرے پر آگ برسانے لگتے۔

دو گھنٹے تک دشمن نے اپنے ارمان نکالے۔

جب ان دونوں کے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہو گیا تو میرے حکم پر رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے میرے جوان حرکت میں آ گئے۔

غیظ و غضب میں ڈوبے ان خدا کے شیروں نے محض آدھ گھنٹہ کی تیز ترین اور ہولناک کارروائی سے دشمن کا صفایا کر دیا۔ بزدل دشمن صرف آدھ گھنٹہ کی لڑائی میں دم دبا کر بھاگ گیا۔

صبح طلوع ہونے سے پہلے وہاں ہمارا قبضہ ہو چکا تھا۔

میری طرف سے فتح کا اشارہ موصول ہوتے ہی یہاں موجود فرنٹیئر فورس اور بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے یلغار کی اور اپنا قبضہ مستحکم کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد پھر دونوں ہیلی کاپٹر وہاں موجود تھے۔ ہم نے جوانوں کو ان کے ٹھکانوں پر اتارا اور خود چٹاگانگ پہنچ گئے۔

"ویل ڈن----" جنرل صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی نعرۂ تحسین بلند کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں جنرل صاحب کے ساتھ ڈھاکہ کی طرف عازم سفر تھا۔





دو روز ہی گزرے تھے جب مجھے میمن گنج میں ایک آپریشن کا حکم ملا۔ میرے ساتھ دس کمانڈوز کا ایک دستہ تھا اور ہمیں میمن گنج کے ایک گھنے جنگل میں داخل ہو کر مکتی باہنی کے ایک مضبوط اڈے کا صفایا کرنا تھا---- دس کمانڈوز کے ساتھ اس مہم کو انجام دینا خودکشی کے مترادف تھا۔

گھنا جنگل جس کے حدود اربعہ سے بھی ہم واقف نہیں تھے اور جہاں دشمن نے جگہ جگہ ہمارے استقبال کے لیے پھندے لگا رکھے تھے۔ ایسے علاقے میں آنکھیں بند کر کے گھس جانا بچوں کا کھیل نہیں۔ جذبہ اور شوق شہادت اپنی جگہ!

لیکن----!

آنکھیں بند کر کے اندھی کھائی میں چھلانگ لگانا حماقت ہی سمجھا جاتا ہے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا جب ہمارا ہیلی کاپٹر میمن گنج اترا۔ مقامی او-سی نے مجھے بتایا کہ یہاں "البدر" کی ایک کمپنی ہماری مدد کرے گی۔

میں اب بھی قدرے غیر مطمئن تھا کیونکہ میرے خیال سے الشمش اور البدر مقامی رضاکار تنظیمیں تھیں جن میں چھوٹی عمر کے بچے اور نوجوان شامل تھے۔ یہ لوگ جذبہ جہاد کے تحت ہماری مدد تو کر رہے تھے، لیکن اتنے اہم آپریشن میں یہ نوآموز ہماری کیا مدد کر سکتے تھے، جنہیں بمشکل ایک ہفتے کی تربیت کے بعد فوج میں شامل کر دیا جاتا تھا----! ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر جیپ رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اٹھارہ انیس سال کا باریش نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور گرمجوشی سے مصافحہ کرنے لگا۔

"قمر عالم، نام ہے میرا۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"یہ یہاں البدر کے کمپنی کمانڈر ہیں۔" او-سی صاحب نے بتایا۔

نوجوان کے چہرے پر ٹپکتی بشاشت، اس کے مضبوط ارادوں اور ماتھے پر محراب اس کے ناقابل تسخیر عزائم کی خبر دے رہی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ عام قسم کا نوجوان نہیں ہے۔

حیرت کی بات ہے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی میرے تمام وسوسے، تمام اندیشے جیسے اپنی موت آپ ہی مر گئے تھے۔

جب وہ میرے ساتھ بیٹھا حملے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو میں اس کی فراست پر حیران ہوا۔ آج سوچتا ہوں تو یقین آنے لگتا ہے کہ وہ مومنانہ فراست اللہ نے ہی اپنے ان خاص

بندوں میں عطا کی تھی۔ اس نے بڑی توجہ سی سارا منصوبہ سنا، پھر مجھے تجویز پیش کی کہ وہ
اپنے رضاکاروں کے ساتھ ہمارے پہلوؤں کی حفاظت کرے گا۔
میں عش عش کر اٹھا۔۔۔۔!
یوں لگتا تھا جیسے اس نے کسی اعلیٰ فوجی ادارے سے حملہ اور منصوبہ بندی کی باقاعدہ
تربیت حاصل کر رکھی ہے۔ دل ہی دل میں، میں شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا کہ ایسے
مجاہدوں کے متعلق میں نے غلط اندازہ کیسے قائم کر لیا۔
"آپ جنگل میں اس راستے سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوں گے۔ ہم آپ
کے ساتھ نہیں ہوں گے، لیکن کبھی ہمیں خود سے الگ نہ جانیے۔ انشاء اللہ جب آپ کو
کوئی مشکل پیش آئے گی ہمیں اپنے ساتھ موجود پائیں گے۔" اس نے نقشے پر ایک مخصوص
راستے کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔
"اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔" میں نے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔
بڑے پراعتماد قدموں سے چلتا وہ اس جیپ پر واپس چلا گیا جس پر یہاں آیا تھا۔

☆○☆

حملے کا وقت اس نے علی الصبح طے کیا تھا۔۔۔۔!
منصوبے کے مطابق ہم اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ ہم اپنی تربیت کے
مطابق بکھر اور ایک دوسرے کو آڑ دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دور دور تک "البدر"
کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ساتھ
ہمارے قدموں سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔
ابھی بمشکل ایک ڈیڑھ فرلانگ ہی چل پائے تھے جب اچانک ہم پر مینہ کی طرح گولیاں
برسنے لگیں۔۔۔۔ ہمارے لیے یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ اپنی تربیت کے مطابق ہم نے
پوزیشنیں سنبھال لیں، لیکن ابھی میں نے اپنے ساتھیوں کو فائرنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ میں
نہیں چاہتا تھا کہ دشمن کو فائرنگ کر کے ہم اپنی پوزیشنوں سے آگاہ کر دیں۔
زمین پر لیٹے ہوئے میں نے اس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم پر گھات لگا کر حملہ
کرنے والے بھی کسی حملے کی زد میں آ گئے ہیں کیونکہ ایک مخصوص ہتھیار سے فائرنگ نے
البدر کی موجودگی کا یقین دلا دیا تھا۔ حملہ آور اب ہماری طرف سے منہ پھیر کر اپنی جان
بچانے کی فکر میں غلطاں تھے۔ اس دوران ان کی فائرنگ سے ان کی پوزیشنوں کا اندازہ ہم



ے لگا لیا تھا۔
میں نے اپنے ساتھیوں کو حملے کا حکم دے دیا۔
بمشکل آدھ گھنٹہ یہ معرکہ جاری رہا جس کے بعد ایک درخت کی چوٹی سے ایک سفید
لیں لہرانے لگی جو ہتھیار ڈالنے کا اشارہ تھا۔ چند منٹ بعد ہی ہمارے سامنے پانچ مکتی باہنی
کھڑے تھے۔ ان کے پندرہ بیس ساتھی مارے جا چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے
پہلوؤں سے نعرہ تکبیر بلند ہوا اور میں نے دیکھا "البدر" قمر عالم کی سربراہی میں نیم دائرے
کی شکل میں ہمارے نزدیک پہنچ رہے ہیں۔
فرط جذبات سے میں نے قمر عالم کے ساتھ بغل گیر ہو کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ وہ
واقعی خدا کے پراسرار بندے تھے۔ اس نے ایک نظر گرفتار شدگان پر ڈالی، پھر ان میں سے
ایک کو الگ کر کے ایک طرف لے گئے۔
شاید اس سے ان کے یہاں اڈے کے متعلق پوچھ گچھ کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بنگالی زبان
میں اونچے اونچے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ گرفتار شخص کچھ بتانے پر راضی نہیں تھا، لیکن
قمر عالم نے تین چار منٹ میں ہی اسے سیدھا کر لیا۔ اس نے کراہتے ہوئے یہاں اپنے
ٹھکانے کی خبر کر دی۔
گرفتار شدگان کو ہم نے البدر کے تین مجاہدوں کی نگرانی میں روانہ کر دیا اور خود البدر
کے ساتھ جنگل کے مشرقی حصے میں ان کے خفیہ اڈے کی طرف چل دیئے۔
گو کہ اس مہم کی کمان میں کر رہا تھا، لیکن عملاً اس کی کمانڈ قمر عالم کو سونپ دی تھی۔
وہی ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ میمن سنگھ کا رہنے والا تھا اور شاید یہاں کے جنگلات سے
بخوبی آگاہ بھی تھا۔ البدر حسب سابق ہمارے پہلوؤں پر چل رہے تھے۔ سب سے آگے میں
اور قمر عالم تھے۔
آدھ گھنٹے کے بعد ہم نے ایک پہاڑی پر ان کی پوسٹ دیکھ لی۔ میں نے دوربین سے
حالات کا جائزہ لے کر قمر عالم سے کہا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑی کے سامنے والی
سمت سے حملہ کرے۔ حملہ کر کے ان لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے۔ اور میں چند
ساتھیوں کے ساتھ لمبا چکر کاٹ کر ان کی پشت سے حملہ کروں گا۔
قمر عالم میرے ساتھ جانے کا خواہش مند تھا، لیکن میرے بضد ہونے پر رک گیا۔ ہم
نے اپنے ساتھیوں کی تقسیم کر لی تھی۔ میں نے پانچ کمانڈوز اور پانچ "البدرز" اپنے ساتھ
لیے تھے۔ تین کمانڈوز قمر عالم کے ساتھیوں میں سامنے سے حملہ کرنے والی ٹکڑی میں شامل

ہو گئے اور دو کمانڈوز کو ہم نے تین البدر کے ساتھ نزدیکی ندی کی طرف روانہ کر دیا جہاں ان لوگوں کی موٹر بوٹس کھڑی تھیں کیونکہ انہوں نے ان موٹر بوٹس کے ذریعے ہی فرار ہونا تھا۔

یہ مشورہ بھی قمر عالم نے دیا تھا۔ میں اس کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ حملے کی تمام جزئیات پر اس کی مکمل نظر تھی۔ ندی کی طرف جانے والے ساتھیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پہلی فرصت میں گن بوٹس پر قبضہ کر لیں اور اس طرف بھاگ کر آنے والوں کو مار ڈالیں یا گرفتار کر لیں۔



حملے کی ابتدا بھی "البدر" نے کی۔

ہم نے گھڑیاں ملا لی تھیں اور طے شدہ وقت کے مطابق حملے کا آغاز کر دیا۔ اچانک حملے نے دشمن کو بوکھلا کر رکھ دیا--- لیکن جلد ہی وہ لوگ سنبھل گئے اور مقابلے پر ڈٹ گئے۔

البدر نے کمال ہوشیاری سے ان کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کروا رکھی تھی--- میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ البدر کی راہنمائی میں پہاڑی کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔
ہم نے آہستہ آہستہ ایڈوانس کیا۔ البدر کے رضاکار بالکل منجھے ہوئے فوجیوں کی طرح ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ جیسے ہی دشمن ہمارے نشانے پر آیا' البدر کے رضاکاروں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دشمن پر قہر کے دھانے کھل گئے۔

یہ حملہ اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ دشمن بوکھلا کر رہ گیا۔
ان کی توجہ بٹ گئی۔ بمشکل چند منٹ ہی وہ ہمارا مقابلہ کر پائے۔ ان میں سے اکثر مارے گئے جو باقی بچے وہ بھاگ اٹھے۔

ان کے فرار کا واحد راستہ ہم نے جان بوجھ کر خالی چھوڑ دیا تھا۔ جیسے ہی وہ اس راستے کے ذریعے ندی کے گھاٹ تک پہنچے' وہاں ان کے استقبال کو پہلے سے موجود ہمارے مجاہدوں نے انہیں اپنے نشانے پر رکھ لیا۔

جب گھبرا کر واپس پلٹے تو البدر کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ ان لوگوں نے کمال کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ہم کل ملا کر ۳۰ آدمی بنتے تھے اور اس حملے میں دشمن کے اب تک سو سے زائد تخریب کار مارے گئے تھے جب کہ پندرہ کو ہم نے زندہ گرفتار کر لیا



تھا۔

اس وقت یہاں کل ملا کر یہی تخریب کار تھے۔ ایک بھی ان میں سے بچ کر نہیں جا سکا کہ اپنے آقاؤں کو اپنی تباہی کی خبر کر دیتا۔ خدا کا خصوصی کرم رہا تھا کہ ہمارے کسی ایک ساتھی کو معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔

قیدیوں کو لے کر ہم میمن گنج واپس آ گئے جہاں انہوں نے تفتیش کے دوران انکشاف کیا کہ ان کا سرغنہ قریب ہی ایک گاؤں میں موجود ہے۔

ہم نے فوری طور پر اس کی گرفتاری کے لیے گاؤں پر چھاپہ مارنے کا فیصلہ کیا۔ جب میں نے اس مہم پر جانا چاہا تو قمر عالم نے مجھے روک دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ فوج کو دیکھ کر گاؤں کے لوگ انہیں خبردار کر دیں گے۔ اس کے بجائے اس مہم پر تین البدر روانہ ہو گئے۔

میں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ بہت کم تعداد میں ہیں' لیکن ان کے جذبہ ایمانی کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ان تینوں میں ان کا کمانڈر قمر عالم بھی شامل تھا۔

ہم نے دعاؤں کے ساتھ ان لوگوں کو رخصت کر دیا۔ گاؤں یہاں سے تین چار میل دور واقع تھا۔ یہ لوگ سویلین لباس میں اپنے ہتھیار چھپا کر چل دیئے۔

تھوڑی دیر بعد میں بھی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ان کے تعاقب میں چل دیا۔

یہ احتیاطی اقدام تھا---!



مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ گاؤں تک ہم چھپتے چھپاتے پہنچ گئے۔ گاؤں سے باہر ہی تھے کہ فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں جس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ تخریب کاروں نے البدر کا مقابلہ شروع کر دیا ہے---!

ہم نے بجلی کی سی پھرتی سے گاؤں کے گرد گھیرا ڈال لیا تاکہ اپنے ساتھیوں کو ممکنہ مدد بہم پہنچا سکیں۔ میں خود گاؤں سے باہر آنے والے راستے پر مورچہ جما کر بیٹھ رہا۔

بمشکل پندرہ بیس منٹ گزرے تھے کہ یہ ہنگامہ فرو ہو گیا---!

"یاالٰہی خیر---!" میرے دل سے دعا نکلی۔

میں البدر کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا جب مجھے دور سے کچھ اور لوگ اس طرف آتے دکھائی دیئے۔ دوربین آنکھوں سے لگائے میں انہیں بے چینی سے دیکھ رہا تھا۔ چہرے نمایاں ہوئے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ تین تخریب کاروں کو گھیرے میں لے کر قمر عالم

# تیرے پُر اسرار بندے

میں پھر ڈھاکہ لوٹ آیا-----!

ڈھاکہ کے درودیوار پر تخریب کاری کی بدروح پھر منڈلانے لگی تھی۔ تباہ کاریوں اور قہرناکیوں کا یہ دیو جس پر ہم نے آپریشن سرچ لائٹ کی دیوار گرا کر یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ زمین میں دفن ہو چکا ہے پھر سر اٹھا کر باہر نکل آیا اور اس نے سالمیت اور استحکام کو آہستہ آہستہ نگلنا شروع کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر وہی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہونے لگا تھا۔

محب وطن ایک ایک کر کے، چن چن کر مارے جا رہے تھے۔

انہیں اس بہیمانہ طریقے سے قتل کیا جاتا تھا کہ جس کے تصور ہی سے لرزہ طاری ہونے لگے۔ قتل کرنے کے بعد ان کی مسخ شدہ لاشوں کو فسانۂ عبرت بنانے کے لیے ان کے گلے میں تختی ڈال کر کسی چوراہے میں پھینک دیا جاتا تھا۔

صورت حال اتنی گھناؤنی اور جان لیوا ہو رہی تھی کہ محب وطن اپنی جانیں چھپائے پھرتے تھے۔

پاکستان سے محبت کرنے والے۔

پاکستان کے لیے جان سے گزر جانے والے۔

پاکستان کے لیے اپنے تن من دھن کی قربانی دینے والے۔

بے گناہ اور بدقسمت بنگالیوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا تھا۔ وہ پناہ کی تلاش میں اپنی عزت و آبرو اور جان و مال بچانے کے لیے مارے مارے پھرتے تھے، لیکن انہیں کہیں امان میسر نہ تھی۔

فوج کتنے لوگوں کو کب تک اپنی حفاظت میں رکھ سکتی ہے۔ مغربی پاکستان کے باشندوں نے یہاں سے فرار ہونا شروع کر دیا تھا۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ لوگ اپنا مال و اسباب فروخت کر کے جہاز کے ٹکٹ خریدتے اور اپنے کنبوں

Enjoy your LiFe

سمیت ایئرپورٹ پر چلے آتے۔

ہوائی جہاز سے سفر کرنے والوں کی قطاریں لگ گئی تھیں، جس کی باری آ جاتی وہ خوش قسمت شمار ہوتا تھا۔

میری چھٹی حس نے آنے والے حالات سے متعلق خطرے کا سگنل دینا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز جب صورت حال ایسی ہی گھمبیر ہو رہی تھی تو میں نے معظم سے مشورہ کیا۔ اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ عظمیٰ کو ہم فی الحال پاکستان اپنے گھر بھیج دیں۔

اگلے ہی روز مجھے اپنے گھر لکھے خط کا جواب موصول ہو گیا---!

میری ماں نے حسب توقع اس خبر پر بے پناہ مسرت کا اظہار کرنے کے بعد خواہش کی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو، میں عظمیٰ کو اس کے پاس بھیج دوں۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو وہ خود عظمیٰ کو آ کر لے جائے---!

اب تک معظم نے اپنی بیوی کو صرف عظمیٰ کے لیے یہاں روک رکھا تھا ورنہ ایسے حالات میں بھابی کا یہاں رہنا خود مجھے بھی گوارہ نہیں تھا۔

اس روز جب میں عظمیٰ کے پاس گیا تو یہی ارادہ لے کر گیا تھا کہ اسے واپسی پر قائل کر لوں۔ میں نے اسے تمام اونچ نیچ سمجھا دی۔ حالات کی جو بھی بھیانک تصویر ہو سکتی تھی، دکھا دی اور اس سے درخواست کی کہ وہ مغربی پاکستان چلی جائے اور حالات سدھرنے پر لوٹ آئے۔

عظمیٰ نے میری باتیں بڑے ٹھنڈے دل سے سنیں۔ جب میں نے اپنی بات ختم کر لی تو وہ خاموشی سے خلاؤں میں گھورنے لگی جیسے وہاں اپنا گمشدہ ماضی تلاش کر رہی ہو۔ میں اس کے اداس اور متفکر چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ اسی کیفیت کی نذر ہو گئے پھر اس نے کہا۔

"میں آپ کے احساسات کی قدر کرتی ہوں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ ان حالات پر آپ پر یہ بوجھ بننا زیادتی ہے۔ آپ نہ صرف میرے محبوب ہیں بلکہ محسن بھی---! آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں شاید آپ کی اس خواہش کا احترام نہ کر سکوں--- میرا دل آپ کی بات نہیں مانتا۔ میں نہیں سمجھتی کہ بہت دیر تک شرپسند اپنا یہ گھناؤنا کھیل جاری رکھ سکیں گے--- میرا دل کہتا ہے جلد ہی گمراہ لوگوں کو عقل آ جائے گی--- آخر میری ماں نے بھی تو اسی زمین پر اسی ملک کے لیے اپنی جان دی ہے، میں یہاں سے بھاگ کر کیوں جاؤں۔ میں اس کی روح کے سامنے



شرمسار نہ ہو جاؤں گی--- نہیں شیرافگن! مجھے یہیں رہنے دیجئے۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیجئے۔ جس عظیم مشن کے لیے میری ماں نے جان دے دی، میں اسے ادھورا چھوڑ کر کیسے جاؤں۔" میں حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے عظمیٰ مجھے کسی اور سیارے کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ ایک جلال اور تقدس اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ وہ ہم فانی لوگوں کے جہان کی مکین تو دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی خاص مشن پر اس دنیا میں آئی ہے اور اسے مکمل کر کے لوٹ جائے گی۔

ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد اس نے کہا:

"میرا ایمان ہے جیسے زندگی کا ایک لمحہ فالتو نہیں مل سکتا۔ اسی طرح موت بھی اپنے طے شدہ وقت سے ایک لمحہ پہلے نہیں آئے گی--- پھر تم ہی سوچو شیرافگن اب میرے نزدیک زندگی کا مفہوم ہی کیا رہ گیا ہے۔ مجھ میں اب جینے کی خواہش رہے گی ہی کیوں؟ میں اگر زندہ ہوں تو صرف اپنے مشن کی تکمیل کے لیے--- میں نہ تو اپنی آنکھوں سے اپنے ملک کو تباہ ہوتا دیکھ سکتی ہوں نہ ہی ڈوبتی کشتی سے چھلانگ لگا کر بھاگوں گی۔ مجھے افسوس ہے میرا تعلق کسی بہت بڑے خاندان سے نہیں اور جتنے عزیز رشتے دار ہیں، وہ بھی زیادہ تر گمراہ ہی ہو چکے ہیں--- اس لیے میں ان کے پاس نہیں جا سکتی--- پھر بھی میں یہ نہیں چاہوں گی کہ تم پر بوجھ بن کر رہوں۔ تم جب ایسا محسوس کرو، بخدا مجھے آگاہ کر دینا۔"

"نہیں عظمیٰ---" میں نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "خدا گواہ ہے عظمیٰ--- میرے ذہن میں دور دور تک ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو صرف تمہارے تحفظ کے لیے فکرمند ہوں--- عظمیٰ! تم بھیڑیوں کے ریوڑ میں گھری ہوئی ہو۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ شاید تم نہیں لگا سکتی--- انسان کی عظمت کی طرح اس کی پستی کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ وہ گرنے پر آئے تو اتنا ہی گر سکتا ہے جتنا ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ تم نے ان بدقسمت محب وطن مسلمان لڑکیوں کا حال نہیں دیکھا جن کی عصمت دری کے بعد انہیں زندہ درگور کر دیا گیا۔ کیا کوئی مسلمان، عورت کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے؟"

"نہیں شیرافگن! خدا کے لیے انہیں مسلمان نہ کہو--- تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ ایسی گھٹیا حرکت کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ہندو درندوں کی سازش ہے۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں--- وہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں کہ دین کا رشتہ کوئی رشتہ نہیں، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ یہ دنیا کا مضبوط ترین رشتہ ہے--- یہی رشتہ عظمیٰ کو اور لاکھوں محب وطن بنگالیوں کو اسی سرزمین پر رکے رہنے پر مجبور کر رہا ہے--- اسی

رشتے کے تقدس کے لیے میں نے اپنے باپ سے اپنی راہ الگ کر لی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا---- "نہیں شیر افگن! تم دوبارہ مجھے یہ بات نہ کہنا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں تمہاری بات کو ٹال نہیں سکتی---- تمہارا کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ میں آخر کب تک اس سے سرتابی کر سکوں گی۔"

اس نے میرے سینے پر سر رکھ کر اپنے اندر کا لہو اپنی آنکھوں کے راستے بہانا شروع کر دیا۔

"ٹھیک ہے عظمیٰ۔ میں تمہارے فیصلے پر صاد کرتا ہوں۔ بخدا تم میرے تصورات سے بڑھ کر عظیم ہو۔ میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔" میرا ہاتھ بے اختیار سر کے بالوں سے چھو گیا۔

کسی انجانے جذبے نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اس دھان پان سی لیکن کسی چٹان کی طرح مضبوط سانولی سی لڑکی کو سلیوٹ کروں۔

☆○☆

ہم نے بھابی کو پاکستان بھیج دیا تھا----!

دم رخصت وہ عظمیٰ سے گلے لگ کر بچوں کی طرح روتی رہی، شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔

معظم جہاں قیام پذیر تھا اس علاقے کے سب ہی لوگ محب وطن تھے۔ ان میں زیادہ تر تو مغربی پاکستان کے پولیس ملازمین کی تھی۔ باقی لوگ بنگالی سرکاری ملازمین تھے، لیکن ان کی وفاداریاں شک و شبہ سے مبرا تھیں۔ عظمیٰ کو اس نے اپنے ایک ماتحت بنگالی آفیسر کے گھر منتقل کر دیا تھا جس نے بخوشی یہ ذمہ داری قبول کر لی تھی۔

حالات ہمارے اندازوں کو مات دے رہے تھے۔

ایسی کوئی خوش فہمی تو نہیں تھی---- لیکن، سب کچھ اتنی تیزی سے وقوع پذیر ہو گا، یہ تو گمان نہیں گزرتا تھا۔

محاذ بہت بڑا تھا۔

ہم چو مکھی لڑائی لڑ رہے تھے۔



ہم پر اندر سے بھی حملے ہوتے تھے باہر سے بھی۔

باہر کے حملوں کا دائرہ تو وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ بھارت کی ننگی جارحیت تو ایک طرف، جب سے غیر ملکی پریس کی پاکستانی جرنیلوں سے ٹھنی تھی، انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں ایک طرف رکھ کر اسے اپنی انانیت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اس لڑائی کو یہودی پریس نے خصوصاً" اپنی ذاتی لڑائی اور قومی فریضہ جان کر پاکستانی افواج کے خلاف ایسا ایسا زہر اگلا کہ الامان الحفیظ----! اس تسلسل سے جھوٹے الزامات کی بوچھاڑ کی گئی کہ اب وہ مرحلہ آ گیا تھا جب ہماری طرف سے دی جانے والی کوئی بھی صفائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی----!

اور یہی دشمن چاہتا تھا۔

دشمن نے بھی یہی چال چلی تھی کہ ہم الجھ کر رہ جائیں۔

ہمیں اپنی فکر پڑی رہے----!

اپنے گھر کی فکر----!

وہ روز بروز ہمارے خلاف نئے محاذ کھول رہا تھا---- ان محاذوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی---- دشمن ہمیں لٹکا کر، الجھا کر مارنا چاہتا تھا۔

اور ہم----!

ہم اپنی ناقص پالیسیوں، نا سمجھیوں، ہٹ دھرمیوں کے سبب اس کے پھیلائے جال میں پھنستے چلے گئے۔

جو لوگ یہ ادراک رکھتے تھے کہ ہم گہری سازش کا شکار ہیں۔ ہم ان دیکھی دلدل میں ڈوب رہے ہیں---- ہمارے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔

ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

وہ صرف کڑھ سکتے تھے، کچھ کر نہیں سکتے تھے---- مجبور تھے بے چارے۔

اور----!

اس صورت حال نے فوج کے مورال کو بری طرح متاثر کیا۔ عام افسروں کی خواہش تھی کہ دشمن کے پراپیگنڈے کا ڈھنگ سے---- بہتر اسلوب سے---- اچھے طریقے سے جواب دیا جائے۔ پاک فوج کے عظیم کردار کو داغدار ہونے سے بچایا جائے۔

لیکن----!

اس نقار خانے ان طوطیوں کی آواز سنتا کون؟ وہاں تو حالات میں ایسے ایسے ارتعاش اٹھ

رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔۔۔۔ سب اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔

ہر کوئی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر بیٹھ رہا تھا۔

معمولی بونوں نے اپنی دانست میں اپنا قد پہاڑ سے بلند سمجھ لیا تھا۔

عجیب عجیب طرح کی آوازیں۔۔۔۔!

بے ڈھنگی چالیں۔۔۔۔!

بے ہودہ تجاویز۔۔۔۔!

بے وقت کی راگنی۔۔۔۔!

یہ صورت حال کسی کو تو کیا متاثر کرتی، ہم خود اس کا نشانہ بن گئے۔

اور مٹ گئے۔۔۔۔!!



ہماری تعداد کم تھی۔۔۔۔!

اس لیے کسی ڈیوٹی کی تخصیص نہیں کی گئی تھی۔ ایک ایک وقت میں خصوصاً افسران کو دو دو تین تین ڈیوٹیاں ادا کرنی پڑتی تھیں۔

اس روز بھی میں ایک ایسے ہی اہم مشن پر جا رہا تھا۔ میری کمپنی کے جوان مختلف محاذوں پر بکھرے ہوئے تھے جنہیں بوقت ضرورت اکٹھے کر کے ہم کوئی مشن کیا کرتے تھے۔

اس مرتبہ مجھے ڈویژنل کمانڈر نے براہ راست طلب کیا تھا، جس سے معاملات کی سنگینی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

جب میں ہیڈکوارٹر پہنچا تو کرنل لیاقت کا ہیلی کاپٹر وہاں کمانڈوز سمیت لینڈ کر رہا تھا جس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس مرتبہ بھی مہم خاصی زوردار ہے۔ کرنل لیاقت کو عموماً ایسی ہی خطرناک مہمات کے لیے بلایا جاتا تھا، کیونکہ ان کے دلیرانہ کارناموں کی گونج بہت دور تک سنائی دینے لگی تھی۔ ایوی ایشن کے کمانڈر ہونے کے ناطے انہوں نے جو محیرالعقول کارنامے انجام دیئے تھے، اس پر ہر چھوٹا بڑا افسر انہیں تحسین کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔۔۔۔!

تھوڑی دیر بعد میں جنرل صاحب کے سامنے موجود تھا جو مجھے آپریشن کی باریکیوں سے آگاہ کر رہے تھے۔

شاید مئی کے آخری دنوں یا جون کا آغاز کا واقعہ ہے۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے درمیان



ریل کا رابطہ بحال رکھنے والے واحد پل "بھیراب بازار پل" پر بھارتی فوج نے مکتی باہنی کے روپ میں اچانک قبضہ کر لیا۔ ان دنوں یہاں ہماری فوج نہ ہونے کے برابر تھی اور ابھی تک ہم بنگالیوں پر ہی اعتماد کر رہے تھے۔

بڑی تشویشناک صورت حال تھی کیونکہ۔۔۔۔ اگر اس پل پر دشمن کا قبضہ برقرار رہتا تو ہمارا ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے درمیان واحد رابطہ بھی کٹ کر رہ جاتا۔

دشمن نے چالاکی یہ کی کہ یہاں قابض ہوتے ہی پل میں جگہ جگہ ڈائنامیٹ لگا دیا۔ اس طرح اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر پاکستانی فوج پل واپس لینے کے لیے حملہ کرے تو وہ اسے دھماکے سے اڑا کر یہ واحد رابطہ بھی ختم کر دیں۔

ہمارے ڈویژن کمانڈر جنرل صاحب نے فوراً مجھے طلب کیا اور صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہنے لگے۔

"تمہیں یہ اٹیک آپریشن کرنا ہے۔ کمانڈوز کو پل کے نزدیک ترین ڈراپ کرو اور ایکشن اتنا تیز ہو گا کہ بھارتیوں کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکے کہ وہ پل اڑا دیں۔۔۔۔!"

آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کتنا مشکل بلکہ ناممکن آپریشن تھا۔ ہم لوگ کتنی ہی زیادہ پھرتی دکھاتے، لیکن کمانڈوز کے دشمن کے سر پر پہنچنے تک کیا دشمن کو اتنی مہلت بھی ملتی کہ وہ پہلے سے پل میں لگائے ہوئے ڈائنامیٹ کے ذریعے ایک لیور دبا کر پل کو تباہ کر دیتا؟ اور یہ آپریشن بھی ہمیں رات کے اندھیرے میں نہیں بلکہ دن کے مکمل اجالے میں یعنی دن کے ڈھائی بجے کرنا تھا۔

جب علم ہوا کہ ہمارے ہیلی کاپٹر کے پائیلٹ کرنل لیاقت ہیں تو دل نے کہا کہ اب یہ ناممکن بات نہیں رہی۔

حالات بظاہر ایسے نہیں تھے کہ ہم یہ ناممکن حد تک مشکل آپریشن انجام دے سکیں لیکن انہوں نے جنرل صاحب کو بطور ایوی ایشن کمانڈر اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا دیا۔

ہم نے ایئرفورس کی مدد سے ایک منصوبہ ترتیب دیا، جس میں یہ طے پایا کہ پہلے دشمن کو دہشت زدہ کرنے کے لیے ایئرفورس ان کے سروں پر تیز اڑانیں کرے گی اور پل کے آس پاس دشمن کو دھمکانے کے لیے معمولی نوعیت کی فائرنگ کی جائے گی۔ اس طرح دشمن کچھ دیر کے لیے بوکھلا جائے گا اور اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر ہم پل پر کمانڈوز اتار دیں گے۔

پہلے گروپ میں تین ہیلی کاپٹرز جا رہے تھے اور ان کی کمانڈ کرنل لیاقت کر رہے تھے۔

میں پہلے ہیلی کاپٹر میں اپنے ماتحتوں سمیت موجود تھا۔
پلان مکمل ہوتے ہی ہم نے کمانڈوز کو ہیلی کاپٹروں میں سوار کر لیا۔ ایک ہیلی کاپٹر میں
قریبا" چوبیس کمانڈو آ سکتے تھے۔ اب ہم لوگ کسی بھی لمحے اڑنے کے لیے تیار تھے۔ صرف
ایئرفورس کی طرف سے سگنل ملنے کی دیر تھی۔
جنرل صاحب بہ بنفس نفیس اس حملے کی کمان کے لیے موجود تھے۔ میں محسوس کر سکتا
تھا کہ اس وقت ان کے جذبات کیا ہوں گے۔ ایوی ایشن کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ایک
عظیم انسان کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ وہ بھی دل ہی دل میں خدا سے کامیابی کے لیے دعا
گو تھا۔ بالکل میری طرح۔۔۔۔!
پائیلٹ کی ذمہ داری ان حالات میں یوں بھی بہت زیادہ نازک ہوتی ہے۔ اس کی ذرا
سی لغزش یا بزدلی سب کو لے ڈوبتی ہے۔ ہمیں دن کے اجالے میں "اوپن فلائی" کر کے جانا
تھا۔ دھوکے سے حملہ آور ہونے کے امکانات ہی دشمن نے ختم کر دیئے تھے۔ ان حالات
میں کوئی پتھر کے جگر والا پائیلٹ ہی یہ ذمہ داری قبول کر سکتا تھا۔۔۔۔!
ہم سب پر عزم اور دعاگو کرنل لیاقت کے ہیلی کاپٹر میں موجود تھے۔
ہم آپریشن ایریا سے دور چھپے ہوئے تھے۔ یہاں سب سے بڑا خطرہ مکتی باہنی کے
ہمدردوں کا تھا۔ اگر کسی بنگالی کی نظر ہیلی کاپٹروں میں سوار ہوتے کمانڈوز پر پڑ جاتی تو عین
ممکن تھا کہ وہ دشمن کو مطلع کر دیتا اور ہم کچھ کرنے کی حسرت ہی دل میں لے کر رہ جاتے۔
میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور میں اگنیشن سوئچ پر نظریں جمائے کسی بھی اشارے
کا منتظر تیار بیٹھا تھا۔ اشارہ ملنے پر کرنل لیاقت نے چابی گھمانی تھی۔ کاک پٹ سے ہماری
نگاہیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں اور میرے ساتھیوں کے کان بھی پاکستان ایئرفورس کے طیاروں
کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔
انتظار کا ایک ایک لمحہ خصوصا" ان حالات میں بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ ان اذیت ناک
لمحوں سے ہمیں تب نجات ملی جب کان ایک مانوس شور کی آواز سے گونجنے لگے۔ پھر ہمارے
سروں پر سے دو پاکستانی سیبر ایف۔۸۶ چنگھاڑتے ہوئے دور نکل گئے۔ اس فارمیشن کی کمانڈ
ونگ کمانڈر چوہدری کر رہے تھے۔
پاکستانی سیبرز کی آواز نے اندر بیٹھے مجاہدین میں جوش و ولولہ کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔
وہ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند کرنے لگے۔ ان نعروں میں خدا جانے کیا بجلیاں بھری
تھیں جو میری نس نس میں دوڑنے لگیں۔۔۔۔!



پاکستان ایئرفورس کے جیالے شہبازوں نے اس پل سے ملحق ایک بڑی گودام کی دیوار پر
راکٹ برسائے۔ اس گودام میں بھارتی فوج مورچہ بند تھی۔ انہوں نے پل پر ایک گولی بھی
فائر نہ کی۔ صرف پل کے اردگرد علاقے میں مورچہ بند مکتی باہنی اور بھارتی فوجیوں پر فائرنگ
کرتے رہے۔
اس کے ساتھ ہی ہمیں ٹیک آف کرنے کا سگنل موصول ہوا۔
میں کرنل صاحب کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ان کے اندر پل پل اٹھنے والا
طوفان اب ان کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ میں ان کے اندر چکراتے طوفانوں کا بخوبی اندازہ
کر سکتا تھا۔
جو میری حالت تھی وہ ان پر آشکار تھی۔۔۔۔!
اس لمحے وہ ہمارے بیڑے کے کپتان تھا۔ اس مشکل ترین آپریشن کی پلاننگ کرتے
ہوئے ان کے ماضی کو ضرور پیش نظر رکھا گیا تھا کیونکہ فوجی اصولوں کے مطابق اس بات کی
اہمیت نہیں کہ آپ کے پاس بندوق کون سی ہے بلکہ اہمیت اس بات کو دی جاتی ہے کہ اس
کے پیچھے گولی چلانے والا کون ہے۔
طے شدہ پلان کے مطابق پاکستانی ایئرفورس کے شاہبازوں نے دشمن کو الجھا لیا تھا اور
اس کے سروں پر تیز اڑانیں کر کے اسے قدرے بوکھلا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا ہیلی
کاپٹر بلند ہوا۔
ہمارے ہیلی کاپٹر کے دائیں اور بائیں دو اور ہیلی کاپٹر بھی بلند ہوئے۔ اب تین ہیلی
کاپٹروں میں کمانڈوز اس اہم مہم پر روانہ ہو رہے تھے۔ ان ہیلی کاپٹروں کو یکے بعد دیگرے
پل کے بہت نزدیک لینڈ کرنا تھا۔ اس پل کے نزدیک جس کے کسی بھی لمحے ڈائنامیٹ سے اڑ
جانے کا خطرہ موجود تھا۔ جس کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر بھی پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں بکھر
جاتے۔۔۔۔ لیکن جب اللہ نے کسی قوم سے کوئی کام لینا ہو تو اسباب بھی خود ہی پیدا فرما
دیتے ہیں۔
ہم قدرے نیچی اڑان کر رہے تھے۔۔۔۔!
اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ دشمن کی نظروں سے جس حد تک ممکن
ہو محفوظ رہیں۔۔۔۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہیلی کاپٹروں کے انجنوں کی آواز "سیبرز" کی
گڑگڑاہٹ میں دبی رہے۔۔۔۔!
یہ ہمارے بہادر اور مایہ ناز پائیلٹوں کی جرأت ایمانی تھی کہ انہوں نے اس مہم کو بھی

بالآخر سر کر لیا۔

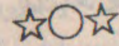
جیسے جیسے ہم منزل کے نزدیک ہو رہے تھے' جوش غضب سے ہماری حالت غیر ہو رہی تھی---- اب ہمیں دور سے پل بھی نظر آنے لگا تھا۔ میں کرنل لیاقت کے پہلو میں بیٹھا تھا---- جب ان کی آواز ہمیں سنائی دی۔

"سٹینڈ بائی۔"

میرے بدن کی ساری طاقت پاؤں میں منتقل ہو گئی۔

میں نے یہ حکم دہرایا اور دوسرے ہی لمحے کمانڈوز تن کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے ہتھیار فائرنگ پوزیشن میں کر لیے تھے۔ اپنے قدم ہم نے ہیلی کاپٹر کے فرش پر گاڑ رکھے تھے اور کسی بھی لمحے اتر جانے---- اور کچھ کر گزرنے کے لیے تیار تھے----!

پھر وہ ابدی لمحہ بھی آ گیا۔



ایسا لمحہ جو انسانی سائیکی میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جایا کرتا ہے۔

ایسے زندہ لمحات زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔

یہی وہ سرمایہ حیات ہے جس نے آج تک مجھ جیسے ہزاروں فوجیوں کو زندہ رکھا----

یہ سوچ ہی کتنی زندگی بخش ہے کہ اس وطن کی تعمیر میں کہیں نہ کہیں ہمارے خون کے چند قطرے بھی شامل ہیں۔

پاکستان کے شہریو!

خدائے وحدہ لاشریک کی قسم!

آپ کو حالات کی وہ تصویر نہیں دکھائی گئی جو دکھائی جانی چاہیے تھی۔ آپ کو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

کیا کبھی آپ میں سے کسی نے ایمانداری سے جاننے کی کوشش کی کہ یہ فوجی شکست تھی یا سیاسی شکست----؟

اس لڑائی میں فلک نے مجاہدین کی عظمتوں کے وہ وہ نظارے دیکھے جن کی نظیر تاریخ عالم میں مشکل سے دکھائی پڑتی ہے۔

یہی نہیں ہوا تھا کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے تو وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔



یہ تاریخ کا بہت بڑا جھوٹ ہے----!

کاش ہمیں سچ اور جھوٹ کا موازنہ کرنے کی توفیق نصیب ہو جائے۔

کاش ہم جان لیں کہ جب من حیث القوم ہم بداعمالیوں کے مرتکب ہونے لگیں' جب راہرو اور رہبر ہی قافلے کو لوٹنے لگیں۔

جب گلچیں ہی گلشن اجاڑنے پر تل جائے۔

تب تاریخ خود بھی اپنے آپ کو دہرانے لگتی ہے۔ تب چند انسان مل کر اپنے ارادوں میں لاکھ مخلص ہونے کے باوجود حالات کو سنوار نہیں سکتے۔

جب بداعمالیاں حد سے تجاوز کرنے لگیں تو مکافات عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ بس یہ جان لیجئے کہ وہ مکافات عمل تھا۔

ہمارے ملی گناہوں کی سزا تھی وہ----!

اس ملی گناہ میں ہم سب نے بڑھ چڑھ کر حسب توفیق حصہ لیا تھا۔

وہ سانحہ جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وقوع پذیر ہوا' اس کی بنیاد بہت پہلے رکھ دی گئی تھی۔

ہم نے مملکت خداداد کو لوٹ کا مال سمجھ لیا تھا۔

اپنے فرائض بھلا کر حقوق کا رونا رونے لگے۔ ہم نے مردار خوروں کی طرح اپنے جسد ملی کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا تھا۔

ہم نے شہداء کے خون سے غداری کی۔

ہم نے قدرت کی عطا کردہ مہلت کو غنیمت نہیں جانا۔ اپنے گناہوں کے گرداب میں اندر ہی اندر دھنستے چلے گئے۔

ہم نے یہ نہ جانا کہ فطرت افراد سے اغماض کیا کرتی ہے---- ملت کے گناہوں کو معاف نہیں کیا جاتا۔

خدارا سوچئے---- سمجھئے!

انصاف کیجئے---- انصاف کیجئے۔

یہ پاکستان آرمی کی شکست نہیں تھی' من حیث القوم ہماری نااہلی' بے حسی' بزدلی اور بے غیرتی کا شاخسانہ تھا۔



ایئرفورس نے بڑی کامیابی سے دشمن کو الجھایا ہوا تھا۔ ہم نے دشمن کی بوکھلاہٹ سے

پورا پورا فائدہ اٹھایا اور پل سے بمشکل سو گز دور اتر گئے۔ ہیلی کاپٹرز کے لینڈ کرتے ہی کمانڈوز اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند کرتے چیتوں کی سی پھرتی سے باہر چھلانگ لگا گئے۔ انہوں نے واقعی ٹائیگرز کی طرح دشمن کو دبوچا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ کمانڈوز تعداد میں بہت کم تھے جب کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ دوبارہ انہی ہیلی کاپٹروں میں انہیں کمک پہنچائی گئی۔ اس دوران دشمن نے اردگرد کے علاقے میں کیموفلاج کی ہوئی اپنی طیارہ شکن توپوں سے ان پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔

ہمارے بہادر پائیلٹوں کا حال یہ تھا کہ ان کے پروں کے نیچے بھی زندگی اور موت کا معرکہ لڑا جا رہا تھا اور دشمن مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب وہ گھیرے میں آ چکا تھا۔ ٹائیگرز کے گھیرے میں----!

اور بسااوقات موت کے چنگل میں پھنس جانے والے بزدل گیدڑوں کو بھی موت کا خوف دلیر بنا دیا کرتا ہے۔

دوسری طرف ان شہبازوں کے سروں پر دشمن کی توپیں آگ برسا رہی تھیں۔ کمانڈوز کو یہ بات ذہن نشین کروا دی گئی تھی کہ یہ آپریشن Intact ہو گا اور انہیں اتنا تیز ایکشن کرنا ہے کہ دشمن کو سنبھل کر ڈائنامیٹ کے ذریعے پل اڑانے کا موقع بھی نہ مل سکے۔

اس بات نے انہیں اور سرگرم عمل کر دیا تھا۔ ان کے بازوؤں میں گویا بجلیاں بھر گئی تھیں۔ وہ رعد کی طرح کڑکتے ہوئے دشمن پر گرے اور اسے خس و خاشاک کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ انہوں نے احکامات کی بجاآوری اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر کی اور دشمن کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کا موقعہ بھی نہ دیا۔

ایوی ایشن کا کردار بھی کسی طرح ان لوگوں سے کم نہیں تھا۔ ہمارے پائیلٹوں نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا زبردست مظاہرہ کیا اور دشمن کی فائرنگ کے باوجود وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر کمانڈوز کو نہ صرف وہاں لے جاتے بلکہ برستی آگ میں دشمن کے عین سر پر لینڈ بھی کرواتے تھے۔

آپ کو شاید حیرانی ہو کہ اس معرکے میں ہمارے صرف تین جوان زخمی ہوئے اور ایک نے جام شہادت نوش کیا جب کہ دشمن کے پینتیس آدمی مارے گئے اور قریباً" سو گرفتار ہو گئے۔

کمانڈوز نے تیز لیکن مختصر لڑائی کے بعد بالآخر یہ آپریشن مکمل کر لیا اور پل دوبارہ



ہمارے قبضے میں واپس آ گیا۔ یہ پل جنگ کے آخری ایام تک پھر ہمارے ہی قبضے میں رہا۔ معرکہ کرب و بلا ختم کر کے جب میں ڈھاکہ لوٹ رہا تھا تو ایک لمحے کے لیے سہی دل میں امید ضرور جاگزیں ہونے لگی تھی کہ ان مجاہدوں کے دم قدم کے صدقے ہی شاید اللہ تعالیٰ ہماری ملت کے گناہوں کو معاف فرما دیں۔

انسان بسااوقات کتنا خوش فہم ہو جاتا ہے۔



ڈھاکہ لوٹا تو معظم نے بتایا کہ اب یہاں مغربی پاکستان کے شہریوں کی زندگی بالکل غیر محفوظ ہو کر رہ گئی ہے۔ خواہ وہ سویلین ہوں یا سرکاری ملازمین۔ پاکستان کی پولیس کے آفیسر اب پولیس لائنز تک ہی محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

صورت حال ایسی تھی کہ اگر ہم چاہتے بھی تو عظمیٰ کو یہاں سے نکال نہیں سکتے تھے کیونکہ عملاً اب مشرقی پاکستان محصور ہو چکا تھا۔

دریائی راستے محفوظ تھے نہ فضائی راستے۔

زمینی راستوں سے تو بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اپنی خدمات کے سلسلے میں اکثر ڈھاکہ سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ ہفتوں ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کبھی کبھی خصوصی سہولیات کے تحت معظم سے وائرلیس کے ذریعے بات ہو جاتی اور ان لوگوں کی خیرخیریت کی خبر بھی مل جاتی۔ ایسی ہر گفتگو پر وہ مجھے ایک بات ضرور کہا کرتا تھا کہ اگر عظمیٰ کا ساتھ نہ ہوتا تو اس کا مورال بالکل ہی ختم ہو چکا تھا۔ وہ مجھے بتایا کرتا تھا کہ عظمیٰ نے مایوس ہونا تو سیکھا ہی نہیں۔

اکتوبر کے آخری ہفتے تک حالات ایسے ہو چکے تھے کہ ہم عملاً محصور ہو کر رہ گئے۔ مجھے ہی کیا پاکستان آرمی کے ہر آفیسر کو احساس تھا کہ ہم اس جنگ کو طوالت دے سکتے تھے' لیکن جب تک باہر سے امداد نہ آئے دشمن پر فتح حاصل کرنا ممکن نہیں---- اس کی چند وجوہات تھیں۔

ایک وجہ تو مغربی پاکستان سے آنے والے فوجیوں میں سے بیشتر کی اس علاقے' ماحول اور یہاں کے موسم سے ناواقفیت تھی۔

دوسری بڑی وجہ یہاں کے دریائی اور جنگلی راستے تھے جو ہمارے لیے اجنبی اور بالکل غیر محفوظ تھے جب کہ دشمن کے لیے بہترین پناہ گاہ اور گھات لگانے کا موقعہ فراہم کرتے تھے۔

اور میں---!

پاکستانی فوج کا ایک سپاہی آج نارائن گنج کے دریائی راستے پر سفر کرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اتنی قربانی کیا ہمارے بزرگوں نے آج ہی کے دن کے لیے دی تھی؟ کیا ہم نے دوبارہ سلہٹ کو' نارائن گنج کو' بھراب بازار کو' ڈھاکہ کو دشمن کے پاؤں تلے روند ڈالنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا---! تب مجھے علم نہیں تھا کہ تاریخ کا وہ دور رقم کرنے والوں میں کتنے زندہ تھے؟

کتنے مر گئے تھے؟

لیکن---!

میرے دل سے دعا نکلتی تھی کہ جو لوگ اس عہد کے زندہ ہیں وہ آج ضرور مر جائیں ورنہ انہیں کچھ عرصہ بعد بہت ذلت کی موت نصیب ہونے والی تھی۔ جب وہ زمین ان کے لیے اجنبی ٹھہرنے والی تھی جس کے لیے انہوں نے اپنی عزتیں' اپنے منصب' اپنا جاہ و مال سب کچھ لٹا دیا تھا۔

تب وہ کیسے جی سکیں گے؟

لیکن---!

میں سمجھتا ہوں شاید تب میرا شعور پختگی کے مراحل طے پا رہا تھا۔ تب شاید مجھے یہ علم نہیں تھا کہ زندہ رہنا ایک علیحدہ عمل ہے۔ زندگی کبھی کبھی سزا کی طرح بھی کاٹنا ہوتی ہے۔ جب انسانوں کے لیے زندگی سزا بن جائے تب ان کے پاس سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اس خدائی فیصلے پر صاد کر دیں۔

اس پر آمنا" صدقنا" کہہ کر اسے قبول کر لیں۔

تب تک میں نے شاید دشمن کی قید نہیں دیکھی تھی۔

ذلت کا گہرا داغ ابھی میرے دل پر نہیں لگا تھا۔

ابھی میرے ماتھے پر لعنت کی وہ مہر ثبت نہیں ہوئی تھی جس پر نظر پڑتے ہی دیکھنے والا "تف" کہہ کر پرے ہٹ جاتا ہے۔

آج میں سوچتا ہوں جب ہم اتنی ذلت کی زندگی جی رہے تھے تو وہ لوگ کیسے مر جاتے؟

وہ تو ہم سے بہرحال بہتر تھے---!!



شام تک ہمارا یہ مختصر سا قافلہ بھیراب بازار پہنچ گیا۔



بھیراب بازار دریائے میگنا کے کنارے پر واقع ایک چھوٹا سا' لیکن تجارتی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ یہاں دریائے میگنا پر وہ پل بھی موجود ہے جسے بعد میں دوران جنگ اڑا دیا گیا تھا۔ یہ پل ڈھاکہ اور کومیلا کو بذریعہ ریل ملاتا تھا۔ یہاں ہمارا پہلا قیام--- ایک رات رہا اور اگلے روز دوپہر تک ہم شہر پور گھاٹ پہنچ گئے' جہاں آرمی کے ٹرک ہمارے منتظر تھے جنہوں نے ہمیں سلہٹ پہنچا دیا۔

رات کے دوسرے پہر ہم "آپریشنل ایریا" میں پہنچ گئے۔



جنگی اصول و ضوابط کے مطابق ایک کمپنی کو ڈیڑھ ہزار گز علاقے کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے---!

لیکن---!

میری کمپنی کو یہاں تین مربع میل علاقے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں اور اس صورت حال کا سامنا باقی کمپنی کمانڈروں کو بھی تھا۔ ہماری نفری اتنی کم تھی جس سے بمشکل ہی دفاع ہو سکتا۔ حملے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس علاقے میں بارشیں معمول سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے میل پر جھاڑیوں اور دلدل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہم چونکہ علاقے سے مکمل آشنائی نہیں رکھتے تھے' اس لیے بیشتر مقامات پر اچانک ہنگامی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔

ہم معمول کا علاقہ سمجھ کر جب بڑی بڑی جنگلی گھاس میں داخل ہوتے تو اچانک دلدل میں پھنس جاتے۔

علاقہ کٹا پھٹا تھا۔ سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مکتی باہنی نے کسی بھی سڑک کو استعمال کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ چند پل باقی بچے تھے' لیکن ہمارے پاس ان کی حفاظت کرنے کے لیے جوان میسر نہیں آتے تھے۔ یہ ذمہ داریاں رضاکاروں کو سونپ دی گئیں۔ قریباً" تمام پلوں کی حفاظت البدر اور الشمس کر رہے تھے۔

خدا کے ان پراسرار بندوں نے جس کمال جرات اور ہمت سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں' اس پر انہیں جتنا بھی خراج عقیدت پیش کیا جائے' کم ہے۔

اگر کبھی مورخ نے وہ تاریخ بھی لکھی جو مجھ ایسوں کے سینوں میں رقم ہے تو دنیا ان گمنام غازیوں اور شہیدوں کے کارناموں پر عش عش کر اٹھے گی۔ سلہٹ سے شمال مغرب کی

طرف قریباً" پچاس میل کے فاصلے پر چھاتک نامی ایک شہر واقع ہے جہاں ان دنوں مشرقی پاکستان کی واحد سیمنٹ فیکٹری بھی قائم تھی۔ یہ فیکٹری دریائے سُرما کے دائیں کنارے اور شہر بائیں کنارے پر آباد ہے۔

یہاں سے سرحد بمشکل چھ میل دور واقع ہے----!

ہماری آمد سے پہلے اس فیکٹری اور سرحد تک کے سارے علاقے کی حفاظت ان ہی جانباز رضاکاروں اور سکاؤٹس کے سپرد تھی۔ ہماری آمد سے قبل بھارتی فوج کے ساتھ جھڑپیں ان کا روزانہ کا معمول بن چکی تھیں۔ بھارتی فوجی ان مجاہدوں کو تربیت یافتہ فوج نہ جانتے ہوئے متعدد مرتبہ ان پر حملہ آور ہو چکے تھے۔

دراصل ان دنوں بھارت نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کوشش شروع کر دی تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ اس علاقے کے کچھ حصے پر قبضہ کر کے یہاں بنگلہ دیش کی نام نہاد حکومت قائم کر دے۔

یہ الگ بات کہ ہر دفعہ عزم و استقامت کی ان ناقابل تسخیر چٹانوں سے ٹکرا کر اس کے مذموم مقاصد پاش پاش ہو جاتے۔

ہماری آمد کے اگلے ہی روز میری کمپنی کو دشمن کی طرف سے پہلے باقاعدہ حملے کا سامنا کرنا پڑا۔ دشمن نے زبردست گولہ باری کی آڑ میں اپنے کچھ پیدل دستوں کے جلو میں مکتی باہنی کو قربانی کے بکرے بنا کر آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اس علاقے میں آگے بڑھ کر کسی نہ کسی طرح چھاتک پر قبضہ کر لیا جائے۔

لیکن----!

علی الصبح دشمن کی طرف سے ہونے والے اس حملے کو ہم نے اس کے مذموم مقاصد سمیت اس کی سرحدوں میں سہ پہر تک دفن کر دیا تھا۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے دشمن تین روز تک ہم پر حملے کرتا رہا' لیکن اس نے ہر دفعہ منہ کی کھائی' پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ اب اس نے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کر لی تھی جس کا فائدہ میں نے اٹھایا اور اگلی ہی رات سے ہماری نائٹ پٹرول پارٹیوں نے دشمن کی صفوں میں اس کے علاقے میں کھلبلی مچانا شروع کر دی تھی۔

یہ انتہائی اقدام تھا جو میں اللہ کی مدد اور اپنے جوانوں کی قوت ایمان کے بل بوتے پر اٹھا چکا تھا۔

اصولی طور پر میں ایسا کرنے کا مجاز نہیں تھا۔



میری پاس تو اپنے علاقے کی حفاظت کے لیے بھی جوان میسر نہیں تھے' لیکن تب میں نے---- "جارحیت بہترین دفاع ہے" کی حکمت عملی اپنائی۔ اس طرح میں نے اپنی دانست میں دوہرے مقاصد حاصل کر لیے تھے۔

ایک طرف تو ہمارے جوانوں اور رضاکاروں کا مورال بڑھنے لگا تھا اور دوسری طرف دشمن کی صفوں میں مسلسل کھلبلی پھیل رہی تھی۔ عموماً" ایسی ہر مہم کی کمانڈ میں خود ہی کیا کرتا تھا اور اپنی معاونت کے لیے رضاکاروں کا مختصر سا گروپ جس میں تین تا پانچ البدر ہوا کرتے' اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

یہ لوگ ایک تو مقامی علاقے اور راستوں سے واقفیت رکھتے تھے' دوسری وجہ ان کی غیرت ایمانی اور بہادری تھی۔

میرا ایمان تھا کہ یہ ہمیں کبھی اکیلا چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے۔

شوق شہادت کا یہ عالم تھا کہ گویا ان کے درمیان شہادت کے حصول پر ٹھن گئی ہو۔ ہر کوئی دوسرے سے پہلے اس مقام کی فضیلت پر فائز ہونے کو بے چین اور بے قرار تھا۔ جہاں کہیں حملے میں شدت پیدا ہوتی' یہ مجاہد دیوانہ وار اس میں کود پڑتے اور جب تک دشمن خاموش نہ ہو جاتا' ان کے قدم واپس نہ پلٹتے۔ ان گمنام سرفروشوں نے قدم قدم پر ہمارے جوانوں کے لیے عزم و عمل کی مثالیں قائم کیں۔

ہماری اس حکمت عملی اور دلیری نے دشمن کو اس محاذ پر کبھی سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے سر اٹھانے سے پہلے ہی ہم نے اس کے سر کو کچل کر رکھ دیا۔ کاش ہماری ہائی کمان بھی "دفاع" کے بجائے "جارحیت" کو اپنا مقصود ٹھہراتی' ہم اس ذلت سے بچ جانے میں کامیاب ہو جاتے۔



۲۱ نومبر کو عید تھی----!

ہم نے یہ عید مقامی محب وطن بنگالی آبادی کے ساتھ محاذ پر ادا کی۔ اس روز جب ہم سب اکٹھے ہاتھ اٹھا اٹھا کر رو رو کر خدا کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے تو نجانے میں ایسا کیوں محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں سے صرف نظر فرما لیں گے۔

افسوس یہ میری سوچ ہی تھی----!

۲۱ نومبر کی شام کو ہی دشمن نے ایک بریگیڈ کی قوت کے ساتھ ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اچانک اور خلاف توقع تو نہیں تھا' لیکن ہم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ دشمن اتنی زیادہ قوت کے ساتھ کبھی ہم پر حملہ آور ہو گا کیونکہ ابھی تک باقاعدہ جنگ کا اعلان بھارت یا پاکستان کی طرف سے کسی ملک نے بھی نہیں کیا تھا۔

ہم نے تین دن جان توڑ لڑائی لڑی اور متعدد شہادتوں کے بعد حملے کا زور توڑ دیا۔

لیکن۔۔۔۔!

شہادت اتنی زیادہ تھی کہ دوبارہ اپنی بکھری ہوئی پوزیشنوں کو سنبھالنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں حکم مل گیا کہ دریائے سرما پر لوٹ آئیں۔۔۔۔!

چھاتک میں ہماری جگہ دوسری کمپنی نے لے لی تھی کیونکہ میرے بیشتر جوان شہید یا زخمی تھے۔ میں نے سب سے پہلے شہیدوں کو سلہٹ میں دفن کرنے کے انتظامات کیے اس کے بعد اپنی پوسٹ پر لوٹ آیا۔

لڑائی مسلسل جاری تھی۔۔۔۔!

اس کے بعد ۱۷ دسمبر تک ہمیں ایک پل بھی سکون میسر نہ آ سکا۔۔۔۔! دشمن ہر روز نئے زوروشور کے ساتھ حملہ آور ہوتا۔

اس کا ہر حملہ گزشتہ حملے سے زیادہ قوت کے ساتھ ہوتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اپنی ساری فوج کو مروانے کے بعد بھی سلہٹ پر بہرصورت قبضے کا عزم کر چکا ہے۔

دشمن کا نقصان ہمارے مقابلے میں کم از کم پچاس گنا زیادہ تھا' لیکن۔۔۔۔!

اس کے پاس تو "مکتی باہنی" کی صورت قربانی کے بکرے موجود تھے جنہیں وہ ہراول دستوں میں جھونک کر جنگ کا ایندھن بناتا رہا۔ ہمارے پاس کیا تھا۔

میرے جوان ایک ایک کر کے مجھ سے رخصت ہو رہے تھے۔۔۔۔!

شہادتیں بڑھ رہی تھیں۔۔۔۔!

سازشیں بڑھ رہی تھیں۔۔۔۔!

دشمن کا زور بڑھ رہا تھا۔۔۔۔!

دلدلی موسم کی عذابناکیوں نے ہمارا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

جوان شدید بخار اور کمزوری کی حالت میں مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔

اب تو صورت حال اتنی بگڑ چکی تھی کہ ہمارے پاس زخموں پر رکھنے کے لیے مرہم پٹیاں



بھی باقی نہیں بچی تھیں۔

شدید زخمیوں کو لے جانے کے لیے اس طرف ہیلی کاپٹر کی آمد بھی دشمن نے ناممکن بنا دی تھی۔ ہماری مدد کو آنے والے ہر راستے پر مکتی باہنی کے بھیڑیے اپنے بھارتی درندے آقاؤں کے ساتھ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہر قابل ذکر پل کو یا تو تباہ کر دیا تھا یا پھر اس پر قابض ہو گئے تھے۔

ان لوگوں نے ملحقہ دیہاتوں میں پاکستان کی حمایت کرنے والے بے گناہوں کو اس طرح چن چن کر اور اذیتیں دے دے کر شہید کیا تھا کہ اب کوئی مقامی مسلمان خوف کے مارے ہماری مدد کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔۔۔۔!

راشن کے محفوظ ذخائر ختم ہو رہے تھے۔۔۔۔!

رسد کے راستے مسدود تھے۔۔۔۔!

گولہ بارود نہ ہونے کے برابر تھا۔۔۔۔!

نفری روز بروز کم پڑتی جا رہی تھی۔



دسمبر کے آغاز میں تو یہ نوبت آ گئی تھی کہ مورچوں میں نصب گنوں پر ہمارے قریباً تمام کنروہ تھے جو زخموں سے چور چور ہونے کے سبب کسی نقل و حرکت کے قابل نہیں رہ گئے تھے اور بمشکل اپنی جگہ بیٹھ کر صرف احکامات ملنے پر گن کا ٹریگر ہی دبا سکتے تھے۔

یکم دسمبر کو مجھے ڈویژن ہیڈکوارٹر سے ایک "ذاتی پیغام" موصول ہوا۔

بمشکل ایک ہیلی کاپٹر یہاں تک زخمیوں کو لینے آیا تھا۔ اس میڈیکل کور کے دو ڈاکٹر اور کچھ جان بچانے والی دوائیاں تھیں یا پھر ہمارے ذاتی خطوط۔ یہ خط مجھے معظم نے لکھا تھا:

"پیارے شیرافگن!

صورت حال روز بروز سنگین تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مجھے تمہارے محاذ کی تو خبر نہیں، لیکن اگر یہاں کوئی عقل کا اندھا نہیں اور احمقوں کی جنت میں بھی نہیں بیٹھا تو اسے یقین ہو چلا ہے کہ جلد یا بدیر دشمن ہم پر قابض ہو جائے گا۔۔۔۔! کاش تم اندازہ لگا سکتے کہ میں نے کتنا کرب جھیل کر یہ فقرہ لکھا ہے۔

شیرافگن!

ہمیں اپنی بہادر فوج پر اعتماد ہے' لیکن تاریخ کا طالب علم ہونے

کے ناطے میرا یہ ایمان ہے کہ دنیا کی کوئی فوج اپنی توپوں سے اپنے عوام کے دلوں کو مسخر نہیں کر سکتی۔

ہندو کے زہریلے پراپیگنڈے نے ہمارے بھولے بھالے بنگالی بھائیوں کے ذہنوں میں بری طرح گھر کر لیا ہے۔ ساون کے اندھے کی طرح وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھنے پر تل گئے ہیں اور انہیں ہر طرف ہرا ہی ہرا بھائی دیتا ہے۔

مجھے اس وقت کے تصور سے وحشت ہو رہی ہے جب وہ اس خواب غفلت سے بیدار ہوں گے تو کیا کریہہ منظر ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہو گا۔ شاید وہ اس کی تاب بھی نہ لا سکیں۔ مجھے یہی دکھائی پڑتا ہے جیسے مکافات عمل یہاں کسی بھی لمحے وقوع پذیر ہو کر رہے گا۔ جو قوم اپنے اسلاف کی قربانیوں کو صرف ۲۴ سال ہی میں بھلانے پر تل جائے' عذاب اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

قدرت نے ہمیں بہت مہلت دی' لیکن افسوس ہم نے خواب خرگوش سے کبھی بیدار ہی نہیں ہونا چاہا۔ ہم نے قانون فطرت کو بھلا دیا مگر وقت کسی قوم کو بار بار سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیا کرتا۔

ڈھاکہ میں صورت حال بہت اذیت ناک ہے۔ ہم لوگ عملاً محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ عظمیٰ میرے ساتھ رہتی ہے۔ اگر خدانخواستہ برا وقت آ ہی گیا ہے تو میں صرف تمہیں یہ یقین دہانی کروا سکتا ہوں کہ پہلے میں اپنی جان سے گزروں گا اس کے بعد شاید عظمیٰ کی باری آئے گی۔

تم جانتے ہو ہمارا تعلق جس نسل سے ہے' وہ ہتھیار نہیں ڈالا کرتی۔ اگر کبھی یہ نوبت آئی تو میں زندہ گرفتاری دے کر اپنے شہید باپ کی روح کے سامنے شرمسار نہیں ہوں گا۔ میں عظمیٰ کے ساتھ نیپال کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اس کو کلکتہ کے متعلق خاصی معلومات ہیں جہاں سے ہمیں مدد میسر آ سکتی ہے۔ گو کہ ان حالات میں سوائے خدا کی ذات کے اور کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا' لیکن میرا دل اب بھی گواہی دے رہا ہے کہ میرے پولیس کے بنگالی ساتھیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ہمیں مشرقی پاکستان کی سرحد



انشاء اللہ بحفاظت پار کروا دیں گے۔ جہاں سے ہم گورکھپور کا راستہ اختیار کریں گے۔

شیر افگن!

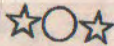
تم ایک بہادر باپ کے بیٹے ہو۔ کمانڈو ہو۔ تمہارے لیے کوئی صورت حال غیر معمولی نہیں ہونی چاہیے۔ جب میدان جنگ میں اترو تو اپنے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی عظمیٰ کے متعلق ملال نہ لانا۔

دشمن کو گرفتاری نہ دینا۔ ایسا ناگزیر ہو جائے تو فرار ہو جانا۔ بہرصورت فرار ہو کر نیپال پہنچنے کی کوشش کرنا۔ ادھر سے سرحد پار کرنا آسان ہے' بھارتی پنجاب یا مقبوضہ کشمیر سے شاید اتنا آسان نہ ہو۔

فی الحال میرے ذہن میں اور کوئی بات نہیں آ رہی۔ وقت بھی کم ہے۔ زندہ رہے تو انشاء اللہ ضرور ملیں گے۔ خدا حافظ۔

تمہارا بھائی

معظم شاہ



معظم کے خط کی ایک ایک سطر مجھے اپنے دل کی گہرائیوں میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ نجانے کیوں آج پہلی مرتبہ اس نازک صورت حال پر میرا دل بھر آیا۔ میری آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔

اپنی بے بسی کا احساس مجھے آج بہت زیادہ شدت سے ہونے لگا تھا۔

میں نے سوچا۔

معظم سچ کہتا ہے۔ تاریخ کا دھارا اپنے رخ چلتا ہے۔ اپنے مزاج کے مطابق۔ قانون کی فطرت اٹل ہے۔ ہماری بداعمالیوں کے سبب شاید ہم پر در توبہ بند ہو چکا ہے۔

شاید ہم نے وہ "حد" عبور کر لی ہے جو "اتمام حجت" کے لیے ضروری ٹھہرتی ہے۔

بس اب کسی بھی لمحے' کسی بھی دم ---- قدرت کا فیصلہ آیا کہ آیا۔

تب بھی میرے دل میں دور دور تک یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ہم اتنی ہولناک اور ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوں گے۔

میں نے سوچا زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ہمیں دشمن کی شرائط پر جنگ بند کرنا ہو گی۔
دشمن بین الاقوامی سطح پر ہمیں رسوا کر کے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر لے گا۔
یہ تو میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ اتنی ذلت آمیز ہزیمت ہمارا مقدر بننے والی تھی۔

# جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

۱۴ دسمبر تک ہمارے دو بریگیڈ مولوی بازار اور جنتاپور کے اطراف سے پسپائی اختیار کر کے سلہٹ میں ملاپ کر چکے تھے۔ اس سے پہلے دشمن نے سلہٹ میں کمانڈوز کی ایک مکمل بٹالین اتار دی تھی جسے حسب توقع اس کے فریب خوردہ غدار بنگالی چور راستوں سے گھماتے محفوظ ٹھکانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

دشمن نے اپنی روایتی مکاری اور مسلمان کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کمانڈوز کی بٹالین کو Built-Up Area میں اتارا تھا۔ جہاں ہمارے لیے کارروائی کرنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔

بھارتی سورماؤں نے رہائشی مکانات میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور وہاں کے مکینوں کو اپنی آڑ بنا لیا تھا۔

ہمارے دونوں بریگیڈ شہر سے باہر چائے کے باغات میں ڈیپلائے تھے۔ خدا ہی بہت جانتا ہے اس میں کیا حکمت عملی پوشیدہ تھی۔

اب صورت حال یوں تھی کہ ہمارے چاروں اطراف دشمن تھا اور ہم چائے کے باغات میں مورچہ بند ہو کر بیٹھے تھے۔ مقامی کمانڈر کی طرف سے "آخری جوان آخری گولی" کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ مجھے دیگر محاذوں کا تو علم نہیں، لیکن یہاں صورت حال بہرحال ایسی نہیں تھی کہ ہم ہتھیار ڈالتے۔ ہم نے مرجانے یا مار دینے کا تہیہ کر کے مورچے سنبھالے تھے اور بزدل دشمن کو بھی یہی پیغام دیا تھا کہ بے گناہ شہریوں کو جنگ کا ایندھن بنانے کے بجائے میدان میں نکل کر ــــ دو دو ہاتھ کر لے۔

ہم کیا سوچ رہے تھے؟
تقدیر کیا چال چل رہی تھی؟
ہمارے کمانڈروں کی سوچ کیا تھی؟
بین الاقوامی شاطر اپنے مہرے کیسے کھیل رہے تھے؟

بہت سی باتیں تھیں----!
بہت سے حقائق تھے----!
فوجی کا جذبہ شہادت، فوج کی بے مثال جرات، منصوبہ بندیاں، قربانیاں کس کس ڈھنگ سے----!
کس کس اسلوب سے----!
سیاست کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ اس کی یوں تو بہت سی مثالیں تاریخ عالم میں محفوظ ہوں گی۔
لیکن----!
جس بہیمانہ اور ظالمانہ بے رحمی سے پاکستانی افواج کی شہادتوں کو سیاست کی بھینٹ چڑھایا گیا۔ تاریخ کے بدترین دور میں بھی شاید کوئی ایسی مثال نہ ملتی ہو۔
ہمارے مورچوں میں موجود ٹرانسسٹروں اور ٹرانسمیٹروں پر گزشتہ تین چار روز سے ایک ہی پکار سنائی دے رہی تھی۔
ہتھیار ڈال دو۔
تمہیں مکمل تحفظ دیا جائے گا۔
تمہیں جنگی قیدیوں کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔
ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔
بصورت دیگر تمہارے بیوی بچے مکتی باہنی کی درندگی کا شکار بن جائیں گے، ابھی تک معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔
اگر مکتی باہنی کے ہاتھ میں چلا گیا تو........
ایسی بہت سی دھمکیاں، بہت سے لالچ، ترغیب، تحریص۔
غرض ہر اوچھا ہتھکنڈہ دشمن استعمال کر رہا تھا۔
لیکن----!
ہمارے کانوں پر کبھی جوں نہیں رینگی تھی۔
ہم نے تو مارنے یا مرجانے کا عہد کر رکھا تھا۔
اور----!
ہم اس عہد کی پاسداری کی روایت رکھتے ہیں۔ یہ روایت تیرہ سو سال سے ہمیں نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی آئی تھی۔



لیکن----!
اس مرتبہ روائتوں کے امین غدار نکلے۔
دل ہار گئے کم بخت۔
مار ڈالا انہوں نے ہمیں۔
۱۶ دسمبر کو جب ہم سلہٹ میں زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے تھے تو پاکستان کی ایسٹرن کمانڈ ڈھاکہ کے آفیسرز میس میں دشمن کے افسروں کے استقبال کے لیے "فال ان" ہو رہی تھی۔
لعنت کا طوق ہمارے گلے میں زبردستی ڈالا جا رہا تھا۔
ہمیں ذلت کی زہریلی گولی نگلنے پر مجبور کر دیا گیا۔
ہم جی سکتے تھے، نہ مر سکتے تھے۔



۱۷ دسمبر کی صبح جب ڈویژنل ہیڈکوارٹر سے ہمیں ہتھیار ڈالنے کا حکم موصول ہوا تو سب سے پہلے جس احساس نے ہمیں جکڑا، وہ نامردی کا نامراد احساس تھا۔ ہم نے جانا گویا ہم مردانہ صفات سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔
کسی سپاہی کے لیے اپنا ہتھیار جیتے جی دشمن کے قدموں میں ڈال دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنی غیرت کو بازو پکڑ کر غیر کے ہاتھ میں دے دے۔
کون تھے وہ مکروہ چہرہ لوگ---- جو نقاب اوڑھ کر ہماری صفوں میں گھس آئے تھے؟
یہ گروہ منافقین و منکرین کہاں سے مسلط ہو گیا تھا ہم پر----؟
ان سوالات کے جوابات آج بھی اتنے تشنہ ہیں جتنے کل تھے۔



میرے ساتھ مورچے میں میرا جی سی او موجود تھا۔
"گلستان! لڑائی ختم ہو گئی۔" میں نے بمشکل اسے کہا۔
"دشمن پسپا ہو گیا سر۔"
اس نے اپنی دونوں ایڑیوں پر تن کر کہا۔
میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
"فوجی صرف احکامات کی تعمیل کرتا ہے حوالدار صاحب----!" میرا گلا رندھ گیا۔

"نو سر----!" جانے اس نے کیسے یہ دو لفظ ادا کیے ہوں گے۔

میں نے کچھ کہا نہیں، صرف گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"سر! معافی چاہتا ہوں۔ سر! لیکن پاک آرمی کا حوالدار گلستان خان جیتے جی دشمن کو اپنا ہتھیار نہیں سونپے گا۔ میں تو ایک باوقار اور مسلمان فوج کا سپاہی ہوں۔ سر! میری تو بات ہی اور ہے---- ادھر جن پہاڑوں پر ہم رہے ہیں سر وہاں تو لوگ آپس کی دشمنی میں جیتے جی اپنوں کے سامنے ہتھیار نہیں پھینکتے---- یہ تو ہمارا دشمن ہے۔ کافر ہے---- ہم مار دیتے ہیں۔ مرجاتے ہیں یا معاف کر دیتے ہیں۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں سر----!"

خدا جانے وہ ان پڑھ سا حوالدار کیا کیا کہتا رہا۔ اس کے منہ سے نکلے الفاظ ایل ایم جی کی گولیوں کی طرح میرا کلیجہ چھلنی کرتے رہے۔ میں پتھر کا بت بنا اس کے منہ کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

میں نے تو تب بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی جب وہ مورچے سے اپنی گن اٹھا کر باہر کو لپکا۔

اس کے منہ سے حالت غیظ و غضب میں جانے کیا کیا نکل رہا تھا۔ وہ اپنی روایات کی توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

بہت غیرت مند تھا وہ----!

ایسا ہی ہونا چاہیے ہر کمانڈو کو----!

اس نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر نہیں دیکھا نہ ہی میری طرف، نہ اپنی پوزیشنوں کی طرف۔ اس کے دل میں ایک لمحے کو اپنی بوڑھی ماں، اپنی بیوی، دو معصوم بچوں کا خیال نہیں آیا۔

اس نے نہیں سوچا کہ وہ بیوہ ماں کا بیٹا ہے----!

اپنے وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھا تھا جہاں سے اس کی لاش بھی اس کے بیوی بچوں کو نہیں مل سکے گی۔

اس نے اپنی اور دشمن کی نفری کا خیال نہیں کیا۔

اس نے یہ نہیں دیکھا کہ سیاسی حالت کیا ہیں؟ فوجی حالت کیا ہیں؟

اس نے صرف یہ سوچا کہ وہ پاکستانی فوج کا سپاہی ہے۔

اس کا ہتھیار سلامت ہے۔

اس کے ہاتھ سلامت ہیں۔



وہ ہوش و حواس کے ساتھ جنگ جاری رکھ سکتا ہے۔

جنگ جاری ہے۔

پھر وہ ہتھیار کیوں ڈالے؟

جنرل نیازی نے ڈھاکہ کے ریس کورس میدان میں بیٹھ کر جس جنگ کو ذلت، ہزیمت اور شکست خوردگی کے احساس سے ختم کر دیا تھا، وہ جنگ اس کی فوج کے ایک معمولی سے جے سی او کے نزدیک ابھی جاری تھی۔

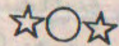
اس خدا کے برگزیدہ بندے نے اس جنگ کو زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھا، وہ دشمن کو للکارتا ہوا اپنے مورچے سے نکلا اور اس کی سمت گولیاں برساتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

لیکن کہاں تک----؟

کہاں تک جا سکتا تھا وہ----؟

بالآخر اس پر گولیوں کا مینہ برسنے لگا اور اس کی آواز بند ہو گئی۔

ہم دشمن کے قیدی بننے کی تیاری کر رہے تھے اور حوالدار گلستان خان نے ایک ہی لمحے میں آزادی حاصل کر لی تھی۔



میں اپنے ساتھیوں سمیت بے بسی سے اس کی شہادت کا منظر دیکھتا رہا۔

خدا جانے اس لمحے مجھے طیش کیوں نہیں آیا؟

میرا خون کیوں نہ کھولا؟

شاید احساس ذلت نے مجھے جیتے جی مار ڈالا تھا۔ شاید وہ کوئی اور کیپٹن شیر افگن تھا جس نے اپنے ہولسٹر سے پستول نکال کر اس ڈھیر پر پھینکا تھا جس کے گرد بھارتی فوجی نیم دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔

یہ ڈھیر ہمارے ہتھیاروں کا تھا جو اونچا ہی اونچا ہوتا جا رہا تھا۔

اور ہم----!

بونے ہو کر رہ گئے تھے۔

ہمارے قد و قامت ہماری نظروں میں ہیچ تھے۔ ہم اپنی مردانگی پر لعنت ڈال رہے تھے۔

اندر ہی اندر اپنا ماتم کر رہے تھے۔

وہ قدم ہمارے نہیں تھے جن پر چل کر ہم سلہٹ کے کالج میں پہنچے تھے۔ وہ ہاتھ ہمارے نہیں' وہ جسم ہمارے نہیں تھے جن پر خالی وردیاں سجی ہوئی تھیں۔

وہ چہرے ہمارے نہیں تھے جن پر دشمن نے "پی او ڈبلیو" کے سیاہ نشان لگا کر ان کی ہیئت بدل کر رکھ دی تھی۔

سلہٹ کالج کی گراؤنڈ کے ایک کونے میں آنسو بہاتے کیپٹن اقبال چوہدری نے مجھے کہا۔

"ہم تو بے چہرہ ہو گئے یار۔ معلوم نہیں اپنی شکل بھی وہ رہی ہے یا نہیں؟"

تین روز تک خوف کے مارے کیپٹن چوہدری نے آئینہ نہیں دیکھا۔ وہ اپنے موجودہ چہرے کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے موجودہ چہرے کے ساتھ وہ اپنا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

اس لمحے ہمیں بھارتی فوج یا مکتی باہنی سے نہیں' خود سے ڈر لگ رہا تھا۔

گھن آنے لگی تھی ہمیں اپنے آپ سے؟

جو ہو گیا تھا---- وہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

لیکن----!

جو کچھ بھی ہوا' اتنی سرعت سے اور یوں پلک جھپکتے ہی ہو گیا کہ کسی کو سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نصیب نہ ہو سکی۔

مجھے یاد آ گیا۔ ۶۵ء میں جب میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا پہلا آپریشن شروع کیا تھا تو بھی ہم گھیرے میں آ گئے تھے' دشمن کی زمین پر۔ اس کے خونیں جبڑوں کے درمیان۔

تب کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ہتھیار ڈال دینا بھی ایک عمل ہے۔

آپریشن جبرالٹر میں زندہ بچ رہنے والوں کو خوش قسمت سمجھا جاتا تھا کیونکہ زندہ بچ کر اپنے ملک پہنچنے والے اتنی کم تعداد میں تھے اور ایسے حالات سے بچ کر نکلے تھے---- جن کا تصور تو کیا جا سکتا تھا' عملاً بظاہر ممکن نہیں تھا۔

کمانڈوز میں انہیں قسمت کے دھنی سمجھا جاتا تھا۔

لیکن----!

آج سلہٹ کالج کے سبزہ زار پر اپنے جسم پر خاکی وردی سجائے---- میں خود کو دنیا کا بدقسمت ترین انسان گردانتا تھا۔

مجھے آج اپنے شہید ساتھی ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کتنے خوش قسمت تھے وہ سب کہ اس روز بد کو دیکھنے کے لیے آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔





ایس ایس جی کے جوانوں کو بھارتیوں نے تیسرے ہی روز الگ کر کے سلہٹ کے مڈل سکول میں منتقل کر دیا تھا۔ شاید دشمن ہمارے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنے جا رہا تھا۔

ہم جب یہاں پہنچے تو بہت سے افسران کو اپنا منتظر پایا۔ یہاں کچھ سویلین بھی جان بچا کر پہنچ گئے تھے۔ ان لوگوں کی زبانی علم ہوا کہ مکتی باہنی کے درندوں نے مقامی سویلین آبادی کے ساتھ کتنا بہیمانہ سلوک کیا ہے۔ سلہٹ کو ان خون آشام بھیڑیوں نے رومن اکھاڑے میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا جہاں بے گناہ بنگالیوں کو جن میں عورتیں' بچے' بوڑھے' جوان سب ہی شامل تھے' دونوں ہاتھ باندھ کر لایا جاتا۔ ان لوگوں کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ "پاکستانی" تھے اور آخری وقت تک پاکستان کے وفادار رہے۔

لیکن----!

درندوں کے نزدیک یہی ناقابل معافی گناہ تھا۔

عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی گئی---- انہیں کوڑیوں کے مول دلالوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ یہ عورتیں کوئی غیر نہیں تھیں۔ ان کی اپنی مائیں' بہنیں اور بیٹیاں تھیں---- لیکن---- ان بدبختوں کو چانکیہ کے چیلے چانٹوں نے تعصب کا ایسا زہر گھول کر پلایا تھا جس نے ان کے حلق سے نیچے اترتے ہی تمام رشتوں کی پہچان ختم کر دی تھی۔

بچوں کو ان کے والدین کے سامنے ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ بوڑھوں کی زندہ آنکھیں نکالی گئیں----

جوانوں کے اعضاء ایک ایک کر کے کاٹے گئے۔

یہ سب کچھ اس بھارتی فوج کی موجودگی اور سرپرستی میں انجام پا رہا تھا جو یہاں "شانتی شانتی" کی رٹ لگاتے ہوئے نہیں تھکتی تھی۔

جس نے ساری دنیا کے سامنے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان حمایتی عناصر کے جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہے۔

لیکن----!

موقعہ ملتے ہی بزدل دشمن اپنی اصلیت دکھانے پر تل گیا۔ اسے تو اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کو نیچا دکھانے کی توفیق حاصل ہوئی تھی۔ چودہ سو سال سے مسلمانوں کی غلامی کرنے والے بزدلوں کو جب سر اٹھانے کا موقع ملا تو انہوں نے جی بھر کے ارمان

نکالے----!

بے گناہوں کا خون اس بیدردی اور شدت سے بہا کہ سارے بنگلہ دیش کے ندی نالوں کا رنگ بدل گیا۔

اسی سکول میں جب ایک بوڑھا بنگالی پروفیسر مجھے اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کی روداد سنا رہا تھا تو میرے خون کا خمیر بدلنے لگا۔ یہ بوڑھا بے چارہ نجانے کس طرح اکیلا ان ظالموں کے چنگل سے زندہ نکل کر یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے وہ اپنی داستان الم سنا رہا تھا' میرے اندر وہی کمانڈو بیدار ہونے لگا جس کی بظاہر ہتھیار ڈالنے پر موت واقع ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے دل میں خدا سے عہد کیا کہ میں دشمن کے غرور کو اپنے قدموں تلے روندوں گا---- میں اس کی قید سے فرار ہو کر اس کو احساس دلا دوں گا کہ تمام شیر سرکس کے شیر نہیں ہوتے۔

میں تو بالکل پژمردہ اور نڈھال ہو چکا تھا' لیکن اس بوڑھے پاکستانی نے میرے اندر دوبارہ زندگی کی لہر کو جگا دیا تھا۔ میں نے ذہنی طور پر خود کو نارمل محسوس کرتے ہی اپنے آئندہ فرار کے منصوبے پر سوچنا شروع کر دیا۔

یہاں ہمارے ناموں کی لسٹ تیار ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا اگر اب یہاں سے اس سکول کے باہر موجود بھارتی فوج کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکلنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو میرے ساتھیوں کے لیے ابتدا ہی میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ میں نے راستے میں ٹرین سے یا پھر کیمپ سے فرار ہونے کا تہیہ کر لیا اور اس کی تیاری بھی شروع کر دی۔



اپنے آئندہ سفر کے آغاز پر مجھے زاد راہ درکار تھا۔ جس کے لیے میں نے یہاں کیمپ میں موجود بھارتیوں کے ہاتھ اپنی گھڑی فروخت کر دی جس کے خاصے پیسے مل گئے کیونکہ یہ گھڑی ان کے لیے واقعی تحفے سے کم نہیں تھی۔ میرے پاس جتنی پاکستانی کرنسی تھی' وہ بھی اونے پونے بھارتی کرنسی میں تبدیل کر لی۔

پھر اس کرنسی کو میں نے ایسے طریقے سے چھپایا کہ بعد میں تین چار مرتبہ تلاشی کے سخت مراحل سے گزرنے کے باوجود یہ روپے بھارتی سپاہیوں کی دسترس سے محفوظ رہے۔

مڈل سکول میں ہم اپنا لنگر خود ہی تیار کرتے تھے' اپنے زخمیوں کا علاج بھی ہم خود ہی کر



رہے تھے۔

دراصل مڈل سکول یکم دسمبر سے ہسپتال میں تبدیل ہو چکا تھا جہاں ہمارے شدید زخمی ساتھی موجود تھے جنہیں علاج معالجے کی سخت ضرورت تھی اور جو فیلڈ ہسپتالوں تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ان لوگوں کا علاج ہمارے اپنے ڈاکٹر نامکمل ادویات اور سٹاف کی مدد سے رہے تھے۔

یہاں ہمارا قیام پندرہ روز رہا۔ اس دوران میرے علاوہ میرے قریباً" سب ہی ساتھی میرے ساتھ فرار ہونے پر تیار ہو گئے تھے' لیکن ہم سب کا یہی خیال تھا کہ ہم یہاں سے فرار ہو کر شاید زیادہ محفوظ نہ رہ سکیں۔ زیادہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بھارت پہنچنے کے بعد فرار ہوا جائے۔

اس بات کا ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ بھارتی فوج ہمیں مشرقی پاکستان کے کیمپوں میں نہیں رکھے گی کیونکہ تاریخ نے اس قوم کو پہلا موقع مسلمانوں کو ذلیل اور رسوا کرنے کا دیا تھا' اس سے یہ لوگ بہرصورت فائدہ اٹھاتے اور ہمیں اپنے پاس قید رکھ کر اپنی انا کی تسکین کا سامان فراہم کرنا ضروری سمجھتے تھے۔



پندرہ روز بعد شام کو ہمیں بتایا گیا کہ اگلے روز ہمیں روانہ ہونا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھارتی کرنل نے یہ احکامات بھی سنائے کہ ہم کون کون سا سامان اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ اس سامان میں اپنا ذاتی بستر' یونیفارم' ایک پرائیویٹ کپڑوں کا جوڑا اور روزمرہ کی اشیاء شامل تھیں۔

رات کو جب میں بستر پر لیٹا تو آج پہلی مرتبہ عظمیٰ کی یادوں نے رلا دیا۔ بھلایا تو اسے میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں تھا---- میں اسے بھلا ہی نہیں سکتا تھا۔ بس شاید ایک بڑے سانحے کے نیچے چھوٹا غم دب کر رہ گیا تھا۔ عظمیٰ کو میں خدا کی سہارے معظم کی حفاظت میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کے آخری خط سے تو مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے نومبر کے آخری ہفتے ہی میں یہاں سے فرار ہونے کے لیے پر تولنے شروع کر دیئے ہوں گے اور عظمیٰ اس کے ساتھ ہو گی۔

میرے دل سے رہ رہ کر ایک ہی دعا نکلتی تھی کہ خدایا! ان کو اپنی امان میں رکھنا اور کم از کم عظمیٰ کو زندہ مکتی باہنی یا بھارتی فوج کے ہاتھ نہ لگنے دینا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اگر

خدانخواستہ عظمیٰ کو ان لوگوں نے گرفتار کر لیا تو وہ اسے مکتی باہنی کو سونپ دیں گے کیونکہ عظمیٰ مصلحتاً بھی بنگلہ دیش سے وفاداری کا اقرار نہیں کرے گی۔ وہ اپنے ارادے میں اٹل تھی اور جو کہتی کر گزرتی۔

مکتی باہنی کے لوگ اسے پہچاننے کے بعد اس کے ساتھ جو سلوک کرتے' اس کا تصور ہی اتنا اذیت ناک تھا کہ میں نے کبھی سوچنا گوارا نہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ معظم اپنی پولیس تربیت اور مقامی زبان اور ماحول سے قدرے شناسائی کے بل بوتے پر انشاء اللہ اسے اپنے ساتھ ہی نکال کر لے جائے گا۔

ساری رات میں یہ سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا کہ جب نیپال میں میری اور عظمیٰ کی اچانک ملاقات ہو گی تو وہ کیا محسوس کرے گی؟ میرے احساسات کیا ہوں گے اور سب سے بڑھ کر ہمارے مشترکہ محسن معظم کے جذبات کیا ہوں گے؟

شاید اس لمحے اسی سوچ نے میرے عزم کو مزید مہمیز لگائی اور میرے فرار کے ارادے میں اور پختگی پیدا ہو گئی۔



صبح ناشتے کے فوراً بعد بھارتی فوج کی ایک سیکشن ان کے کرنل کی کمان میں اندر گھس آئی۔ ان لوگوں نے باری باری ہمارے سامان کی تلاشی لینا شروع کی اور ہر ضروری شے کو "غیر ضروری" قرار دے کر الگ کر دیا۔ بہرحال بہت سی ضروری چیزیں پھر بھی محفوظ رہیں' جن میں بھارتی کرنسی بھی شامل تھی۔ مجھے اس وقت سب سے زیادہ فکر اسی کی تھی۔

سلہٹ اور آسام کے درمیان موجود قبل از تقسیم کا ریلوے نظام تباہ ہو چکا تھا اور سلہٹ کو بھارت کے صوبہ آسام کے شہر گوہاٹی سے ملانے والی سڑک کے تمام پل بھی ناکارہ ہو چکے تھے۔

بھارتی فوج نے نام نہاد بنگلہ دیش میں داخل ہوتے ہی یہاں کے مکینوں سے جو سلوک شروع کر دیا تھا' اس نے چند روز ہی میں بنگالی قوم پرستوں کو یہ احساس ضرور دلا دیا تھا کہ ان سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ مجھے اس تلخ حقیقت کا ادراک تب ہوا جب ہماری ملاقات سکول کے باہر کھڑے بسوں اور ٹرکوں کے ڈرائیوروں سے ہوئی۔

یہ بسیں ہمیں دریائے سرما تک لے جانے کے لیے استعمال کی جا رہی تھیں۔ جب میرا اردلی میرا سامان ایک بس میں رکھ رہا تھا تو میرے نزدیک کھڑے بنگالی ڈرائیور کی آنکھیں



چھلکنے لگیں۔ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"شاب ہم سے بڑا گلتی (غلطی) ہو گیا۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

میں خاموش رہا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی اس "حرکت" پر غصے کا اظہار کروں یا اسے خوش ہو کر دکھاؤں۔

"تم تو آزاد ہو گئے۔" میں نے طنز کیا۔

"نہیں شاب ہم گلام (غلام) ہو گیا۔ اب ہم کبھی آزاد نہیں ہوئیں گا۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

ایک بھارتی فوجی آفیسر کو اس طرف آتے دیکھ کر اس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور جیب سے بیڑی نکال کر سلگانے لگا۔



دریائے سرما تک کا سفر میں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اس بس میں طے کیا۔

ہمارے دونوں اطراف تباہی تھی' بربادی تھی' ویرانی تھی۔

ہر قابل ذکر' قابل استعمال شے بھارتی فوج اپنے ٹرکوں پر لاد کر بھارت منتقل کر رہی تھی۔ یہ لوگ بنگلہ دیش کو اگلے سو سال تک غلام بنائے رکھنے کے منصوبے پر عمل پیرا تھے۔ تباہ ہونے والے پلوں کے ڈھانچے تک اٹھا کر لے گئے تھے۔ پاکستان آرمی سے حاصل کردہ سامان جنگ کا تو ذکر ہی کیا' راشن اور ادویات تک بھارتی آرمی نے اپنے قبضے میں لے کر بھارت منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔

دریائے سرما کا پل تباہ ہو چکا تھا۔

پل کے کنارے بنی ہماری پوسٹوں کی حالت یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ یہاں موجود جوانوں نے کس طرح بے جگری سے اور نامساعد حالات کے باوجود دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ اس معرکے میں ہمارا ایک بھی مجاہد زندہ نہیں بچا تھا۔ سب شہید ہو گئے تھے حالانکہ بھارتی فوجی ان کے سامنے چیختے چلاتے رہے کہ ان کے ساتھیوں نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں لیکن ان کے کان ایسی آوازوں کے لیے تو بہرے ہو چکے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے' لیکن دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذلت گوارا نہ کی۔



دریائے سرما پر ہمارا قیام رات گئے تک رہا۔

رات کے پہلے پہر ہمیں دریا کا پل عبور کروایا گیا۔ شاید بھارتی دن کی روشنی میں ہمیں بھارت پر سفر کروانے سے احتراز برت رہے تھے۔ یہ سفر ہم نے بنگلہ دیش کی بسوں پر ہی طے کیا تھا جنہیں بھارتی فوجیوں کے تیار کردہ کشتیوں کے پل پر سے گزارا جا رہا تھا۔

یہ پل بھی بھارتیوں نے بنگلہ دیش کی لوٹ کھسوٹ کو بھارت منتقل کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔

بھارتی علاقے میں پہنچنے کے بعد ہماری بسوں کو ایک جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ بسوں کے گردا گرد بھارتی فوج کے ٹرک دائرے کی شکل میں کھڑے تھے جن پر بھارتی فوجی گنوں کا رخ ہماری بسوں کی طرف کیے ٹریگر پر انگلیاں رکھے ہمیں گھور رہے تھے۔

پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ اب یہ موذی ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ان کے بزرگوں نے ہمارے اسلاف سے کیا تھا' لیکن ہمارے ساتھ موجود فوجی قافلے کے ہندو کرنل نے ہماری بسوں کے نزدیک آکر اعلان کیا کہ ہمیں رات یہیں قیام کرنا ہے اور بسوں سے باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں ہو گی۔ اس کے اس غیر قانونی اور انتہائی توہین آمیز حکم پر میرا خون کھول اٹھا۔

دراصل اس قافلے میں جب دریائے سرما عبور کرنے کے لیے ہمیں دوبارہ بسوں میں منتقل کیا جا رہا تھا تو کمانڈوز کے دو آفیسر بھارتی فوج کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گئے تھے اور جاتے جاتے انہوں نے اپنے راستے میں آنے والے ایک بھارتی فوجی کی گردن کو بھی کمانڈوز کے مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر زندگی کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔ شاید اس نے شور مچانے کی کوشش کی ہو گی۔

بھارتیوں کو خطرہ تھا کہ یہی حرکت اب ہم بھی دہرائیں گے۔ بھارتی کرنل کو اس کے ایک جوان کی بزدلانہ موت اور ہمارے آفیسرز کے دلیرانہ فرار نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا جس کا اظہار اس کی طرف سے ہونے والی عجیب و غریب حرکتوں سے ہوتا رہا۔

اس نے ہمیں وارننگ دی کہ اگر کسی نے رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔

یہ حکم سراسر غیر قانونی تھا۔

جنیوا قوانین کی رو سے ہر جنگی قیدی کو فرار ہونے کا حق حاصل ہے اور اس پر گولی نہیں چلائی جا سکتی' لیکن دنیا میں ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔۔۔۔!



یہاں صرف طاقت کی زبان ہی قانون کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہر طاقت ور کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے اپنی مرضی کے قوانین بناتا اور اس پر عمل کرواتا رہے۔

بھارتی کرنل نے ہمارے ساتھ شیلانگ پہنچنے تک ہر ممکنہ غیر اخلاقی اور غیر انسانی حرکت کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے قافلے کو جان بوجھ کر پبلک مقامات پر کھڑا کیا جاتا جہاں بھارتی شہری ہم پر پتھر پھینکتے' ہمیں گالیاں دیتے۔ ہر ممکن طریقے سے ہمیں اشتعال دلایا جاتا۔

ہم متعدد مرتبہ اس حرکت پر احتجاج کر چکے تھے' لیکن اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ شاید ان لوگوں کو ہائی کمان کی طرف سے ایسی ہدایات ملی تھیں کہ ہمیں ہر ممکن روحانی اذیت سے دوچار کیا جائے۔

خدا کا شکر ہے مجھے بھارتی کیمپوں میں بمشکل چند راتیں ہی گزارنا پڑیں۔ جن لوگوں نے وہاں لمبا عرصہ گزارا' میں تصور کر سکتا ہوں انہیں کس کس ذہنی جسمانی عذاب سے دوچار ہونا پڑا ہو گا۔

ہمیں راستے میں کہیں کہیں روک کر اپنا راشن خود لینے کی سہولت ضرور دی گئی کیونکہ بھارتی فوج کے پاس ہمیں دینے کے لیے کھانا نہیں تھا۔ اس طرح ۲۴ گھنٹے میں ایک مرتبہ ایک جھیل کے کنارے حوائج ضروریہ کے لیے رکنے کی اجازت دی گئی۔

یہاں ہمارے ایک ساتھی نے محض اپنی ٹانگیں کھولنے کے لیے جب چہل قدمی کی غرض سے بھارتی فوجیوں کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کی تو بھارتی مسلح سورماؤں نے اس نہتے اور زخمی جوان کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارا ساتھی فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمارے ایک آفیسر کو طیش آگیا اور اس نے ایک بھارتی حوالدار کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔

اس واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بھارتی درندے اس پر بھی پل پڑے۔ ہمارے جوانوں نے جب اپنے آفیسر پر بھارتی فوجیوں کو حملہ آور ہوتے دیکھا تو وہ حالات کی پروا کیے بغیر مقابلے پر ڈٹ گئے۔

اس سے پہلے کہ صورت حال سنگین ہو جائے۔ ہمارے سینئر اور بھارتی کمانڈر نے فریقین کو الگ الگ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ انہوں نے ایسا بادل نخواستہ کیا ہے۔ شاید بھارتی کمانڈر آغاز ہی میں اس کھلے علاقے میں کسی مزید ناخوشگوار واقعے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا ایک جوان پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔

اس ایک واقعے سے کم از کم بھارتیوں کو یہ سبق ضرور حاصل ہو گیا کہ پاکستانی فوجی نہتے

ہونے کے باوجود اپنی عزت نفس کے تحفظ سے دستبردار نہیں ہوئے۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت ہم جانگیری پہنچ گئے جو ایک طرح سے ہمارا ٹرانزٹ کیمپ تھا۔

# قرعۂ فال

ابھی تک ہمارے پرائیویٹ کمرے "پی او ڈبلیو" کی مہر لگنے سے محفوظ تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی ہم اپنے مستقل قید خانے میں جس کا ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا' پہنچیں گے تو ہمارے کپڑوں پر یہ لعنتی مہر ثبت ہو جائے گی جس کے بعد وہ کپڑے ناقابل استعمال ہوں گے۔ میں نے ابتداء سے اب تک فرار کے تمام ممکنہ امکانات کو مد نظر رکھا تھا---- لیکن ابھی تک ایسا کوئی موقعہ ہاتھ نہیں آیا تھا جس سے میں خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا۔

جانگیری کیمپ بھارتی فوج کی کوئی پرانی چھاؤنی تھی جسے ان لوگوں نے ہنگامی بنیادوں پر ٹرانزٹ کیمپ میں تبدیل کر لیا تھا جس کا اندازہ کیمپ میں داخل ہوتے ہی ہو گیا۔ یہ کیمپ آرمی کی دو لمبی بیرکوں پر مشتمل تھا۔ ہر بیرک کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ رہائشی میدان والا ایک طرح سے کامن روم اور آخری حصے میں پلاسٹک کے تھیلوں کی مدد سے پارٹیشن کرنے کے بعد تین غسلخانے بنائے گئے تھے۔

کچن دونوں بیرکوں کے درمیان تعمیر کیا گیا تھا اور صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسے دو تین روز میں افراتفری کے عالم میں کھڑا کیا گیا ہے۔ چھپر کی روایتی چھت تھی جسے چار دیواروں پر ڈال کر دو کھڑکیاں اور ایک دروازہ درمیان میں فٹ کر دیا گیا تھا۔

چھت کے درمیان ایک بلب لٹک رہا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں تو ان کے قابل استعمال ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سردیوں میں قدرے گوارا تھا۔

کیمپ میں داخل ہوتے ہی میں نے صورت حال کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دونوں بارکوں کے گرد خار دار تاریں لگائی گئی تھیں جن کی اونچائی دس فٹ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ تاروں اور بیرکوں کے درمیان قریباً" تیس چالیس گز کا فاصلہ تھا اور ہمیں ان کے نزدیک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ ہماری سرحد تھی جسے عبور کرنے کی واحد سزا موت تھی۔

اس کے بعد دس گز کا خالی دائرہ جس کے آگے پھر خاردار تاروں سے دس فٹ اونچی

دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ اس دائرے میں چار ٹاورز بنائے گئے تھے جن میں مسلح محافظ سرچ لائٹوں سمیت چوبیس گھنٹے الرٹ رہتے تھے۔ اس دائرے کے باہر ان لوگوں کے آفس تھے اور دونوں خار دار تاروں کے دائروں کے گرد ہر وقت مسلح پہرے دار گشت کرتے رہتے تھے۔

رات کے اوقات میں ہماری بیرکوں کے باہر بھی مسلح گارڈز موجود رہتے تھے۔

ہمیں ابتدا ہی میں کیمپ کمانڈنٹ کرنل راٹھور نے بتا دیا تھا کہ یہ ٹرانزٹ کیمپ ہے جہاں سے ہمیں کسی بھی وقت اگلی منزل پر لے جایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ایک بات تو اس نے ہمیں ذہن نشین کروا دی تھی کہ یہاں سے ہم سرنگ لگا کر فرار نہیں ہو سکتے کیونکہ سرنگ لگانے میں جتنا عرصہ درکار تھا' اس سے پہلے یہ لوگ ہمیں یہاں سے نکال کر لے جاتے۔

کرنل راٹھور بظاہر بڑا مہذب بننے کی کوشش کرتا تھا' لیکن اپنے دل میں چھپے تعصب کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے کیمپ میں داخل ہوتے ہی ہماری بڑے بے ڈھنگے طریقے سے تلاشی لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وارننگ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کمانڈو ہونے کے ناطے ہم میں سے کسی کے دل میں مہم جوئی کا شوق موجود ہے تو وہ ایسی کوشش ہرگز نہ کرے کیونکہ رات کے اندھیرے میں وہ اپنے گارڈز کو جنیوا کنونشن پر لیکچر دینے کے لیے موجود نہیں ہو گا اور یہاں سے فرار کی صورت میں اس کے گارڈز سوائے گولی چلانے کے اور کچھ نہیں کر سکیں گے۔

"جینٹل مین! اتفاق سے میرے پاس گشت کرنے والے کتے بھی موجود نہیں ہیں۔ اس لیے میرے جوانوں کو صرف اپنی بندوقوں پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے بڑا گہرا طنز کیا۔

اس طنز کی کاٹ نے مجھے ہی نہیں ہمارے بہت سے افسران کو کاٹ کر رکھ دیا۔

"میں تمہارے اس غرور کو پاش پاش کر کے رکھ دوں گا کرنل راٹھور----!" میرے اندر موجود کمانڈر نے پہلی بغاوت کا علم بلند کیا۔



"اسے جواب ملنا چاہیے۔" بیرک میں پہنچتے ہی ہمارے کرنل صاحب کے منہ سے پہلا فقرہ یہی نکلا تھا۔



"ضرور ملے گا سر۔" تین چار افسروں نے جواب دیا۔

"میں دوں گا----!" میں نے کہا۔

"میں بھی----!" پانچ چھ آفیسروں نے باری باری ایڑیاں بجاتے ہوئے کہا۔

سامان رکھتے ہی ہم لوگ کامن روم میں اکٹھے ہوئے اور ہماری میٹنگ کا موضوع ہی "فرار" تھا۔ سرنگ کے ذریعے فرار کے امکان کو تو ہم نے ابتدائی مرحلے ہی پر رد کر دیا تھا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ خاردار تاروں میں سے راستہ بنا کر نکلا جائے۔

کیمپ کی صورت حال اور موجودہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ گروپ کی شکل میں فرار کے امکانات بہت کم ہیں۔ البتہ انفرادی کوشش کی جا سکتی ہے۔ رات گئے تک یہ بحث ہوتی رہی کہ اس کار خیر کی ابتدا کون کرے گا؟ بالآخر قرعہ فال میرے نام پڑا۔

یہ بات بھی مجھ پر چھوڑ دی گئی کہ میں اس کے لیے کیا طریق کار اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی بیرک میں آ کر چارپائی پر لیٹا تو صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ابھی تک فرار کی کوئی ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔

کرنل راٹھور نے دوران تلاشی ہمارے لیے معمولی چاقو اور بلیڈ تک واپس لے لیے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر تاریں کاٹنے کے لیے کم از کم پلاس ہی کہیں سے حاصل کیا جائے۔ جب کچھ سمجھ نہ پڑا تو معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا اور سو گیا۔ علی الصبح نماز پڑھنے کے بعد میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ وہ مجھے کافر کا غرور توڑنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ شاید وہ کوئی قبولیت دعا کا محترم لمحہ تھا جب میری التجائیں باریابی کا شرف حاصل کر گئیں۔

میرے ذہن میں دوران دعا ہی ایک ترکیب آ گئی۔

میں نے آپ کو بتایا کہ یہ کیمپ بڑی ہنگامی ضروریات کے پیش نظر ہی کھڑا کیا گیا تھا---- ان کی عقل پر شاید خداوند تعالیٰ نے پردہ ڈال دیا تھا کہ ہندو نے ہمیں کچن میں کسی خوف کے پیش نظر مٹی کے تیل کے چولہے نہیں دیئے تھے نہ ہی لکڑیاں دینے کا خطرہ مول لیا تھا۔ شاید کرنل کے دل و دماغ پر یہی خوف سوار تھا کہ یہاں موجود کمانڈوز کچھ کر نہ گزریں۔ ہماری فوج نے بھلے ہتھیار ڈال دیئے تھے' لیکن اس بات کو شاید آپ تسلیم نہ کریں کہ دشمن کے دل سے پاک فوج کی خصوصاً" ایس ایس جی کی دہشت نہیں نکلی تھی۔ جہاں ہمارا کچن تھا' شاید یہ ان لوگوں کی کبھی کنٹین رہی ہو' کیونکہ یہاں کھانا پکانے کے

لیے بڑے بڑے ہیٹر نصب تھے۔ یہاں صرف ستر اسی آفیسرز اور ان کے اردلی ہی رکھے گئے تھے۔ اس لیے کرنل راٹھور کی دانست میں تین چار ہیٹر ان کے کھانا پکانے کے لیے کافی تھے۔ یوں بھی ہمارا قیام مستقل تو تھا نہیں کہ وہ دور کی سوچتا---- بس یہیں سے میرے ذہن نے ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا اور اب ہم اس منصوبے پر عمل کرنے جا رہے تھے۔



منصوبے کے مطابق اگلے روز صبح ہوتے ہی ہم نے کیمپ کمانڈر کو ہیٹر خراب ہونے کی رپورٹ کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامی کیفیت پیدا ہو گئی کیونکہ ہمارے آفیسرز نے کرنل راٹھور پر جنگی اصول و قواعد کے مطابق صبح کا ناشتہ فراہم کرنے کے لیے زور ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کوئی بہانہ اس سلسلے میں سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

کیمپ کمانڈر کے لیے ہنگامی بنیادوں پر کچھ فراہم کرنا مشکل تھا اور مصیبت یہ بھی تھی کہ وہاں کوئی باقاعدہ آرمی کی کنٹین بھی نظر نہیں آتی تھی۔ یوں بھی ایک معمولی سی کنٹین سے وہ کس طرح اس صورت حال پر قابو پاتا۔ اس نے جیسے تیسے ہمارے لیے چائے اور بسکٹوں کا بندوبست کیا۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی دیر بعد اس کے جوان نزدیکی شہر سے ایک مکینک کو بجلی کا نقص ٹھیک کرنے کے لیے پکڑ کر لے آئے تھے۔ فی الوقت وہ ہمارے لیے یہی کچھ کر سکتے تھے اور یہی ہم چاہتے بھی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ یہاں آرمی کا کوئی الیکٹریشن نہیں آگیا۔



مکینک کوئی سول تھا کیونکہ یہاں سب کچھ ہنگامی بنیادوں پر طے پایا تھا۔ اس لیے شاید صورت حال سے نمٹنے کی لمبی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔

پلان کے مطابق ہمارے ایک آفیسر نے اس سے مذاق شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ مکینک کو اپنے ڈھب پر لے آئے۔ اس سے کہا کہ اگر وہ ان سے دو گھڑیاں لے کر کچھ پیسے دے سکتا ہو تو دونوں گھڑیاں اسے دے دی جائیں۔ مکینک اس لالچ میں آگیا اور رضامندی ظاہر کر دی۔

وہی آفیسر اسے گھڑیاں دینے کے بہانے ملحقہ بیرک میں لے گئے۔ وہاں کوئی بھارتی فوجی ، پہرے دار تو موجود نہیں تھا جو اس طرف توجہ دیتا۔ بیرک میں گھڑیاں کیا خاک ملتیں، الٹا آفیسر نے دھونس جما کر اس سے پچاس ساٹھ روپے بھی ہتھیا لیے اور اسے دھمکی دی کہ اگر



اس نے چوں چراں کی تو وہ ابھی شور مچا کر گارڈ کو یہاں بلا لے گا اور مکینک کی اس بیرک میں موجودگی پر اس کی کمبختی بھی آ سکتی تھی کیونکہ اسے کچن سے باہر جانے کی اصولی طور پر اجازت نہیں تھی۔

جب وہ ہانپتا کانپتا واپس کچن میں پہنچا تو اس کا ایک پلاس غائب ہو چکا تھا۔ یہ پلاس میں نے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اور اس وقت مکینک کو یہاں سے ہٹانے کا ڈرامہ ہی دراصل اس پلاس کو اڑانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس اثناء میں معمولی نقص دور ہو چکا تھا۔ اس کے کچن میں داخل ہوتے ہی میں نے یہ کہہ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین سرکا دی کہ ابھی ایک گارڈ اس طرف آیا تھا جو اس کے متعلق دریافت کر رہا تھا۔ "ہم نے گارڈ کو اندر نہیں جھانکنے دیا۔" میں نے اسے کہا۔

"گارڈ کو شاید شک ہو گیا ہے کہ تم یہاں موجود نہیں ہو۔ وہ ہمارے خوف کی وجہ سے اندر نہیں داخل ہوا، لیکن اپنے ساتھیوں کو لینے گیا ہے تاکہ صورت حال کا جائزہ لے سکے۔ اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔" اتنا کہہ کر میں نے مدد کرنے کے انداز میں اس کے تھیلے میں اس کے اوزار ڈال کر تھیلا اسے تھما دیا۔ افراتفری اور گھبراہٹ کے عالم میں اسے یہ بھی نہ سمجھ آ سکی کہ اس کے ساتھ کیا قیامت بیت گئی ہے۔

جب وہ جلدی جلدی باہر نکلا تو واقعی اس کی خبر گیری کے لیے دو سنتری اس طرف آ رہے تھے۔ مکینک نے سنتریوں کو دیکھتے ہی اپنے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ چپکا لی اور ان کے کچھ دریافت کرنے سے پہلے ہی انہیں جلدی جلدی بتانے لگا کہ اس نے ہیٹر ٹھیک کر دیئے ہیں۔ وہ اس صورت حال سے فوراً اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا اور بہت تیزی میں دکھائی پڑتا تھا۔

سنتری بھی اس کے ساتھ ہی واپس چلے گئے۔

چند منٹ بعد ایک کیپٹن اور تین گارڈ اس طرف آتے دکھائی دیئے۔ ایک مرتبہ تو میرے پاؤں تلے سے زمین ہی سرک گئی اور یہی شک گزرا کہ اس کمبخت نے شاید اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی ان لوگوں کو سنا دی ہے اور یہ اب اپنے شک کی تصدیق کرنے آئے ہوں گے، لیکن خدا کا شکر گزرا کہ صورت حال اس کے برعکس تھی اور یہ لوگ صرف صورت حال دریافت کرنے اور یہ دیکھنے آئے تھے کہ ہماری شکایت کا ازالہ ہو گیا یا نہیں۔

پھر وہ مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

جاتے جاتے کیپٹن نے ہمارے استفسار پر بتایا کہ ابھی ہمیں یہاں کچھ دن اور قیام کرنا پڑے گا---- لیکن صحیح مدت بتانے سے احتراز برتا۔

رات کو بیرک میں ایک مرتبہ پھر یہ معاملہ زیر بحث آیا کہ سرنگ لگا کر زیادہ لوگ نکلیں یا میں اکیلا ہی یہاں سے نکلوں۔ کثرت رائے سے قرعہ فال پھر میرے حق میں پڑا اور یہی کہا گیا کہ عارضی کیمپ میں جہاں کسی بھی لمحے اگلی منزل کی طرف کوچ کا حکم مل سکتا ہے سرنگ کھودنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ہی اگلی رات میرے فرار کے لیے منتخب ہو گئی۔

اگلا دن میرے لیے بہت سے جذباتی لمحات اپنے پہلو میں لے کر طلوع ہوا۔ یہ ہماری اس کیمپ میں آخری ملاقات تھی۔ خدا جانے اس کے بعد پھر ملنا نصیب بھی ہو یا نہیں؟

خدا جانے میں بچ کر اپنے ملک پہنچ بھی پاؤں گا یا نہیں؟

صورت حال بڑی غیر واضح تھی لیکن مجھے بہرحال کچھ نہ کچھ آج رات کر گزرنا تھا کیونکہ عین ممکن تھا اگلے روز ہمیں کوچ کا حکم مل جاتا۔ شام کو مغرب اور پھر عشاء کی نماز میں میرے فرار اور کامیابی کے لیے خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔ ان لمحات میں شاید ہی کوئی ایسی آنکھ تھی جس نے آنسو نہ بہایا ہو۔ میرے تمام ساتھی گڑگڑا کر خدا کے حضور میری کامیابی کے لیے دعاگو تھے۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ انشاء اللہ اب سارے بھارت کی فوج مل کر بھی میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔

بیرک کی دیواروں میں دوہری کھڑکیاں نصب تھیں۔ ایک اندر سے بند ہوتی تھی اور دوسری باہر سے۔ اس کا طریقہ کار کچھ ایسا تھا کہ پہلے ہم اندر والی کھڑکی بند کرتے پھر گارڈ باہر والی کھڑکی بند کر کے اسے کنڈی لگا دیتا۔

اس روز ہم نے طے شدہ منصوبے کے مطابق باہر والی ایک کھڑکی کا بولٹ خراب کر دیا تھا اور اس کی پوزیشن کچھ ایسی کر دی تھی کہ اندر سے معمولی سا دھکا لگانے پر بھی باہر والی کھڑکی کھل جاتی۔ اس کے ساتھ ہی اس کھڑکی کو ہم نے جان بوجھ کر خود ہی بند کر دیا تاکہ کسی کو اسے چیک کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔ یوں بھی یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اگر کھڑکی کا بولٹ کسی کی نظر میں آ بھی جاتا تو کوئی اتنی دور تک نہ سوچتا کیونکہ کھڑکیاں خاصی بوسیدہ اور پرانی دکھائی دے رہی تھیں۔

حسب معمول شام کو گارڈ نے کھڑکیاں بند کروا دیں۔ اس کھڑکی کے نقص کی طرف کسی



کا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور یہی سمجھا گیا کہ شاید وہ کھڑکی صبح کھولی ہی نہیں گئی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ ہم سردی کی وجہ سے کھڑکیاں بند رکھا کرتے تھے۔

رات دیر گئے تک ہم سب جاگتے رہے----!

مجھے یہ لوگ بارات کے دولہا کی طرح تیار کر رہے تھے۔ جس ساتھی کے پاس جتنے جتنے پیسے تھے اس نے مجھے دے دیئے۔ میرے پاس اب تین چار ہزار روپے کی بھارتی کرنسی جمع ہو چکی تھی۔

سویلین کپڑے میں نے پہن لیے تھے اور ایک تھیلے میں ایک سویلین کپڑوں کا جوڑا بھی محفوظ کر لیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے دو گرم جرسیاں بھی دے دی تھیں جن پر ابھی تک پی او ڈبلیو کے نشان نہیں لگے تھے۔ سب باری باری مجھے گرمجوشی سے گلے لگا رہے تھے۔

رات کا ایک پہر گزرا تو میرے رخصت ہونے کا وقت بھی آ گیا۔

بڑا رقت انگیز منظر تھا۔

میرے ساتھی آفیسر ڈبڈباتی آنکھوں اور دکھی دلوں سے ہونٹوں پر لرزاں دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کر رہے تھے۔

☆○☆

اندر کی کھڑکی کھلی اور ہلکے سے دھکے سے ہم نے باہر کی کھڑکی بھی کھول دی۔ میں نے کھڑکی کو تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ نزدیک کوئی پہرے دار نظر نہیں آ رہا تھا اور سرچ لائٹ بھی ابھی تک مخالف سمت گھوم رہی تھی۔ یہ میرے کود جانے کا بہترین وقت تھا۔

میں نے ایک نظر پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہیں نظروں ہی نظروں میں خدا حافظ کہہ دیا۔ میرے ساتھیوں نے اپنے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر مجھے خدا کے سپرد کیا اور میں کھڑکی سے باہر کود گیا جہاں تیز ہوا کے تھپیڑے میرے منتظر تھے۔

کھڑکی اچانک ہی کھل گئی تھی----!

میں نے سب سے پہلے کھڑکی کو باہر سے بند کیا۔ اندر والی کھڑکی میرے ساتھیوں نے بند کر لی تھی۔ سرچ لائٹ بجھ چکی تھی لیکن کسی بھی وقت میں اس کی تیز روشنیوں کی زد میں آ سکتا تھا۔ مجھے بہرحال یہاں سے نکلنا تھا۔

دیوار کے ساتھ چپکتا میں اب بیرک کی مخالف سمت میں آ چکا تھا جدھر ہمارا باورچی خانہ تھا۔

اچانک ہی سارا ماحول ننگا ہو گیا۔

سرچ لائٹ کی سیدھی روشنی بیرک کی اس دیوار پر آئی تھی جہاں میں چند لمحے پہلے موجود تھا۔ میں نے دل میں لاکھوں مرتبہ خدا کا شکر ادا کیا کہ اب میں وہاں نہیں تھا۔

ہماری اطلاعات کے مطابق تھوڑی ہی دیر بعد پہرے دار تبدیل ہونے والے تھے اور جب ایک گروپ نے دوسرے کو چارج دینا تھا۔ عین ان لمحات میں مجھے کچھ کر گزرنا تھا۔ میں نے بڑی بے چینی سے گھڑی کی سوئیوں کا جائزہ لیا۔ ابھی رات کا ایک بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے اور مجھے ایک بجے کا انتظار کرنا تھا کیونکہ طے شدہ پلان کے مطابق مجھے ایک بجے ہی حرکت میں آنا تھا۔

قدرت اپنے بندوں کی کس کس طرح مدد کرتی ہے اور کبھی کبھی نارساؤں کی رسائی کے لیے کیسے کیسے اسباب جنم لیتے ہیں۔ اس کا احساس مجھے اس روز ہوا۔

ایک بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے جب کیمپ کی لائٹ آف ہو گئی۔

بجلی یہاں بھی ہمارے ملک کی طرح آتی جاتی رہتی تھی۔ مجھے اس بات کا علم تب ہوا جب دو تین منٹ تک سرچ لائٹ روشن نہیں ہوئی اور کیمپ کے باہر دور جو روشنیاں مجھے یہاں سے دکھائی دے رہی تھیں وہ بھی بجھ گئیں۔

پہلے تو مجھے یہ سب کچھ نظر کا واہمہ دکھائی دیا' لیکن دو تین منٹ بعد ہی جب مجھے خاردار تار سے کچھ فاصلے پر ایک ٹارچ جلتی بجھتی نظر آئی تو یقین ہو گیا کہ یہ میری نظر کا واہمہ نہیں' حقیقت ہے۔

ہوا اور تیز ہو گئی تھی----!

اس علاقے میں اس سے پہلے میں نے اتنی تیز ہوا چلتے نہیں دیکھی تھی۔ تب میں ہوا کی رفتار کا اندازہ تو نہ کر سکا' لیکن اگلے روز مجھے علم ہوا کہ وہ تو اچھا خاصا طوفان تھا جس نے یہاں کی بجلی اور ٹیلی فون کا نظام گڑبڑ کر کے رکھ دیا تھا اور میرے دل نے گواہی دی کہ یہ سارا اہتمام قدرت نے صرف مجھ ناکس کے لیے کیا تھا۔



میں نے چیتے کی طرح اپنی جگہ سے زقند بھری----!

تیز ہوا میں قدموں کی چاپ سنائی دینے کے امکانات بہت کم تھے' لیکن مجھے یقین تھا اگر کوئی نزدیک ہوا تو میری چھٹی حس ضرور میری راہنمائی کر دے گی۔



میں خاردار تاروں کی پہلی باڑ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ بجلی فیل ہونے کے سبب اس بات میں تو کوئی شک باقی نہیں رہ گیا تھا کہ خاردار تاروں میں برقی لہر نہیں دوڑ رہی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر تاروں کے اس باڑ کو کاٹے بغیر عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے ہی منٹ میں اپنی تربیت کے بل بوتے پر میں باڑ عبور کر چکا تھا۔ میں نے خدا کا شکر گزارا کہ کپڑے محفوظ تھے۔

اب میں دوسرے سرکل کے نزدیک کھڑا تھا جب اچانک ہی میرا نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ مجھے اپنے بالکل قریب دو گارڈز کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ دونوں بجلی کے محکمے کو گالیاں دے رہے تھے اور ایک دوسرے سے چارج لے رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں زمین سے چپک گیا۔

اپنی تربیت کے مطابق تو میں زمین کا حصہ بن چکا تھا' لیکن ان میں سے کوئی بھی ٹارچ روشن کر لیتا یا عین ممکن ہے میرے قریب سے گزرتا ہوا مجھ سے ٹکرا جاتا تو میرے فرار کے ایک فیصد مواقعے بھی میسر نہ رہتے۔

میں سانس روکے ان کی گالیاں سن رہا تھا۔

دونوں نے ایک ڈیڑھ منٹ تک آپس میں باتیں کیں' پھر باتیں کرتے آگے بڑھ گئے۔ ان کی پرچھائیں مجھے اندھیرے میں بھی ہیولے کی طرح واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے فی الوقت خطرہ ٹل جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور ایک نظر خاردار باڑھ پر ڈالی۔

اس کی اونچائی اور بناوٹ ایسی تھی کہ جسے پہلے کی طرح عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسی وقت کے لیے ہم نے مکینک کو بلانے کا ڈرامہ رچایا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے پلاس نکالا۔ دو منٹ میں ہی میں اس ناکارہ پلاس کی مدد سے تاریں کاٹ کر اپنے فرار کے لیے راستہ بنا چکا تھا۔

تاروں کو دوبارہ جوڑنے کی مہلت مجھے میسر نہیں تھی۔ یوں بھی صبح بہرصورت میرے فرار کا علم ہو جاتا۔ میں سانپ کی طرح بل کھاتا اور رینگتا ہوا دوسرے سرکل سے بھی باہر نکل آیا۔

اتفاق سے جو سمت میں نے اندھیرے میں اختیار کی تھی وہ سیدھا راستہ بھارتی آرمی کے نزدیکی دفاتر کی طرف جاتا تھا جس کا احساس مجھے اب ہونے لگا تھا کیونکہ اندھیرے کی چادر میں سے نزدیکی دفاتر کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ میں نے اب تیسری اور آخری باڑ بھی عبور کر لی تھی اور اپنی دانست میں دفاتر کی مخالف سمت سفر اختیار کیا تھا۔

ابھی بمشکل چند قدم ہی چلا تھا کہ اچانک ماحول روشن ہو گیا۔

ان لوگوں نے شاید اپنے جنریٹرز سٹارٹ کر لیے تھے یا پھر واقعی لائٹ ہی واپس آ گئی تھی۔

دفاتر کے باہر لگے روشنی کے بلب جیسے یکدم گہری نیند سے بیدار ہو گئے۔ ان کے سائے اندھیروں میں رینگتے ہوئے قدموں کی طرف بڑھنے لگے اور میں زمین پر "قریباً" جھکا ہوا برق رفتاری سے نزدیکی گھاس پھونس کی طرف بڑھنے لگا۔ شاید یہ برساتی سرکنڈے تھے۔

اپنی دانست میں' میں اب قدرے محفوظ تھا اور سرکنڈوں کے اندر ہی اندر دفاتر کی دوسری سمت نکل جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اچانک دل دھک سے رہ گیا۔

"ہالٹ" میرے دائیں پہلو سے آواز آئی۔

شاید کوئی بدقسمت گارڈ ڈیوٹی مکمل کر کے اپنی بیرکس کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے اندھیرے میں مجھے دیکھ لیا تھا اور ٹارچ روشن نہ کرنے کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ یا تو اس کے پاس ٹارچ ہی نہیں یا پھر اس نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں سنبھال کر رکھی تھی اور اسے اتنی مہلت نہیں تھی کہ ٹارچ نکال سکتا۔

"فرنٹ----!" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور میں اس کی طرف گھوم گیا۔

انسانی سائیکی میں بسااوقات جو انقلاب خیز لمحے محفوظ ہو جاتے ہیں' وہ بھی ایک ایسا ہی لمحہ تھا جب میں نے اچانک ہی ایک خطرناک فیصلہ کر لیا تھا۔

"اس گارڈ کو مار ڈالنے کا فیصلہ----!؟"

میں جانتا تھا اس کا زندہ رہنا میری موت ہے اور اس کی موت میری زندگی----! اگر میں اس سے الجھ جاتا تو عین ممکن تھا اس کے منہ سے نکلی کوئی آواز کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

اسے بے ہوش کر کے پھینک دینے کی صورت میں نجانے وہ کب ہوش میں آ جاتا---- کوئی اسے دیکھ لیتا۔

بہت سے سوالات یک بیک میرے ذہن میں اپنے جوابات سمیت آئے اور میں نے وہ فیصلہ کر لیا۔

میں اسے سوالات کرنے کی مہلت ہی نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی گن ضرور میری طرف سیدھی کر لی تھی' لیکن ایک کمانڈو ہونے کے ناطے میں جان سکتا تھا کہ وہ اس وقت فائرنگ پوزیشن میں نہیں ہے اور اس نے اپنی گن کا سیفٹی کیچ لاک کیا ہوا ہے۔ اس سے



پہلے کہ اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلے' میں نے زقند بھری اور اس کی گردن کو جا لیا۔ میں جانتا تھا گردن یا سر کی کونسی نبض دبانے سے اس کی آواز بند کر سکتا ہوں۔ میں نے وہی کیا۔ چند سیکنڈ وہ تڑپا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

بھاری جسم کا گارڈ تھا۔ میں نے اسے اپنے کندھے پر ڈال لیا اور نزدیکی سرکنڈوں میں لے جا کر اس کے جسم کو چند سیکنڈ میں کپڑوں سے بے نیاز کر دیا۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی وردی میرے کپڑوں پر بالکل فٹ بیٹھی تھی۔ اس کی گن میں نے اٹھا لی اور اب اندازے سے بیرکوں کی مخالف سمت جو سڑک ریلوے سٹیشن کی طرف جاتی تھی' اس پر چلنے لگا۔

ہوا کا زور چند لمحوں کے لیے ٹوٹا لیکن ایک مرتبہ پھر تیز رفتار آندھی چلنے لگی۔

ہوا کی زوردار شاں شاں کی آوازیں تھی----!

آرمی کے دفاتر کے باہر دم توڑتے بلبوں کی نیم مردہ روشنیاں----!

یا پھر----!

گھومتی ہوئی سرچ لائٹ جو اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

اس لمحے میرے بدن کی تمام گمشدہ توانائیاں لوٹ آئی تھیں۔ میں کسی بھی لمحے کچھ بھی کر گزرتا---- کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار تھا۔

جب تک مردہ ہندو سپاہی کی گن میں گولیاں موجود تھیں کوئی میرے زندہ وجود تک نہ پہنچ پاتا۔ میری لڑائی اب کرنل راٹھور سے نہیں' موت سے تھی۔

اگر میں گرفتار ہو جاتا تو یہ لوگ کسی بھی صورت مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ میں نے ان کے سپاہی کو مار ڈالا تھا اور کرنل راٹھور کے منہ پر طمانچہ مار کر بھاگا تھا۔ جب اسے یہ اطلاع ملتی تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتا۔

مجھے اب جلد از جلد اس جگہ سے دور ہٹ جانا تھا۔

جتنا میں یہاں سے دور چلا جاتا' زندگی سے میرا فاصلہ اتنی ہی نزدیک اور موت سے اتنا ہی دور ہو جاتا۔

میری رفتار بڑھنے لگی اور اب مجھے اندازہ ہو سکتا تھا کہ ریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔

کافی دیر سے مجھے کسی ریلوے انجن کی آوازیں آ رہی تھیں جو اب نمایاں ہونے لگی تھیں۔

ہوا کے جھکڑ زور پکڑنے لگے۔

میں قریباً" پندرہ منٹ بعد ایک چھوٹے سے پلیٹ فارم نما اسٹیشن کے نزدیک کھڑا تھا' بھارتی فوجی کے روپ میں!

اور چند منٹ بعد میں رائفل سمیت ٹرین سے چھلانگ لگا چکا تھا۔

جب تک ٹرین کا آخری ڈبہ نہ گزر گیا، میں سانس روکے لیٹا رہا۔ خیریت گزری زمین نرم تھی۔ پتھر وغیرہ یہاں نہیں بچھے تھے اور ٹرین کی رفتار بھی یہاں نہ ہونے کے برابر تھی۔ ٹرین مجھ سے بمشکل سو گز دور جا کر رک گئی تھی۔

میں اس طرف دیکھے بغیر ایک رُت میں چل دیا۔ بس مجھے اتنا اندازہ تھا کہ یہ واپسی کا رستہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ سمت ہے جدھر ٹرین جا رہی تھی۔

اب مجھے اس وردی اور رائفل سے نجات حاصل کرنا تھی۔ صبح ہونے والی تھی اور کسی بھی لمحے میرے فرار کا علم کرنل راٹھور کو ہو جاتا۔ یوں بھی یہ وردی صبح میرے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ یہاں سے آگے مجھے سول لباس میں سفر کرنا تھا۔

میں نے وردی میں رائفل لپیٹی۔ رائفل کو توڑ کر میں نے اس طرح ناکارہ کر دیا تھا کہ اب وہ بھارتی فوج کے کام کی نہیں رہی تھی۔ دشمن کو میں جس حد تک نقصان پہنچا سکتا تھا، آخر اس سے کیوں چوکتا؟

مجھے ابھی بھارت کے بہت بڑے علاقے میں سفر کرنا تھا کیونکہ میں آسام سے واپس بھوٹان کے راستے نیپال میں داخل ہونے کے بجائے لکھنؤ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ میرے خیال سے اس طرف کا سفر محفوظ تھا۔ یوں بھی اس طرح لمبا چکر کاٹ کر سرحد عبور کرنے میں چیک ہو جانے کے امکانات کم تھے۔ ابھی میرے پاس سفر کا کوئی باقاعدہ نقشہ نہیں تھا، لیکن میں کسی بھی ریلوے سٹیشن سے ٹائم ٹیبل حاصل کر کے اپنے مقصد میں کامیابی ضرور حاصل کر سکتا تھا۔

صبح دیر گئے تک میں چلتا رہا۔

زندگی بیدار ہو چکی تھی۔ میں نے اندازے سے جنوب کی سمت اختیار کی تھی۔ آبادی سے قدرے کٹ کر چل رہا تھا۔ جب لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تو میں نے بھی سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک بات میں نے خاص طور سے محسوس کی تھی کہ میرے کپڑے ان لوگوں سے الگ لگ رہے تھے، لیکن اس مشکل کا حل وہ چھوٹا سا بیگ ضرور تھا جسے میں نے ایک ہاتھ میں پکڑ کر کسی دوسرے صوبے کا باشندہ ہونے کا تاثر دے رکھا تھا۔

میرے ایک ساتھی نے بتایا تھا کہ نیپال کی سرحد کے دونوں اطراف مسلمانوں کی بھی آبادی ہے اور یہیں کہیں مجھے پناہ مل سکتی تھی، لیکن ابھی مجھے ایک لمبا سفر کرنا تھا۔



اس لمحے جب میں ماحول سے بظاہر اجنبی بنا بھارت کے ایک مضافاتی علاقے سے گزر رہا تھا تو جانے ذہن کے کس گوشے سے عظمیٰ کی شبیہہ ابھر کر میرے سامنے آ گئی۔

بنگال کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے عظمیٰ کو علم ہو گیا ہو کہ میں بے یارو مددگار یہاں بھٹک رہا ہوں۔ اس تک پہنچنے کے لیے میں نے بھارتی فوج کے زعم سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب وہ ہمیشہ کی طرح میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہاں چلی آئی تھی۔

سڑک کنارے میں نے ایک ہوٹل سے چائے اور بسکٹ کھائے۔ یہاں کے لوگ ہندی کم بولتے تھے، لیکن اس ہوٹل کا مالک---- کوئی سکھ تھا کیونکہ مجھے یہاں کچھ سکھ بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ لوگ شاید یہاں کاروبار کر رہے تھے۔ سب کا موضوع گفتگو بدقسمت پاکستانی قیدی تھے یا پھر بھارتی افواج کی "شاندار فتح----!"

میں نے مغربی بنگال کی طرف سفر کرنا تھا، لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرف جاؤں۔ شاید یہ مکھن پور نام کا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ شہر سے باہر جانے والی ایک بس پر میں سوار ہو گیا۔ صرف اتنا اندازہ میں نے لگایا تھا کہ یہ بس آسام کی طرف نہیں جا رہی۔ بس میں سوار ہونے کے لیے میں نے ٹکٹ باہر کھڑکی سے لے لیا جس پر مقامی اور ہندی زبان لکھی تھی جو میں نہیں جانتا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان گدھوں نے آخر انگریزی میں کچھ کیوں نہیں لکھا۔ بہرحال اللہ کا نام لے کر اس قطار میں کھڑا ہو گیا۔

میرے آگے ایک ادھیڑ عمر کا بہاری کھڑا تھا۔

پہلی نظر میں تو بے چارہ مجھے اپنی طرح ستم رسیدہ نظر آیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مقامی شخص تھا۔ میں نے سوچا جس جگہ کا ٹکٹ یہ لے گا، میں بھی وہیں کا ٹکٹ لے لوں گا۔ اس کی آواز پر میں نے کان لگائے ہوئے تھے، لیکن جب ہم کھڑکی پر پہنچے تو اس نے اتنی آہستگی سے نام لیا کہ میرے پلے خاک بھی نہ پڑا----

ٹکٹ لے کر وہ الگ ہوا اور ٹکٹ کلکٹر نے مقامی زبان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے ایسے اشارہ کیا جیسے اس جگہ کا ٹکٹ طلب کیا ہو جہاں مجھ سے پہلے والا جا رہا تھا---- ٹکٹ کلکٹر نے ٹکٹ کاٹتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کچھ کہا۔ شاید کہہ رہا ہو کہ میں کیا گونگا ہوں؟

میں نے دس روپے والا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کچھ ریز گاری ایک

دو روپے کے نوٹ کے ساتھ میری طرف لوٹا دی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ سفر لمبا ہو گا۔ شاید اس نے سات روپے کرایہ لیا تھا۔ میں بس میں داخل ہوا اور اس بہاری کے ساتھ براجمان ہو گیا۔

بس چلی اور رک گئی----!

شاید کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"کدھر جائیں گے آپ؟" میرے ساتھی نے دریافت کیا۔

شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں پنجابی ہوں' اس لیے ہندی میں بات کر رہا تھا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے کدھر جانا ہے۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ٹکٹ کس جگہ کا ہے۔ اس پر بھی ہندی یا آسامی زبان لکھی تھی۔ فوراً" میرے ذہن نے راہنمائی کی اور میں نے اس کے سوال کا جواب ایک کہانی کی شکل میں دے دیا۔

"بھگوان جانے مجھے کہاں کہاں جانا ہو گا؟"

میں نے بڑے غمگین لہجے میں کہا۔

"آپ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔" اس نے ہمدردی ظاہر کی۔

"بات ہی ایسی ہے بھیا۔" میں بولا۔

اس نے ہمدردی سے میرے حالات جاننے چاہے تو میں نے بتایا کہ میرا اس دنیا میں سوائے ایک چھوٹے بھائی اور ماں کے اور کوئی نہیں ہے۔ میں فوج میں حوالدار ہوں اور بنگلہ دیش میں تھا۔ بھائی گھر سے بھاگ گیا۔ میری ماں کی حالت بہت خراب ہے اور مجھے ہر صورت اپنے بھائی کو تلاش کرنا ہے۔ کسی نے بتایا تھا وہ جانگیری میں ایک ہوٹل پر کام کرتا ہے۔ اسے ڈھونڈتا ہوا ہی یہاں تک آیا ہوں' لیکن یہاں سے پتہ لگا کہ چند روز پہلے وہ جا چکا ہے۔ اس کے ایک ساتھی نے بتایا ہے کہ وہ اسی علاقے میں ہے۔ اب میں اس کی تلاش میں دربدر ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ اگر وہ نہ ملا تو میری ماں مر جائے گی۔"

بوڑھا بہاری خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے علاقے کی واقفیت حاصل کر لی اور یہ بھی کہ یہاں حالات کیسے ہیں۔ اس کی زبانی مجھے یہاں کے مختلف شہروں کے ناموں کا علم بھی ہو گیا۔

اس نے بتایا کہ وہ بہار میں رہتا ہے اور یہاں اس کی بیٹی بیاہی ہوئی ہے۔ اب وہ اسے ہی ملنے آیا ہے۔ اس نے کمال شفقت سے مجھے رات اپنی بیٹی کے گھر گزارنے کی دعوت دی۔



اندھے کو دو آنکھوں کے علاوہ اور کیا چاہیے----!

میں نے بظاہر "ناں ناں" کہتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی۔ اس کے ساتھ ہی اسے امرتسر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ اس نے بتایا کہ کاروبار کے سلسلے میں اسے کبھی کبھی پنجاب جانا ہوتا ہے اور ضرور میرے گھر آئے گا۔

کافی ملنسار بہاری تھا----!

اسے واقعی پنجاب میں کوئی واقفیت درکار تھی جو میری صورت میں میسر آ گئی تھی۔ میں نے اس شرط پر اس کی بیٹی کے گھر جانا پسند کیا تھا کہ میرے ساتھ وعدہ کرے کہ مجھے بھی پنجاب میں اپنی خدمت کا موقع دے گا۔

اس کی جیب میں ایک چھوٹی سی ڈائری موجود تھی۔ خدا کا شکر گزرا کہ اس نے مجھے پتہ لکھنے کو نہیں کہہ دیا اور خود ہی میرا بتایا ہوا ایڈریس لکھ لیا۔ یہ ایڈریس بھی میں نے اللہ توکل ہی لکھوا دیا تھا۔ خدا جانے جو کچھ میں نے لکھوایا تھا وہ امرتسر میں تھا بھی یا نہیں۔



بہاری کی بیٹی نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کا خاوند ایک مقامی مل میں کام کرتا تھا۔ میں نے اس کی سفید پوشی کا اندازہ لگاتے ہوئے گھر میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کے ایک بچے کو بیس روپے دے دیے۔

یہ ایک طرح کا گرین سگنل تھا۔

جسے حاصل کرنا ضروری تھا۔ بیس روپے نے وہ کام کر دکھایا جو شاید لاکھوں میں بھی نہ ہوتا---- اب مجھے یہاں وی آئی پی مہمان کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

میں رات کی بھاگ دوڑ سے تھکا ہوا تھا۔

جسمانی تھکاوٹ سے زیادہ ذہنی تھکاوٹ نے آ لیا تھا۔

ایک کمرے میں بوسیدہ سی چادر والے بستر پر میں لیٹ گیا اور لمبی تان کر سو رہا۔

نیند میں بھی میرے ساتھیوں کے اٹھے ہوئے ہاتھ میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ ایک پچھتاوا کبھی کبھی ضرور لاحق ہوتا تھا کہ بھارتی سپاہی کی لاش میرے ساتھیوں کے لیے بہت مسائل پیدا کرے گی کیونکہ ہمارا واسطہ جس کمینے اور بزدل دشمن سے تھا وہ دوستی یا دشمنی کے اصول و ضوابط سے واقف نہیں تھا۔ میرا غصہ کرنل راٹھور میرے ساتھیوں پر ضرور نکالتا---- اور میں جانتا تھا انہیں اب بہانے بہانے سے تنگ کیا جائے گا۔



شام ڈھل رہی تھی جب میں بیدار ہوا

ساری کسلمندی دور ہو چکی تھی اور اب میں کسی بھی لمحے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔ بس مجھے اتنا ہی آرام درکار تھا۔

اگلی منزل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے میرے ذہن میں صرف یہی بات تھی جو معظم نے آخری مرتبہ مجھے بتائی تھی کہ اگر یہاں سے فرار ہو کر اسے نیپال جانا ہے تو وہ لوگ کلکتہ سے مدد لے کر مغربی بنگال میں سے گزرتے گورکھپور پہنچنے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہاں کی سرحد محفوظ ہے۔ یہ علاقہ معظم کا دیکھا ہوا تھا۔

مجھے بھی اب اسی راستے پر قسمت آزمائی کرنی تھی۔

فی الوقت مجھے بھارت کا نقشہ درکار تھا جس کی مدد سے میں اگلا پلان تیار کرتا، لیکن یہ نقشہ آئے کہاں سے؟

جس جگہ ہم نے قیام کیا اس کا نام شاید سیتاپور تھا۔ سیتاپور کوئی بڑا شہر نہیں تھا، لیکن مجھے امید تھی کہ یہاں سے ضرور نقشہ حاصل کر سکوں گا۔ کم از کم مجھے ریلوے ٹائم ٹیبل یہاں سے ضرور مل سکتا تھا۔

کچھ بھی ہو، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہنے سے کچھ کرنا بہرحال بہتر تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اس گھر سے باہر قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بوڑھا بہاری میرے ساتھ ہی باہر جانے کو تیار تھا، لیکن میں نے اسے منع کر دیا اور اس کے داماد کو ساتھ لے کر بازار جانے کا فیصلہ کیا۔

اس کے داماد کو بہاری نے میرے ساتھ اچھی طرح متعارف کروا دیا تھا۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں فوج میں حوالدار ہوں۔ شاید اس نے میری "حوالداری" سے متاثر ہو کر یا پھر مجھے متاثر کرنے کے لیے تعارف کے فوراً" بعد جو پہلی خبر سنائی اس نے ایک مرتبہ تو مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

"ادھر بازار میں دو پاکستانی فوجی گرفتار ہوئے ہیں۔ بھگوڑے تھے جانے کس کیمپ سے بھاگ کر آئے تھے؟"

"اف میرے خدا۔" میں نے سوچا۔

جانے کون بدنصیب تھے وہ؟



اس کی بات سے بظاہر تو یہی مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ یہاں نزدیک بھی کوئی نہ کوئی پی او ڈبلیو کیمپ موجود ہے اور یہ بھی کہ بہت سے پاکستانی فوجی فرار بھی ہو چکے ہیں اور میرے اردگرد ہی موجود ہیں۔

ظاہر ہے یہاں آرمی انٹیلی جنس بھی موجود ہو گی۔

مجھے اب ہر قدم محتاط ہو کر اٹھانا تھا۔

بازار میں آ کر ہم یوں ہی مٹرگشت کرتے ریلوے سٹیشن کی طرف نکل گئے۔ یہ بہاری نوجوان میرے میزبان کی حیثیت سے میرے ساتھ تھا اور میں بھی یہی تاثر دے رہا تھا جیسے میں اس کے پاس پنجاب سے سیر کرنے کے لیے آیا ہوں۔ ریلوے سٹیشن سے ایک ٹائم ٹیبل ہاتھ آ گیا۔

گھر واپس پہنچ کر میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ بہار سے مجھے اترپردیش جانا تھا اور اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں یہ سارا سفر زمینی کروں۔ میں نے آئندہ پروگرام سوچنا شروع کیا۔ یہاں سے مظفرپور تک مجھے ریل سے سفر کرنا تھا جس سے پھر پٹنہ اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز گورکھپور۔

پٹنہ میرے ذہن میں اس لیے آیا تھا کہ یہاں میزبان کا دوسرا بھائی رہتا تھا۔ اس نے دوران سفر اپنے سارے خاندان کا تعارف مجھ سے کروا دیا تھا اور آدمی بھی خاصا مہربان دکھائی دیتا تھا۔ شاید قدرت نے اسے میری مدد کے لیے ہی مجھ سے ٹکرایا تھا۔

لیکن۔۔۔!

مظفرپور سے پٹنہ کا سفر کیسے طے ہو گا؟

دل نے کہا اللہ تعالیٰ ضرور کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دے گا۔ اس مرحلہ پر ایک مرتبہ پھر آزادی اور وطن پہنچنے کی شدید خواہش نے حوصلہ افزائی کی۔

میں جان بوجھ کر بازار سے کچھ پھل وغیرہ خرید کے ساتھ لے آیا تھا۔ یہ بے چارے سفید پوش سے لوگ تھے۔ میرے اس جذبے نے انہیں ضرورت سے زیادہ ہی متاثر کر دیا تھا۔ میں نے اپنے بہاری میزبان کو رات سونے سے پہلے بتایا کہ میں اب مظفرپور جاؤں گا اور سے پھر پٹنہ کی طرف لوٹوں گا۔ میں نے اسے بتایا کہ مظفرپور میں میرا ایک دور پار کا عزیز بھی رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ مجھے مل جائے تو میں اس سے کچھ رقم لے کر واپس بہار لوٹ آؤں اور بھائی کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھوں۔

اس نے جھٹ مجھے اپنے بھائی کے پاس پہنچنے کی تاکید کی اور بتایا کہ وہ اس سلسلے میں

میری ہر ممکنہ معاونت کرے گا۔

میں نے بزرگ بہاری کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے روز علی الصبح وہ مجھے ٹرین پر بٹھا کر آگیا۔ روانگی سے پہلے میں اس کے بھائی کشوری لال کے نام تعارفی خط لینا نہیں بھولا تھا۔

ٹرین نے رات ڈھلے مجھے مظفرپور اور اگلے روز پٹنہ پہنچا دیا۔

میں نے اتنی رات گئے کشوری لال کو تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہیں پلیٹ فارم کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

پٹنہ خاصا بڑا شہر تھا۔ یہاں ٹرینوں کی آمدورفت لگی رہتی تھی اور بھانت بھانت کے لوگ بھی پلیٹ فارموں پر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے صبح تک کا وقت جیسے تیسے یہاں گزارا۔

جمع شدہ رقم کام آ رہی تھی۔ خدانخواستہ میں خالی ہاتھ ہوتا تو ابتدا ہی میں مشکلات بڑھ جاتیں۔



صبح ایک سائیکل رکشہ میں سوار میں کشوری لال کے گھر پہنچ گیا۔

جانے خط میں کیا لکھا تھا کہ کشوری لال نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مکان کے اندر لے گیا۔ وہ مجھے "حوالدار صاحب" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور میں گھبرا رہا تھا کہیں کوئی اور اس طرح پکارنے پر ہماری طرف متوجہ نہ ہو جائے۔ کشوری لال دکاندار تھا اور قدرے خوشحال بھی۔ بدقسمتی سے اس کے ہاں اولاد نرینہ نہ تھی۔ دو بیٹیاں تھیں۔

دونوں نے میری خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ میں دوپہر تک آرام کرتا رہا پھر مقامی ایئرانڈیا کے آفس کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے مجھے اب گورکھپور جانا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کیا تھا۔ اس طرح ایک تو چیکنگ کے کم از کم امکانات تھے۔ ایک مرتبہ جہاز میں بیٹھنے کے بعد ظاہر ہے گورکھپور تک تو مجھے کوئی چیک نہ کرتا' بصورت دیگر کچھ بھی ممکن تھا۔

یہاں جہاز سے عام آدمی کے سفر کرنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غربت اتنی ہے کہ لوگ جسم و جان کا رشتہ ہی بمشکل برقرار رکھ پاتے۔ اس لیے میں نے اپنے میزبان کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔



ستنام ٹھاکر کے نام سے میں نے اگلے روز دوپہر کی فلائٹ بک کروائی اور مطمئن ہو کر لوٹ آیا۔ رات دیر گئے تک کشوری لال میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ میں نے پنجابی ہونے کی آڑ میں خود کو خاصا محفوظ کر لیا تھا۔ یوں بھی کسی شک کے بغیر میرے متعلق مزید کچھ جاننے کی جستجو وہ کیوں کرتا؟

میں نے اگلے روز اس سے صبح دکان پر جانے سے پہلے اجازت لے لی اور اسے بتایا کہ میں آج دوپہر پنجاب کی طرف لوٹ جاؤں گا۔ پنجاب میں امرتسر کا ایک جعلی سا ایڈریس اندازے سے میں نے اسے بھی لکھوا دیا۔



پٹنہ کے ہوائی اڈے پر کوئی خاص نگرانی نہیں ہوتی تھی۔ میں عام مسافروں کی طرح ایئرانڈیا کے فوکر جہاز میں سوار ہوا۔ خدا کا شکر تھا کہ پرواز بروقت تھی اور جہاز بھی بحفاظت منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ وگرنہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ جہاز دو گھنٹے کی مسلسل اڑان کے قابل ہے۔

میں نے احتیاطاً" ایک خوبصورت چھوٹا سا بیگ پٹنہ سے خرید لیا تھا۔ کپڑے مناسب تھے اور آنکھوں پر لگی رنگین چشموں کی عینک نے مجھے خاصا معزز بنا دیا تھا۔ میں نے فرار کے بعد سے شیو نہیں کروائی تھی اور آئندہ بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

گورکھپور اتر کر میں شہر چلا آیا اور پھر پیدل ہی مٹرگشت کرنے لگا۔ ذہن میں یہ بات ضرور تھی کہ یہاں نگرانی سخت ہو گی کیونکہ نیپال کی طرف بھاگنے والے لوگ زیادہ تر یہی راستہ اختیار کرتے تھے۔ بہت کم لوگ بھوٹان کی طرف سے نیپال جاتے تھے۔ اب میرے راستے میں بظاہر دو چھوٹے سٹیشن تھے' پھر میں آزاد تھا۔



بازار میں گھومتے ہوئے میری نظر ٹورسٹ انفارمیشن آفس پر پڑی اور یہاں سے کچھ مفت لٹریچر حاصل کر لیا۔ اب مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت تو نہیں تھی' لیکن ضرورت بہرحال تھی۔ شہر کے ایک معمولی سے مسافر خانے میں قیام کیا اور صبح مقامی بس سٹینڈ سے "بال رامپور" جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس بھارت کے آخری سرحدی شہر کی طرف جا رہی تھی اور سفر بھی خاصا لمبا تھا۔ گورکھپور سے جیسے ہی بس نکلی میں نے ایک مرتبہ پھر خدا کا شکر ادا کیا۔ پہلا بڑا سٹاپ "پدرونہ" تھا۔ بس جیسے ہی سٹینڈ میں داخل ہوئی' اسے

سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس نے گھیر لیا۔

ایک مرتبہ تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ جیسے اس نے پچھلے تمام راستے میں مہربانی فرمائی ہے، آئندہ بھی مجھ ناکس پر اپنی رحمت کو سایہ فگن رکھے۔

اترنے والی ہر سواری کا وہ گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ بس یہاں کچھ دیر ٹھہرتی تھی، لیکن میں نے باہر جانے کا خطرہ مول نہ لیا۔۔۔ احتیاطاً" ایک ہندی اخبار میں نے خرید لیا، وہی آنکھوں کے سامنے پھیلا کر بیٹھ رہا۔

میرے پلے تو کیا خاک پڑتا۔ یہ ضرور ہوا کہ سفید پوش پولیس والوں کے اور میرے درمیان کاغذ کی ایک دیوار ضرور تن گئی۔ بس میں میرے علاوہ بمشکل دو تین مرد ہی اور تھے، وہ بھی بچوں کے ساتھ مصروف۔ کھڑکی سے چپٹے ایک چائے والے سے میں نے چائے کا ایک گلاس خریدا اور وہیں بیٹھ کر زہر مار کرنے لگا۔

خدا خدا کر کے بس چلی۔ اب دوسرا بڑا سٹاپ "بانسی" تھا۔ یہاں بھی اسی طرح بس کو چیک کیا گیا اور گزشتہ سٹاپ والی حکمت عملی یہاں بھی میرے کام آئی۔ اب میرا آخری سٹاپ "بال رامپور" آنے والا تھا۔ ایک بات تو طے شدہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ زندہ کبھی بھارتی فوج کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔

"بال رامپور" سرحدی شہر ہونے کے سبب کڑی نگرانی میں تھا۔ خصوصاً" اس طرف سے لوگوں کے فرار ہونے کی اطلاعات نے بھی بھارتی انٹیلی جنس کو خاصا چوکنا کر دیا تھا۔



بس سٹینڈ پر وہی گھورتی ہوئی اور جسم میں گھس جانے والی نظریں موجود تھیں۔ شام شہر میں اترنے لگی تھی۔ چاروں طرف ایک پراسرار اور پرہول سناٹا طاری تھا۔ بالکل یوں جیسے بڑا طوفان آنے سے پہلے سمندر پرسکون ہو جایا کرتے ہیں۔

میں بس سے اتر کر پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ میرا کوئی تعاقب بھی کر رہا ہے۔ اپنے ہمراہی سے جو "بانسی" میں مجھ سے الگ ہوا تھا، میں نے بال رامپور کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ خصوصاً" نیپال کی سرحد کی طرف جانے والا راستہ۔ مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ یہاں پاسپورٹ ویزہ وغیرہ کا بھی کوئی چکر نہیں ہے، صرف کسٹم کی ایک پوسٹ ہے۔



لیکن۔۔۔!

میرے پاس تھا ہی کیا کسٹم کروانے کو؟ صرف ایک بیگ جسے میں نے بے فکرے سیاحوں کی طرح اپنی کمر پر لٹکا رکھا تھا۔

میں اب قدرے ویران علاقے میں آ گیا تھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ پیدل ہی چل رہا تھا۔ تب مجھے یہ علم نہیں تھا کہ یہ تو سرحدی سڑک ہے۔

"کہاں جائیں گے آپ؟"

اچانک ہی جانے کہاں سے دو پستہ قد سے آدمی نمودار ہو کر میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔

"بانسی!" میرے منہ سے فوراً" نکلا۔

"لیکن وہاں سے تو تم آ رہے ہو؟" دوسرے نے جھٹ سے کہا۔

"یہ سڑک تو نیپال کو جاتی ہے۔" پہلا بولا۔

"اوہ سوری! دراصل میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ مجھے بس سٹینڈ کی طرف جانا ہے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا، لیکن ذہنی طور پر میں کسی بھی قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

"آؤ ہم تمہیں بس سٹینڈ تک پہنچا دیں۔" ایک نے کمال مکاری سے کہا۔

"ضرور جاؤں گا تمہارے ساتھ کمبخت۔ کہاں سے آن مرے ہو۔۔۔؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

ایک لمحے کا ضیاع بھی میرے لیے کیا قیامت ڈھا سکتا تھا۔ اس کا مجھے بخوبی احساس تھا۔ یہ لوگ ظاہر ہے مجھ پر شک کر رہے تھے اور مجھے شاید یہاں سے کہیں اور لے جا کر چیک کرنا چاہتے تھے اور معمولی سی چیکنگ بھی میری اصلیت کا بھانڈا پھوڑ دیتی۔

"شکریہ" کہہ کر میں نے تیزی سے ان کی طرف رخ بدلا کہ میرے قریب کھڑا ہوا سیکورٹی والا تو بالکل گڑبڑا کر رہ گیا۔

میری یہ حرکت سو فیصدی ارادی اور طے شدہ پلان کے مطابق تھی۔ جیسے ہی ان میں سے ایک چونکا۔ میری ٹانگ اپنی جگہ سے اٹھی اور میں نے پورے زور سے سامنے والے کے پیٹ کو نشانہ بنایا۔ وہ تو پیٹ پر ہاتھ رکھ کر الٹ پڑا۔ دوسرے کی گردن پر میرا ایک ہی

ہاتھ ایسا پڑا کہ اگلے دو تین گھنٹے تک اس کے ہوش میں آنے کے امکانات نہیں تھے۔

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سرحد کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہاں کوئی باقاعدہ سرحدی فوج یا سیکورٹی نظام نہیں تھا۔ اس بات کی مجھے بہرحال تسلی تھی۔

ابھی بمشکل چند قدم بھاگا تھا کہ ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنے بازو میں انگارہ گھس جانے کا احساس ہوا۔ گردن گھما کر دیکھا تو میں سناٹے میں آگیا۔

میرے اندازوں کے برعکس جس شخص کے پیٹ میں لات ماری تھی، وہ بہت سخت جان ثابت ہوا اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے ہی دوسرے ہاتھ سے فائرنگ کر رہا تھا۔

سوائے بھاگنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔۔۔۔!!

میں دیوانہ وار بھاگ رہا تھا اور وہ دیوانہ وار میرے تعاقب میں فائرنگ کر رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کی گولیاں اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ پہلے بھی میں غلط فہمی کا شکار ہوا تھا۔ میں اب سرکنڈوں میں گھس گیا تھا اور اندر ہی اندر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے دوبارہ پستول لوڈ کرنے تک میں اس کی رینج سے باہر نکل چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ بھی ہو، کم از کم چند منٹ تک وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکے گا اور یہی چند منٹ مجھے درکار تھے۔

میں اندازے سے بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

میرے بازو سے خون مسلسل جاری تھا۔

ایک پناہ گاہ میسر آنے پر میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے بائیں بازو پر گولی لگی تھی ۔ جرسی اور قمیص اوپر اٹھا کر دیکھا۔ خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا، لیکن فوجی زندگی کے تجربے نے بتا دیا تھا کہ گولی بازو کے اندر نہیں گھسی، شاید گہرا گھاؤ لگا کر پھسلتی چلی گئی ہے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کم از کم ہڈی تو محفوظ رہی تھی۔ بیگ میں رکھی واحد بنیان پھاڑ کر میں نے قمیص کے اوپر سے ہی کس کر پٹی باندھ لی۔ اس طرح کم از کم خون تو بہنے سے رک گیا تھا، لیکن درد رکنے کی بجائے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے وہاں رک کر وقت ضائع کرنے کے بجائے آگے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر ا کیونکہ یہاں کم از کم مجھے طبی امداد میسر نہیں آ سکتی تھی۔ بازو لٹکانے سے چونکہ خون ۔ اندیشہ تھا اس لیے میں نے اپنے گلے میں بنیان لٹکا کر زخمی بازو کو گلے کا ہار بنا لیا تھا۔





خیریت گزری اور میں جیسے تیسے رات کے پہلے پہر ہی میں سرحد عبور کر گیا۔

اس کا احساس مجھے اس سفید رنگ کی برجی سے ہوا، جس پر تیر کے ایک نشان سے بھارتی اور نیپالی علاقے کی نشاندہی کی گئی تھی۔

نیپال کی سرحد میں داخل ہونے کا احساس ہی اتنا تقویت بخش تھا کہ مجھے اپنے بازو کا درد بھی بھول گیا۔ میری آنکھیں بے اختیار تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں کی غالب آبادی مسلمان ہے اور میرا یہ ایمان تھا کہ ایک مسلمان خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں آباد ہو اور کیسے ہی نظریات کیوں نہ رکھتا ہو، اس کے دل میں کہیں نہ کہیں اپنے مسلمان بھائی کا درد بھی موجود رہتا ہے۔ میرا دل کہتا تھا کہ یہاں مجھے ضرور مدد میسر آ جائے گی۔

میں اندازے سے ایک طرف چل رہا تھا۔

رات کا شاید آخری پہر تھا جب مجھے دور سے ایک گاؤں کے آثار دکھائی دینے لگے۔

# منزل تو ملی پر.........

پو پھوٹ رہی تھی جب میں اس گاؤں میں داخل ہوا۔ اپنے بازو کے درد پر میں نے صرف مضبوط قوت ارادی کے بل بوتے پر ہی قابو پا رکھا تھا۔ درد نے تو مجھے تڑپا دینے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے جب مجھے یہاں ایک سمت سے اذان کی آواز سنائی دی۔ بے اختیار میرے قدم اس طرف اٹھ گئے۔

مسجد ایک چھوٹے سے چھپر تلے صفیں بچھا کر ترتیب دی گئی تھی۔ یہاں ایک بوڑھا مسلمان اذان دے رہا تھا۔ میری شکل پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ہمدردی کے آثار نمودار ہویدا ہوئے۔ اس نے میرے سلام کا جواب بڑی شفقت سے دے کر اردو زبان میں میرا حال پوچھا۔

میں بے جان سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس اثناء میں دو تین نمازی وہاں آ گئے۔ ان سب کے پاس میرے لیے ہمدردی تھی اور مجھے یہی درکار تھا۔

"بنگال سے آئے ہو----؟"

ایک بزرگ نے دریافت کیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گھبرانا نہیں۔ تم اپنوں میں اور محفوظ ہو۔" دوسرے بزرگ نے مجھے حوصلہ دیا۔

نماز سے فراغت پا کر وہ لوگ مجھے ایک مقامی حکیم صاحب کے پاس لے آئے۔ اس علاقے میں کسی ہسپتال یا ڈاکٹر کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حکیم صاحب نے میرے زخم پر کچھ سفوف چھڑک کر ایک میلی سی پٹی باندھ دی اور کھانے کو کچھ گولیاں بھی دے دیں۔

ان لوگوں کی زبانی مجھے علم ہوا کہ جو لوگ بنگلہ دیش سے بھاگ کر آتے ہیں، انہوں نے یہاں نزدیک ہی ایک قدرے بڑی مسجد میں کیمپ لگا رکھا ہے اور وہیں سے پھر آگے بھیراوا جانے کے لیے بس ملتی ہے، جہاں سے کھٹمنڈو کو راستہ جاتا ہے۔

میں ایک نوجوان کی راہنمائی میں اس طرف چل دیا۔ روانہ ہونے سے پہلے ایک بزرگ نے مجھے اپنے گھر لے جا کر ناشتہ کروایا۔ یہ نوجوان ان کا بیٹا تھا۔ اس کے ساتھ روانہ کرنے سے پہلے انہوں نے مجھے ایک کونے میں لے جا کر کہا۔

"بیٹا! ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں تمہاری جو خدمت کرنی چاہیے' افسوس نہیں کر سکتے۔ مشرقی پاکستان صرف پاکستان کا نہیں عالم اسلام کا دکھ ہے۔ ہمارے دل بھی اس پر خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ بیٹا! بظاہر تو تم اس ملک میں محفوظ ہو' لیکن خیال رکھنا کہ یہاں بھارتی انٹیلی جنس کا جال بچھا ہوا ہے۔ کسی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار نہ کرنا۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور دل میں ان کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات لیے چل دیا۔ قریباً" پانچ میل کی دوری پر وہ مسجد تھی جسے اب پناہ گزینوں کے کیمپ کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ میں دل ہی دل میں معظم اور عظمیٰ کے یہاں مل جانے کی دعائیں مانگتا اسی طرف جا رہا تھا۔ کیمپ سے کچھ فاصلے پر مجھے کچھ آدمی باہر ایک نالے کے نزدیک کھڑے دکھائی دیئے۔

"معظم----!" اچانک ایک شکل دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

معظم بھاگتا ہوا مجھ تک پہنچا اور بغلگیر ہو گیا۔ اس نے بے چینی سے میرا حال دریافت کیا اور میں نے معمولی زخم کہہ کر اسے ٹال دیا۔

"عظمیٰ کہاں ہے؟" میں نے بے قراری کے عالم میں دریافت کیا۔ ہم دونوں اب مسجد کے صحن تک پہنچ گئے تھے۔ معظم نے میری طرف زخمی نظریں اٹھائیں اور بولا۔

"میرے پاس تمہیں سنانے کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

اس کے منہ سے نکلے الفاظ برچھی کی طرح میرے کلیجے میں اتر رہے تھے۔ میں تصویر حیرت بنا ٹکر ٹکر معظم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نجانے کس طاقت نے میری آنکھیں کھلی اور ذہن بیدار رکھا ہوا تھا ورنہ تو میری تمام حسیات کو ایک ایک کر کے موت آ چکی تھی---- جو بات وہ کہنے جا رہا تھا' میں نے اس کا ادراک کر لیا۔

ایک فوجی کی حیثیت سے میں ذہنی طور پر اس کی بات سننے کے لیے تیار بھی تھا' لیکن آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ میں اس خبر کو سن کر زندہ کیسے رہا؟

کاش زندہ رہنا یا مرجانا کوئی اختیاری عمل ہوتا۔



"مجھے افسوس ہے ہم تمہاری امانت کی رکھوالی نہ کر سکے۔"

معظم کی آنکھیں کہیں دور خلاؤں میں گمشدہ لمحہ تلاش کر رہی تھیں۔ اسے دراصل ابھی تک یہ اندوہناک حادثہ جو میرا نصیبا بن چکا تھا' مجھ تک منتقل کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اصل میں جس طرح زمین کو اپنے مدار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح مناظر فطرت ماحول سے جڑے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح کچھ لوگ اپنی زمین اور ماحول کا جزو لاینفک ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی اصل سے ہٹ نہیں سکتے کہ اس طرح وقت کی نبضیں ساکت ہو جاتی ہیں۔ ان کے بغیر اس ماحول کو موت آ جاتی ہے---- بس اس طرح تھی عظمیٰ----!

بہت مضبوط بندھنوں نے جکڑ رکھا تھا اسے----!

اس نے دم رخصت مجھ سے کہا تھا---- "کوئی اپنے نظریے سے کٹ کر کیسے زندہ رہ سکتا ہے---- یہ کیسے ممکن ہے کسی کا جسم یہاں ہو اور روح کہیں اور---- نہیں یہ سب لوگ جذباتی پن کا شکار ہیں۔ انہیں بہت جلد ہوش آ جائے گا' تب نفرت کی یہی شدت محبت میں بدل جائے گی۔ تم مایوس نہ ہونا جس طرح میں مایوس نہیں ہوئی۔ دیکھو! میرا دکھ کتنا بڑا ہے۔ مجھے اپنے والدین کے خلاف' ان کے خلاف جنہوں نے مجھے جنم دیا' جنگ لڑنا پڑی۔ یہ نظریے کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ سچائی کے راستے پر اکیلے نہیں' تمہارے سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہاری ماں کی' بہن کی' سب کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

اس نے جو کہا تھا سچ کر دکھایا----!

معظم مجھے بتا رہا تھا۔

"ہم لوگوں نے ایک پرانی اور خستہ عمارت میں پناہ لے رکھی تھی۔ وہی ہمارے لیے نزدیکی بازار سے کھانے پینے کی اشیاء لایا کرتی تھی۔ تین روز سے ہم وہاں چھپے ہوئے تھے۔ باہر نکلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہاں تو آگ لگی ہوئی تھی۔ مکتی باہنی کے خونخوار درندے ہماری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ہندو فوجیوں کے ہاتھوں نہ کسی کا اسباب محفوظ تھا نہ عزت۔ ہزاروں محب وطن بنگالی بھی ہماری طرح جانیں چھپائے پڑے تھے۔ کوئی یہاں کوئی وہاں۔

اس منحوس رات کو جب ہم وہاں سے نکلنے کے لیے پر تول رہے تھے' اچانک ہی مکتی باہنی کے بھیڑیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان لوگوں نے وارننگ دی کہ مقامی اور غیر مقامی الگ ہو جائیں۔ بنگالیوں سے کہا گیا کہ وہ باہر آ جائیں۔ ہمارے ساتھ پندرہ بنگالی مرد اور عورتیں

تھیں۔ سب الگ ایک ایک کر کے باہر نکل گئے، لیکن........"

اتنا کہہ کر معظم چپ ہو رہا۔

اس کی آنکھیں کسی بھی لمحے چھلک جانے کو تیار تھیں۔ یوں دکھائی پڑتا تھا جیسے اس نے بڑے جبر سے آنسوؤں کے تیز دھارے کے سامنے ضبط کا بند باندھ رکھا ہے---- لیکن ہزار ضبط پر بھی اس کا گلا رندھ گیا۔

"شیر افگن! یار وہ بڑی عجیب لڑکی تھی۔ بڑی بہادر لڑکی تھی وہ---- ہم سے زیادہ۔ اس نے باہر جانے سے انکار کر دیا۔ مصلحت کوش تو تھی ہی نہیں وہ۔ میں نے اسے حالات کی نزاکت کا احساس دلایا۔ اسے سمجھایا کہ وہ اپنی جان بچا سکتی ہے۔ ہمارے ساتھ رہنے پر سوائے موت کے اور کچھ نہیں اسے ملنے والا۔

لیکن........ اس نے ہماری ایک نہیں سنی۔ وہ ایک ہی بات کہتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔

"معظم بھائی! میں نے سب کچھ کھو کر ایک شناخت اپنائی ہے۔ مسلمان اور پاکستانی کی شناخت۔ تم چاہتے ہو اب اسے بھی کھو دوں۔ اس سے بھی دستبردار ہو جاؤں۔ نہیں معظم بھائی! اگر میں نے یہی سودا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر لیتی۔ اب تو میری قربانیاں، میری جدوجہد ثمر آور ہونے لگی ہے۔ جب مجھے ریاضتوں کا انعام ملنے کا وقت آیا ہے تو تم مجھے روک رہے ہو---- یہ کیسے ممکن ہے۔"

"لیکن تمہارے ساتھ ایک اور زندگی بھی وابستہ ہے عظمیٰ۔ تم کسی کی امانت ہو۔ میں نے تمہاری حفاظت کا فریضہ سنبھالا ہے۔ اگر زندہ بچ کر کبھی شیر افگن تک پہنچ ہی گیا تو اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ان سے کہئے گا کہ بس میرا ان کا ملاپ اتنا ہی تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک منزل کے مسافر راستے کے کسی موڑ پر کچھ دیر کے لیے ساتھ چلیں اور الگ ہو جائیں۔ بس اتنی ہی مسافت ہمیں مل کر پاٹنا تھی۔ اس کے بعد ہمیں الگ ہو جانا تھا۔" اس نے بڑے مضبوط ارادے سے جواب دیا۔

"میں نے اپنی سی کوشش کر ڈالی لیکن وہ نہیں مانی۔ وہ بہت عظیم لڑکی تھی یار۔" معظم نے کہا۔

اس کا گلا رندھ گیا۔

میں ٹکر ٹکر اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں آنسوؤں کی تپش سے سلگنے



لگی تھیں۔ ضبط کا یارا نہیں رہا تھا اس میں۔ آنسو اس کے گالوں سے بہہ کر اس کے دامن کو بھگو رہے تھے۔

لیکن مجھے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

"ہاں اس نے آخری لمحے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ایک رقعہ کسی طرح تم تک پہنچا دوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک بوسیدہ سا لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا۔

میں نے کسی میکانکی عمل کے تابع وہ لفافہ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"شیر افگن! معاف کر دینا یار۔ بہت کوشش پر بھی اسے بچا نہیں سکا۔ ہمارے پاس صرف ایک پستول تھا۔ ہم چھ آدمی اور تین عورتیں رات کے اندھیرے میں مکان کے پچھلے دروازے سے باہر نکلے---- میرے تمام ساتھی جانتے تھے کہ گرفتاری کی صورت میں انہیں ایک ذلت آمیز موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بصورت دیگر بھی موت تھی----!

لیکن----!

اس لمحے عظمیٰ نے ہمارے دلوں میں آگ لگا دی تھی۔ وہاں کوئی بھی ذلت آمیز موت کو گلے لگانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہم نے اس سے پہلے مشرقی پاکستان کی سڑکوں، گلیوں، بازاروں، کھیتوں اور کھلیانوں میں پاکستانیوں کے بے گوروکفن لاشے جس عبرت ناک حالت میں دیکھے تھے، اس کے بعد تو یوں ہی زندہ رہنے کی خواہش دم توڑ چکی تھی۔

منصوبہ بنا کر پہلے عورتیں باہر نکلیں، پھر مرد---- سب سے آخر میں مجھے باہر جانا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مکان کی یہ سمت محفوظ تھی اور ہم اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر باہر نکل سکتے تھے۔

ایک دوسرے کو خدا کے حوالے کر کے ہم ایک ایک کر کے الوداع ہو رہے تھے۔ ابھی دو عورتیں ہی باہر نکلی تھیں کہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں بے قراری کے عالم میں باہر لپکا اور باہر نکلتی عظمیٰ کا بازو پکڑ کر ایک طرف چھلانگ لگائی۔ فائرنگ کی سمت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ شاید کوئی بدمست مکتی باہنی کا درندہ اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔

میں عظمیٰ کا بازو پکڑ کر بھاگ رہا تھا۔ بمشکل چند گز ہی بھاگے تھے کہ اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بدن ڈگمگایا۔ میرے سنبھالتے سنبھالتے وہ زمین بوس ہو گئی۔

شیرافگن! میں نے جھک کر دیکھا۔ اس کے سینے میں پورا برسٹ لگا تھا۔ اس کے منہ سے "اللہ---- پاکستان" ہی نکل پایا اور........"

معظم کے نطق کو موت آ گئی۔

اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکا اور سسکیاں بھرنے لگا۔

☆○☆

مجھے زندگی کا احساس ان گرم آنسوؤں نے دلایا جو اب میرے گالوں سے پھسل کر میرا دامن تر کرنے لگے تھے۔ مجھے اپنے قدم زمین سے اکھڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ بازو کا درد جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے بدن سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے میں آہستہ آہستہ مر رہا ہوں۔ اس دم توڑتے پرندے کی طرح جو پیاس کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔

یا پھر اس مریض کی طرح جس کا چراغ سحری کسی بھی لمحے گل ہونے والا ہو۔ میں بے دم سا ہو کر وہیں مسجد کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ عظمیٰ کا آخری خط میرے ہاتھ میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

ہم دونوں رونے لگے----!

اس لمحے ہم دونوں ایک ہی درد کا شکار تھے۔

ہمارا دکھ مشترک تھا۔

اس سے آگے کی کہانی معظم نے مجھے نہیں سنائی---- نہ میں نے ایسی خواہش کی۔ ہم دونوں یہ سمجھتے تھے کہ انجام یہی تھا۔ جو کچھ بھی تھا اس سے پہلے تھا' اس کے بعد نہیں۔

میں نے زندگی بچانے کے لیے جو جو دکھ جھیلے تھے۔ جن جن عذابناکیوں کا سامنا کیا تھا' وہ محنتیں' وہ ساری ریاضتیں اکارت گئیں۔

مجھے زندگی' اپنا آپ اور وہ سب کچھ جو یہاں موجود تھا' بے وقعت دکھائی پڑتا تھا۔

پھر جیسے مجھے یہ سوچ کر صبر آ گیا کہ میں شاید عظمیٰ کے لائق تھا ہی نہیں۔

وہ تو میری سوچوں سے بہت آگے' بہت زیادہ عظیم تھی۔

جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق تھی ہی نہیں۔

وہ تو کسی اور دنیا سے سفر پر نکلی تھی' راستہ بھول کر میری دنیا میں آ گئی اور جونہی راستہ اسے ملا' لوٹ گئی۔ اس کا کہا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں دھماکے پیدا کر رہا تھا----



اسے مرتے وقت بھی پاکستان اور خدا ہی یاد تھا' اور کچھ نہیں۔

حالانکہ اسے تو اپنی ماں کو یاد کرنا چاہیے تھا۔

اسے سوچنا چاہیے تھا کہ وہ کس نوجوانی کے عالم میں موت کی وادی پُرخار میں قدم رکھ رہی ہے۔

اس نے دیکھا ہی کیا تھا ابھی۔

ابھی تو اس نے زندگی سے اپنے حصے کی کوئی ایک خوشی بھی وصول نہیں کی تھی۔ وقت نے آج تک سب کے حصے کے غم جیسے اکٹھے کر کے اس کی جھولی میں ڈال دیئے تھے۔

یہ اس کے مرنے کی عمر نہیں تھی---- لیکن وہ مر گئی۔

میرے خواب بھی اس کے ساتھ ہی مر گئے۔

جانے کب تک میری آنکھیں اس کی محبتوں' صداقتوں' جانثاریوں کو روتی رہیں؟ جانے کب معظم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے احساس دلایا کہ میں زندہ ہوں۔

اپنے زندہ ہونے کا احساس بسااوقات کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ یہ تجربے کی بات ہے محسوس کرنے کی نہیں۔

"شیرافگن! عظمیٰ نے تمہیں ہارنا نہیں سکھایا' لڑنا سکھایا ہے۔ وہ بھی لڑتی رہی' زندگی کی آخری سانس تک اس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بہادر سپاہی ہتھیار نہیں ڈالا کرتے۔ شیرافگن! یار بزدل نہ ہو جانا۔ اس کی روح کو شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔"

جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔

میں ہونقوں کی طرح ایک ٹک اس کے منہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ عظمیٰ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقدس سی سنجیدگی اس کے چہرے پر طاری ہو جاتی تھی۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔

میرے بازو میں مستقل رہنے والا درد غائب ہو چکا تھا۔ میرا تو سارا بدن بے حس تھا۔

بس میں کسی "معمول" کی طرح اس کے اشاروں پر عمل کر رہا تھا۔

"چلو باہر چلتے ہیں۔" معظم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ہم دونوں باہر آ گئے۔

ہمارے دائیں بائیں مظلوم اور نارسیدہ چہرے اپنے اپنے روگ اپنے اپنے اندر پالے ڈھیر کی شکل میں دیواروں سے ٹیک لگائے یا پھر نڈھال ہو کر نیم بے ہوش یا مدہوشی کے عالم میں موجود تھے۔ کسی نے میری طرف دیکھا یا نہیں' مجھے اس کا احساس ہی نہیں تھا۔

میری جدائی تم پر بہت شاق گزرے گی' لیکن اسے کبھی زندگی کا روگ نہ بنانا۔ میری محبت کی لاج نبھانے کی سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ جس مشن اور نظریے کے لیے میں جان دے رہی ہوں' وہ مشعل روشن رہے۔

اسے کبھی بجھنے نہ دینا۔۔۔!

دشمن ایسٹ پاکستان پر بس نہیں کرے گا' اس کے عزائم بہت بھیانک ہیں۔ ابھی اس سانپ نے اپنا ایک ہی بل کھولا ہے۔ ابھی اس نے صرف ایک ہی ڈنک ہمارے جسد ملی پر مارا ہے' وہ ہمیں اور ڈسے گا۔ اس کا زہر ابھی اور پھیلے گا شیرافگن! تم میری قوم کی رگوں میں اس زہر کو کبھی نہ پھیلنے دینا۔ اس کا کوئی نہ کوئی تریاق ضرور تلاش کر لینا۔

دشمن نے ہمیں یہاں بھی نااتفاقی کے تیر سے شکار کیا ہے' آئندہ بھی وہ صوبائی اور لسانی عصبیت کا زہر ہماری رگوں میں گھولے گا۔

شیرافگن! خدا کے لیے میری قوم کو اب اس موذی کے دام تزویر میں نہ پھنسنے دینا۔ پاکستان کے مسلمانوں کو بتاتے رہنا کہ ہماری بقاء سندھی' پنجابی' بلوچ اور بنگالی میں نہیں صرف پاکستانی رہنے میں ہے۔ ہم سب پاکستان سے ہیں۔ اول و آخر ہماری امید صرف پاکستان ہے اور کچھ نہیں۔

میری قوم کے لوگوں تک پاکستان کی بقاء پر مرمٹنے والی ایک ناتواں لڑکی کی یہ فریاد ضرور پہنچا دینا کہ قوموں کی بقاء جھک جانے میں نہیں' کٹ جانے میں ہے۔

میں نے مر کر اپنی قوموں کو۔۔۔ یہی پیغام دینا چاہا ہے۔

شیرافگن!

میری دعا ہے تم بخیریت اپنے وطن لوٹو۔ ماں جی سے میرا سلام کہنا۔ پاکستان کی فضاؤں' ہواؤں' دریاؤں' پہاڑوں' ندی نالوں اور شاہراہوں کو میرا سلام کہنا۔

خدا پاکستان کو سلامت رکھے۔ یہی ہے ایک مرنے والے کی اپنے



ملک کے لیے آخری دعا۔۔۔!!

وقت کم ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ اتفاق سے یہ قلم کاغذ ہاتھ لگ گیا تھا۔ خدا سے دعا ہے کہ اگر میں مرجاؤں تو میرا پیغام تم تک ضرور پہنچ جائے۔

تمہاری
عظمیٰ



میں خط پڑھ رہا تھا اور میری آنکھیں عظمیٰ کی محبتوں اور عظمتوں کے حضور میں خون رو کر اپنا خراج عقیدت گزار رہی تھیں۔

وہ زندہ رہ کر تو عظیم تھی ہی۔

مر کر عظمت کی بلندیوں کو پا گئی۔

اس نے مرتے مرتے بھی اپنا فرض نہیں بھلایا تھا۔ اس خط میں عظمیٰ نے اپنی بچھڑ جانے والی' کھو جانے والی' چھن جانے والی محبت کا ماتم نہیں کیا تھا۔

اسے زندگی کے آخری لمحات میں بھی اپنے ملک کی سلامتی کی فکر دامن گیر تھی۔ میں ان لمحات کو چشم تصور میں لا سکتا تھا جب وہ مر رہی ہو گی تو اس کے جذبات کا کیا عالم ہو گا۔ تب اس نے کس کس کو یاد کیا ہو گا۔۔۔؟ میں محسوس کر سکتا تھا کہ زندگی کے ان آخری لمحات میں بھی اسے پاکستان کی سلامتی کی فکر ہی دامن گیر رہی ہو گی۔

میں نے نہایت عقیدت سے خط کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور مسجد میں لوٹ آیا جہاں معظم بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ عظمیٰ کا خط پڑھنے کے بعد مجھے قرار سا آ گیا۔ دل کی بے کلی قدرے کم پڑ گئی تھی۔

ہم نے مغرب کی نماز اکٹھے ادا کی۔

رات کو مسجد ہی کے ایک کونے میں لیٹ رہے۔ ہماری طرح اور بھی بہت سے بدنصیب یہاں موجود تھے۔ بازو کے زخم نے ایک مرتبہ پھر مجھے تڑپانا شروع کر دیا۔ میں بیک وقت ذہنی اور جسمانی عذاب کا شکار تھا۔

اپنی بے بسی پر مجھے خود رحم آنے لگا تھا۔

یہاں دور دور تک کوئی ڈسپنسری بھی موجود نہیں تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ کبھی اپنے

بازو کو اصلی شکل میں دیکھ پاؤں گا۔

معظم سے زیادہ میرے درد کو اور کون محسوس کر سکتا تھا۔ میرے ساتھ وہ بھی تڑپ رہا تھا۔ نہ تو یہاں ہم ڈھنگ سے مرہم پٹی کر سکتے تھے نہ ہی کوئی ادویات میسر تھیں اور نزدیک ترین مقام جہاں سے ہم کھٹمنڈو میں اپنے سفارت خانے سے رابطہ قائم کر پاتے' وہ بھی یہاں سے کم از کم تیس میل دور تھا۔

حقائق کی تلخ دنیا میں لوٹتے ہی مجھ پر پہلا انکشاف یہ ہوا کہ میں ایک بھگوڑا جنگی قیدی ہوں جس کے ہاتھوں متعدد بھارتی سورماؤں نے زندگی سے ہاتھ دھوئے ہیں۔ میرا شمار پہلے ہی خطرناک قیدیوں میں ہوتا تھا' اب میرے جرائم کی فہرست مزید طویل ہو گئی تھی اور اگر بھارتی ملٹری انٹیلی جنس کو یہ علم ہو جاتا کہ میں نیپال کی سرحد میں موجود ہوں تو وہ مجھے کبھی بچ کر نہ جانے دیتے۔ میں نے بھارتی فوج کا غرور توڑا تھا اور یہ کوئی قابل معافی جرم نہ تھا۔

اس جمگھٹے میں بھارتی انٹیلی جنس کے لوگ بھی موجود تھے۔ مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا اور یہ لوگ مظلوم اور ستم رسیدہ مہاجرین کی شکل میں ہی یہاں قیام کیے ہوئے تھے۔ ان کا مقصد صرف یہی تھا کہ مجھ جیسے لوگوں کو یہاں سے بچ کر نہ جانے دیں۔

اب تک دو تین آدمی مجھ سے انٹرویو کر چکے تھے۔ بظاہر تو سب نے ستم رسیدہ شکلیں بنا رکھی تھیں' لیکن میں مظلومیت کے اس نقاب کے عقب میں چھپے ان کے اصلی چہرے پہچان سکتا تھا۔ میں نے پہلے سے تیار کردہ من گھڑت کہانی تینوں کے گوش گزار کر دی تھی۔

اس کہانی کے مطابق میں ایک ٹھیکے دار کا منشی تھا۔ میرا مالک مکتی باہنی والوں نے مار دیا تھا' لیکن مجھے بے ضرر جان کر اذیتیں دے کر پھینک گئے۔ اپنی دانست میں انہوں نے مجھے مار ڈالا تھا' لیکن میں کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل گیا اور دھکے کھاتا یہاں تک آن پہنچا ہوں۔

ہمیں کھٹمنڈو جانے کے لیے پہلے بھیراوا جانا تھا جہاں سے ہوائی سروس میسر تھی۔

یہاں سے بھیراوا پہنچنے کے لیے دن بھر میں ایک آدھ لاری ہی چلا کرتی تھی' جس کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میرے پاس موجود کرنسی نے ہمارے مسائل قدرے حل کر دیئے تھے' لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ ہم بھیراوا کیسے پہنچیں گے جہاں ۔ ایک چھوٹے جہاز کے ذریعے ہمیں کھٹمنڈو جانا تھا اور وہاں اپنے سفارت خانے کے توسط ۔ پھر اپنے ملک کو سفر کرنا تھا۔

اگر ہم کسی سواری کے انتظار میں ایک آدھ دن اور یہاں گزارتے تو میرا زخم پھر ک قابل اصلاح نہ رہتا اور عین ممکن تھا یہ زہر سارے جسم میں پھیل جاتا۔



صبح تک ہم دونوں کروٹیں بدلتے رہے۔ اس بات کا خطرہ بھی موجود تھا کہ سوتے میں کوئی ہماری جیبوں پر ہاتھ صاف نہ کر جائے۔ یہاں موجود تمام لوگ مہاجر نہیں تھے' کچھ جرائم پیشہ چہرے بھی نظر آ رہے تھے جو لٹ پٹ کر آنے والوں کی رہی سہی پونجی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔



علی الصبح ہماری آنکھ موٹر سائیکل کے انجن کے شور پر کھلی۔ ہم دونوں بخوبی اندازہ لگا سکتے تھے کہ یہ آرمی کی موٹر سائیکل ہے۔ ایسے علاقوں میں عموماً" موٹرسائیکلوں سے باربرداری کا کام لیا جاتا تھا۔

معظم کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرا رہے تھے۔ خود میری حالت بھی اس سے الگ نہیں تھی۔ اس کے لمبے تڑنگے قد کاٹھ نے شاید یہاں کسی کو شک میں مبتلا کر دیا تھا اور اب وہ لوگ کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے----!

یہی تھا وہ خیال جو ہم دونوں کے ذہن میں یکبارگی آیا۔

ابھی سپیدہ سحر نمودار ہی ہوا تھا اور فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی تھی۔ معظم کا چہرہ میری طرف تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

کچھ کر گزرنے کا فیصلہ!

گو کہ میری جسمانی حالت اب اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ کچھ کر پاتا' لیکن بزدلوں کی طرح مرنے پر میں ہزار بار لعنت بھیجتا تھا۔

موٹر سائیکل کی آواز بند ہو گئی۔ ہم نے اپنے نزدیک ہی کمبل اوڑھ کر لیٹے ہوئے اس شخص کو اٹھ کر باہر جاتے ہوئے دیکھا جس نے آج میرا بڑا تفصیلی جائزہ لیا تھا اور جو پچھلے تین روز سے معظم کے ساتھ بڑی دوستی کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔ اب تو ہمارا خاموشی سے لیٹے رہنا ناگزیر تھا۔

"تم یہیں رہنا---- میں دیکھتا ہوں۔" معظم نے اس کے تعاقب میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اٹھ گیا اور اب دبے قدموں اسی مشتبہ شخص کے تعاقب میں باہر چلا گیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی واپسی کا منتظر تھا۔

معظم نے واپس آنے میں قریباً" بیس منٹ لگا دیئے۔

مسجد کا مؤذن شاید اذان دینے کی تیاری کے لیے وضو کر رہا تھا جب معظم میرے پاس پہنچا۔

"باہر چلو---!" اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے کمبل اوڑھا اور اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ یہ بات میں نے خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ معظم نے اپنا اور میرا تھیلا بھی اٹھا لیا تھا' جس کا مطلب یہ تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔



"خیریت---؟" میں نے باہر نکلتے ہی دریافت کیا۔

"فی الحال تو اللہ نے کرم کیا اور میں نے بروقت حالات پر قابو پا لیا ہے۔ موٹر سائیکل سوار بھارتی انٹیلی جنس کا کوئی مقامی آدمی ہے جو یہاں دوسرے تیسرے دن رپورٹ لینے آتا ہے۔ یہاں کی رپورٹ ملنے پر ہی کوئی کارروائی کی جاتی ہے۔ جو شخص یہاں سے گیا تھا اس نے تمہارے اور میرے متعلق شک ظاہر کیا ہے۔ میں نے نزدیک سے چھپ کر ان کی باتیں سن لی تھیں۔ رپورٹ دینے والا تو لوٹ گیا' وہ مسجد کی بجائے کسی دوسری سمت گیا ہے۔ موٹر سائیکل سوار نزدیکی کچے راستے تک موٹر سائیکل کو سٹارٹ کیے بغیر دھکیلتا ہوا لایا۔ اس نے شاید یہاں سے موٹر سائیکل سٹارٹ کرنی تھی۔ میں نے اسے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے اس پر قابو پا لیا---!" معظم نے مجھے مختصر واقعات بتائے۔

اس نے موٹر سائیکل سوار کو وہیں ڈھیر کر کے نزدیکی ویرانے میں پھینک دیا تھا۔ ایک پستول اور کچھ مقامی کرنسی اس سے برآمد ہوئی تھی۔ موٹر سائیکل وہیں موجود تھی۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" اس نے میری رائے جاننا چاہی۔

"میرے خیال سے یہاں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔ نہ جانے وہ کمبخت زندہ ہے یا مر گیا۔ کہیں وہ جلدی ہوش میں آ گیا تو معاملہ بگڑ ہی نہ جائے۔" میں نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

"اس کی تم پروا نہ کرو۔ اول تو وہ ہوش میں آنے کے لائق رہا ہی نہیں۔ بہت سخت جان ہوا تو دوپہر تک بمشکل اس کے حواس بحال ہوں گے۔" معظم نے مجھے تسلی دی۔

"کیوں نہ اس موٹر سائیکل پر یہاں سے نکلا جائے۔" میں نے کہا۔



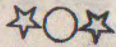
"تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں بھیراوا کی سمت جانے والے راستے کے متعلق خاصی معلومات جمع کر لی ہیں۔" معظم بولا۔

ہم دونوں باتیں کرتے موٹر سائیکل کے نزدیک پہنچ چکے تھے جس پر نیپال کی نمبر پلیٹ لگی تھی' لیکن معمولی عقل رکھنے والا کوئی بھی شخص یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ بھارتی فوج کی موٹر سائیکل ہے۔

یہ شخص آیا تو غلط ارادے سے تھا' لیکن ہمارے لیے تائید ایزدی ثابت ہوا' ورنہ جانے کب تک ہم یہاں پڑے رہتے۔ معظم نے موٹرسائیکل اسٹارٹ کی اور میں کمبل جسم سے لپیٹ کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا' لیکن صبح کی ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں سرایت کر رہی تھی۔ اونچے نیچے ہموار' ناہموار راستوں پر دوپہر تک ہمارا سفر جاری رہا۔ اس دوران ہم نے بھیراوا جانے والی سڑک ڈھونڈ لی تھی اور اس پر سفر کر رہے تھے۔

راستے میں دو جگہ موٹرسائیکل روک کر ہم نے سڑک کے کنارے بنے چائے کے سفری ہوٹلوں پر چائے پی۔ کسی نے بھی موٹر سائیکل کے متعلق کچھ دریافت نہ کیا۔ ہم نے اب تک متعدد ندی نالے موٹر سائیکل سمیت خطرہ مول لے کر عبور کیے تھے اور راستے میں کئی جگہ مقامی باشندوں سے بھیراوا کی سمت بھی دریافت کی تھی۔

اب ہم انڈسٹریل ایریا کے قریب پہنچ رہے تھے اور یہی بھیراوا کی نشانی تھی۔ موٹر سائیکل نے اچانک چلتے چلتے جواب دے دیا۔ ہم نے پٹرول ٹنکی کا ڈھکن اتار کر دیکھا' کچھ پٹرول ٹینکی میں موجود تھا۔ معظم اور میرے لاکھ کوشش کرنے کے باوجود موٹر سائیکل نے اپنی جگہ سے ہلنے سے انکار کر دیا۔ شاید کوئی بڑا نقص پیدا ہو گیا تھا۔ ہم نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور موٹر سائیکل کو نزدیکی نالے میں لڑھکا کر پیدل ہی شہر کی طرف چل دیئے۔



ایک گھنٹے کی پیدل مسافت طے کرنے کے بعد ہم بھیراوا پہنچ گئے۔ سب سے پہلے معظم نے ایئرپورٹ کی نزدیکی ڈسپنسری سے میری مرہم پٹی کروائی۔ کچھ الٹی سیدھی دوائیاں ہم نے زہر مار کیں۔ یہ خدا کا خاص کرم تھا کہ اس روز ایک فلائٹ لیٹ تھی اور شام کو کھٹمنڈو جا رہی تھی' ہمیں اسی جہاز میں جگہ مل گئی۔

رات گئے ہم کھٹمنڈو پہنچ گئے۔

سفارت خانے کے لوگوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میرے فرار کی دلیرانہ واردات نے

ان کے دلوں میں ہمارے لیے احترام کے جذبات موجزن کر دیئے تھے۔

انہوں نے مجھے زخم مندمل ہونے تک اپنا مہمان رکھا۔

پھر ایک روز----!

پی آئی اے کا ایک جہاز ہمیں کراچی لے آیا۔

تیسرے روز میں اپنے گاؤں چلا آیا۔ میرے دل کے زخموں کی طرح بازو کا زخم بھی ایسا بگڑا کہ مشکل ہی سے سنبھل پایا۔

بازو کٹنے سے تو بچ رہا' لیکن کسی مشقت کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

میری ماں جیسے میری آمد کی ہی منتظر تھی----!

میری آمد کے بمشکل ایک ماہ بعد اس نے دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ ماں کے بعد اب میرے پاس سوائے عظمیٰ کی یادوں کے اور زندہ رہنے کا سہارا ابھی کیا رہ گیا تھا؟ فوج سے میں نے رخصت لے لی اور اپنے گاؤں چلا آیا۔ حسن آراء چار بچوں کی ماں بن چکی ہے اور میری ماں کی طرح جب بھی گاؤں آئے' مجھے شادی کر لینے کی تلقین ضرور کرتی ہے۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں۔

کبھی کبھی ایک پچھتاوا ضرور جان کو آ لیتا ہے کہ آخری وقت میں عظمیٰ کے ساتھ نہیں تھا۔ حالانکہ ہم نے شاہراہ حیات پر ایک ساتھ چلنے' جینے اور مرنے کا عہد کیا تھا۔

عظمیٰ نے اس عہد کی پاسداری کی----!

میں اس عہد کی پاسداری کر رہا ہوں----!

کوئی مر کر عہد کی پاسداری کرتا ہے----!!

اور کوئی جی کر----!!

میں جانتا ہوں عظمیٰ سے اس دنیا میں ملاقات ممکن نہیں۔ انسان مر جائے تو اس سے متعلق رشتے بھی مر جاتے ہیں۔

لیکن یادیں کبھی نہیں مرتیں----!

مناظر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں----!

کبھی عظمیٰ کی صورت میں----!

کبھی اذیت ناک ماضی کے روپ میں----!

مئی ۱۹۸۹ء

لاہور